

طنز و مزاح

کھوپیا ہوا اُفت

www.paknovels.com

محمد خالد اختر

کھویا ہوا اُفق

(طنز و مزاح / افسانے)

محمد خالد اختر

پیارے پڑھنے والوں سے

یہ مجموعہ میرے ان افسانوں، طنزیہ خاکوں اور سفر ناموں کا انتخاب ہے جنہیں میں نے وقتاً فوقتاً اپنی بلا مقصد کا مل زندگی کے پچھلے انیس بیس سال کے عرصے میں لکھا۔ جب میں نے انہیں لکھا تھا تو مجھے قطعاً یہ خیال نہ تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب کی شکل میں چھپیں گے۔ اس لیے میں نے ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی۔ مجھے کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ ادبی شاہکار ہیں یا ان میں بیان یا اسلوب کی کوئی خاص خوبی ہے۔ میں نے انہیں اپنے اکیلے اداس لمحوں میں خود کو بہلانے کے لیے لکھا تھا اور جب وہ مدیروں کی فراخ دلی کی بدولت ماہناموں میں چھپے تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ چند پڑھنے والوں کو ان کا انداز اچھا لگا۔

اب انہیں دوبارہ پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ کچھ تاریخی رنگ سے آلودہ ہو چکے ہیں۔ ایسے (Essay) کی فارم جو انگلستان میں ولیم ہیزلٹ، چارلس لمب اور سٹیونسن کے زمانوں میں بڑی مقبول تھی اور جیسے بیسویں صدی کے اوائل میں چیسٹرٹن، بیلاک اور رابرٹ لنڈ جیسے استادوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کیا، اب وہاں مرچکی ہے۔ ہماری زبان میں اس صنف کو پنپنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اس نسل کے نوجوان کے لیے اس میں اب کوئی کشش نہیں۔ پلک جھپکنے میں ہم خلائی دور میں داخل ہو گئے اور ایک خوفناک رفتار سے ایک نئے یوٹوپیا یا ایک نئی بربریت کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ آئین فلمنگ جیسے مصنفوں کی مقبولیت، جس کے ناول جنس اور مار دھاڑ کے واقعات کے سستے مرکب ہوتے ہیں، اس دور کا ایک سہل ہے۔ سنجیدہ کلاسیکی ادب کا دور (یا جسے ہم ادب سمجھتے آئے تھے) اب ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے بچے اب کاکس پر پل رہے ہیں۔ خواہ ہم اس کا ماتم کریں یا نہ کریں، یہ حقیقت ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن کے میڈیم انسانوں کے افکار و اشغال میں ایک ناگزیر انقلاب لے آئے ہیں اور انجام ابھی مستقبل کے دھندلکوں میں ہے۔ بڑے کثیر التعداد چھپنے والے اخبارات ادب کی جگہ لے رہے ہیں۔ ”لائف“ اور ”ٹائم“ جیسے میگزینوں کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ آئندہ ادب افسانہ لکھنے والی مشینوں پر تیار ہونے لگے ایک ڈھلے ہوئے خاص اسلوب میں۔ وہ دنیا جو آئندہ بکسلے اور جارج آر دیل نے اپنی تخیلی ناولوں بریونیورلڈ اور ٹائم لین اینٹی فور میں متصور کی ہے اگر ابھی آئی نہیں تو آنے والی ہے۔

اس انتخاب میں مشمولہ کہانی ”کھویا ہوا افق“ میری اولین چیزوں میں سے ہے۔ میں نے غالباً ۱۹۴۳ء میں اسے ہر دور کی ایک سرائے میں لکھا تھا اور اپنی پہلی شکل میں اس کی طوالت موجودہ صورت سے دو گنی تھی۔ دس سالوں بعد ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء میں سعادت حسن منٹو نے اسے ”سویرا“ میں سفاکانہ کتر بیونت کے بعد چھاپا۔ اس نے اس میں تبدیلیاں نہ کیں، صرف کئی حصے حذف کر دیئے جو اس کے نزدیک کہانی کے تاثر کی وحدت کو زائل کرتے تھے۔ استاد کے تھوڑے سے ”ٹچ“ سے یہ کہانی واقعی بہت بہتر اور پہلے سے خوبصورت ہو گئی کیونکہ عظمت سب کچھ کہہ دینے میں نہیں بلکہ کچھ ان کہا چھوڑ دینے میں ہے۔ یہ اس مجموعے میں سب سے اچھی اور مکمل شے ہے۔

”ڈیپلو سے نوں کوٹ تک“ ایک سفری روئیداد ہے۔ یہ ۱۹۴۵ء میں لکھی گئی جب میں تھرپارکر کے اس دور دراز صحرائی ریتلے گاؤں میں سکول ماسٹر تھا۔ ان دنوں میرا دوست احمد ندیم قاسمی ”ادب لطیف“ کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے یہ روئیداد اسے بھیجی اور خواہش ظاہر کی یہ ہمارے مشترکہ ناموں سے چھپے۔ ندیم نے اس غلط سلط لکھی ہوئی چیز کو سنوارا اور اس میں کئی حسین ٹچ دیئے۔ جب یہ شائع ہوئی تو میں خوشی اور فخر سے پھولا نہ سما یا۔ یہ میری چیز تھی جو کسی اردو رسالے میں چھپی تھی۔ میں نے اپنی اس مطبوعہ کو بیسیوں بار پڑھا اور اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھ کر میری طبیعت نہ بھرتی تھی۔

”ایک دہقانی یونیورسٹی“ بہاولپور کے ایک گاؤں میں لکھی گئی اور ساری کی ساری ایک نشست میں! یہ واحد چیز ہے جو میرے تخیلی Demon نے مجھ سے لکھوائی۔ میں نے اسے نہیں لکھا۔ یہ ”سویرا“ میں حنیف رامے نے چھاپی۔ ”مقیاس المحبت“ جو میری چاکیواڑہ میں اکیلی آوارہ گردیوں کا حاصل ہے، بھی ”سویرا“ میں چھپی اور منٹو کی رائے اس کے بارے میں اونچی اور حوصلہ افزا تھی۔ باقی مضامین میں سے بیشتر ”افکار“ میں چھپے۔ ایک دو ”ادب لطیف“ اور ”داستان گو“ میں۔ انہیں میں نے دل بہلاوے کے لیے لکھا اور میں امید کرتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو ان میں کچھ خوشی ملے گی۔

میں ایک قدرتی لکھنے والا نہیں ہوں۔ میں بڑی دقت سے انک انک کر لکھتا ہوں جیسے لکنت زدہ آدمی ہکلا ہکلا کے باتیں کرتا ہے۔ لکھتا میرے لیے بڑا جان جوکھوں اور خون پسینہ بہانے کا کام ہے۔ حقیقتاً میں انگریزی ادب کا کیزا ہوں جس کے لیے میری بھوک کی سیری نہیں ہو پاتی۔ کتابوں کی خوشبو میرے دماغ میں نشیلی شراب کی طرح چڑھتی ہے اور میرا خوشی کا تصور ایک کتابوں کی دوکان یا ایک لائبریری کے اندر جانے اور کتابوں کو سونگھنے چھونے اور ان کے ورق الٹنے (یا ان کو جھکنے) سے پورا ہوتا ہے۔ مجھے کوئی اچھی کتاب دے دی جائے کوئی سٹیوینن رومانس آپ جیتی یا سفری سرگزشت! میں دنیا سے اور کچھ نہیں چاہوں گا اور مکمل طور پر خوش

اور مگن رہوں گا۔ میرا لکھنا محض اتفاق ہے اور رسالوں کی انگریزی کتابوں میں ڈوبے رہنے کی لت سے میری یہ عادت پک چکی ہے کے میں انگریزی میں سوچتا ہوں اور اردو میں لکھتے ہوئے مجھے انگریزی میں سوچے ہوئے جملوں کا ایک طرح سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے بعض وقت بالکل لفظ بہ لفظ! اردو زبان مجھے ابھی تک نہیں آئی۔ شاید آتے آتے آ جائے۔

اس انتخاب میں میں نے دو ”عبدالباقی“ کہانیاں بھی شامل کر دی ہیں۔ میں نے بہت سی عبدالباقی کہانیاں لکھی ہیں۔ اور اس کردار نے (میں یقین کرتا ہوں) بعض پڑھنے والوں کے دل میں تھوڑی بہت سی جگہ حاصل کر لی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آیا چچا عبدالباقی کافی الواقع وجود ہے یا وہ کلہم میرے تخیل کی پیداوار ہے؟ عبدالباقی زیادہ تر میری اپنی تخلیق ہے۔ میں نے اسے جان پہچان کے کسی خاص شخص پر نہیں ڈھالا خود مجھ میں بہت کچھ ”عبدالباقی“ موجود ہے۔

اور اب ایک آخری لفظ!

ٹوپی ہاتھ میں لیے اور کھیل شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر آخری بار جھکتے ہوئے میں پیارے پڑھنے والوں پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری خامکارانہ قلمی نو مشقیں ادب نہیں اور نہ ہی ادب ہونے کی دعویٰ دار ہیں۔ لیکن جیسا کہ آلیور گولڈسمتھ نے اپنے مشہور ناول ”وکر آف ویکفیلڈ“ کے پیش لفظ میں لکھا ہے (وہ اسے اشتہار کہتا ہے)

ایک چیز میں سو عیب ہو سکتے ہیں اور سو باتیں ان کو خوبیاں ثابت کرنے کی خاطر کہی جاسکتی ہیں۔ یہ سب کچھ یوں ہے۔

”ایک کتاب ان گنت غلطیوں کے باوجود مسرت بخش ہو سکتی ہے۔ یا ایک بھی بیہودگی کے بغیر بہت روکھی پھکی اور غیر دلچسپ اور جو مسخرے پن کو مزاح سمجھتے ہیں، میری کتاب میں ان کو کچھ لطف حاصل نہ ہوگا۔“

یہی کچھ میں اپنی کتاب کے بارے میں کہتا ہوں۔ یہ تمنا کرتے ہوئے کہ پڑھنے والا کم از کم اسے ایک اکتا دینے والی کتاب نہ پائے گا۔ میں نے یہ کہانیاں اور انشائیہ چیزیں اپنا جی بہلانے کے لیے لکھی ہیں اور اگر وہ کسی اور کو بھی تھوڑی سی فرحت دے سکیں تو مجھ سا خوش نصیب اور کون ہوگا؟



کھویا ہوا اُفتخ

وہ سرائے جس میں جا کر میں ٹھہرا ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے تھی؛ جو دراصل یا تریوں کے لیے مخصوص تھی۔ میرا کمرہ داخلے کے دروازے کے بائیں جانب اوپر کی منزل پر تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک چھوٹی سی آہنی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ایک مربعے میں چند نیک فال ہندسے مندرج تھے۔

اگر اندر کا دروازہ اور باہر کا سلاخوں والا دروازہ دونوں کھلے ہوتے تو چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں رہنے کا احساس ہوتا اور مجھے تو کئی بار محسوس ہوا کہ اپنی سرخ ٹائی، سبز ہیٹ اور بی اے کی ڈگری کے باوجود میں کوئی بہتر قسم کا لنگور ہوں جو کھڑکی میں سے نیچے اسٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے بندروں کو پہچان کر بھائی بندی کے جذبے کے تحت مسکرا رہا ہے۔

صبح ہوتے ہی میں بندروں اور دیوتاؤں کے اس مسکن کو جسے ہر دوار کہتے ہیں، کھوجنے کے لیے نکل پڑا۔ میں نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور اپنے سبز فلیٹ کے اگلے گھیرے کو نیچے کھینچ لیا تھا۔

کسی اجنبی جگہ کو دیکھنے اور اس کا بنظر غائر مشاہدہ کرنے کا بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کی گلیوں، اس کے کوچوں اور بازاروں میں کھودے۔ میں نے آج تک کبھی کسی جگہ کے قابل دید مقامات کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ ہمیشہ اپنی دریافتوں پر کولمبس کی طرح اچانک اور ناگہانی آنکلتا ہوں اور مجھے اس میں لطف آتا ہے۔

دسمبر کے آخری دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں اس طرف ہولیا جدر کو پوڑی ہے۔ خدا کی سیزھی۔ ”ہر“ تک لے جانے والا یہ راستہ فراخ سیمنٹ کی بنی ہوئی سڑک ہے۔ دکانیں بند تھیں مگر بندر جو انسان کے مقابلے میں زیادہ سحر خیز حیوان ہے، جاگ رہے تھے اور ہر جگہ موجود تھے۔

خدا معلوم وہ میرے متعلق کیا سوچتے تھے۔ بظاہر ان کے انداز سے ایک برترانہ حقارت سی ٹپکتی تھی۔ غالباً وہ اس شہر کو اپنا شہر سمجھتے تھے اور انسانوں کو غاصب اور ناخواندہ مہمان۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر دوسرے حیوانوں سے ان کے مراسم نہایت خوشگوار اور مہذبانہ تھے۔ ایک جگہ میں نے دس بارہ بندروں اور ایک نو عمر سائڈ کو مکمل اتفاق سے کچھ کھاتے ہوئے بھی دیکھا۔

اپنے بائیں طرف مکانوں سے دوڑ بہت دور میں نے سورج کو چند گلاب کی پہاڑیوں کے اوپر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ ان

پہاڑیوں پر زرد لمبی گھاس سونے کی تاروں کی گچھیاں لگتی تھی۔ ایک پہاڑی پر چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ ”یہ ہے وہ رومان جس کو ڈھونڈنے تم اتنی دور آئے ہو۔“

میرے سامنے ایک دیوار پر لکھا تھا۔

”ذہب ذہب کلوریم..... آنکھوں کی ہر بیماری کا واحد علاج“

ساتھ ہی بڑے بڑے حروف ہمیشہ اور بلا ناغہ ناز بیوٹی اور ناز اسنو استعمال کرنے کی ہدایت تھی۔ اس سے نیچے اردو ادب کی سب سے مشہور تصنیف کا اشتہار تھا۔

”ہدایت نامہ خاوند مصنفہ کویراج ہر نام داس بی اے“

میں لاہور سے اور کئی چیزوں کے علاوہ جس شخص سے بھاگا تھا وہ حضرت کویراج ہر نام بی اے بھی تھے۔ جو دیواروں پر مندروں پر مناروں پر ہر جگہ اپنے مختلف ہدایت ناموں سمیت موجود ہوئے اور اب بھی یہاں براجمان تھے۔

سڑک کے خاتمے پر میں پوڑی پر پہنچ گیا۔ اب زندگی اور حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ وہ مخلوق جو ارتقاء کے مختلف مرحلے طے کر کے بندر سے انسان میں تبدیل ہو چکی تھی اپنے اپنے کاموں پر نکل رہی تھی۔

پوڑی پر ایک بورڈ منتظمین کی طرف سے آویزاں تھا۔ ”پوڑی پر سوائے ہندوؤں کے اور کسی غیر مذہب کے آدمی کو جانے کی اجازت نہیں۔“ میں بزدل آدمی ہوں اور اس قسم کے نوٹسوں کا پاس کرنے والا انسان ہوں۔ سڑک پر کچھ آگے نکل گیا۔ ایک طرف گد لے پانی کا تالاب تھا جس میں بھارے جسم کی ایک عورت اپنے کپڑوں اور اپنی عینک سمیت کھڑی بار بار ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ روٹی کی طرح گول عینک لگا کر بے حد سنجیدہ چہرہ پانی کے اوپر اٹھتا اور پھر نیچے چلا جاتا۔ اپنے گمان میں وہ اپنے پچھلے پاپ دھو رہی تھی۔ اس بے حد متین سنجیدہ اور عینک لگے چہرے کے ساتھ!

میں اب ریلوے لائن پر پہنچ گیا اور یہاں سے واپس پوڑی کی طرف مڑا۔ گنگا کا پاٹ یہاں بہت ہی تنگ ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر بازار اور گھاٹوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ شیشے کے چوکور لال ٹینوں والی سفید دیوار۔ اس پر بھی ایک نوٹس لگا تھا اور دیوار کے اوپر سے دوسری طرف جھانکنے سے منع کرتا تھا۔ مگر میں طویل القامت انسان ہوں۔ پنچوں کے بل کھڑے ہوئے بغیر میں نے ممنوعہ منظر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔

میں نے دل کڑا کیا۔ کسی کو بھلا کیا پتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ بازار کی چند پرچھ گلیاں طے کیں اور گھاٹ پر پہنچ گیا۔ یہ اصلی

پوڑی تھی جہاں بھگوان کسی زمانے میں اترے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پانڈوں کا ہاتھ پکڑ کر انسان اپنے تمام پاپوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

گھاٹ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ دوکانیں، جوتھیوں اور جڑی بوٹیاں بیچنے والے دیدوں کے اسٹال تھے اور بائیں ہاتھ گنگا تیز روا اور بے پروا۔ بڑی تیزی سے اپنے دو ہزار میل لمبے سفر پر سمندر سے ملنے جا رہی تھی۔

گھاٹ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی سے پر شور اور پر رنگ تھا۔ غلیظ چائے اور مٹھائیوں کی دکانیں، خواجے والے بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بیٹھے ہوئے جٹا دھاری سادھو۔ آگے بڑھا تو گھاٹ کے فرش پر بیٹھی ہوئی جاموں کی فوج نے جو یا تریوں کو چھیلنے کے انتظار میں تھی، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض نے مجھے صاحب بہادر کہہ کر دعوت دی، بعض نے مہاراج، بعض نے راجہ صاحب اور چند نے محض رائے صاحب!.....!

ایک ننھے خوبصورت پل پر سے گزر کر چھوٹے گھاٹ پر آیا، جس پر دھوپ میں چند عورتیں اپنے کپڑے اور بال سکھا رہی تھیں اور جٹا دھاری سادھو چھتریوں کے آسن جمائے آنکھیں سینک رہے تھے اور چند گزرنے والی استریوں سے یقیناً دھان کی باتیں کر رہے تھے۔

رات کو میں دیر تک سرائے کے کمرے میں لیٹا پڑھتا رہا۔ دس بجے فشی نے بجلی آف کر دی تھی، لیکن دیا جلا کر۔ اس کی مدھم پیلی روشنی میں ایک بجے تک جاسوسی ناول ”الماری کا مردہ“ پڑھنے میں مشغول رہا۔ یہ جاسوسی ناول بھی کتنی ذہانت اور کاریگری سے لکھے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس آدمی کے لیے جو کہ فرار چاہتا ہے۔

پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ اس کے باوجود کہ میں نے الماری میں سے مردے نکلنے والے کئی خواب دیکھے، میری نیند گہری اور پرسکون تھی۔

دوسرے دن میں رڑ کی چلا گیا۔ صبح اٹھنے پر زندگی مجھے ایک باری لگ رہی تھی۔ ایک بیزار کن مشغلہ۔ زندگی کی خواہش بھی جنسی خواہش کی مانند کبھی چوٹی پر ہوتی ہے، کبھی نشیب میں۔

میں ہر کی پوڑی کی سڑک پر اتر آیا۔ سامنے سے ایک لاری آ رہی تھی اس میں بیٹھ گیا۔ سفر بے حد طویل اور اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ لاری بہاولپور کے گاؤں پر پندرہ منٹ کے لیے رکی۔ یہ گاؤں چند دوکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک دکان پر میلے سے بورڈ پر غلام قادر بالبر لکھا ہوا تھا۔ نیچے قینچیوں، استروں اور صابونوں کی ہاتھ سے کھینچی ہوئی میز بھی میز بھی تصویریں تھیں۔ میں نے سوچا، یہ حجامت کرانے

کا بہت ہی نادر موقع ہے۔ لاری ڈرائیور سے کہہ کر میں نے غلام قادر بالبر کی دوکان میں داخل ہوا۔ اس اچھے آدمی نے اس خلق اور کشادہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ جیسے میں اس کا ماں جابیا بھائی ہوں۔

شیو کراتے ہوئے میں نے اس کو بار برکی بجائے بالبر لکھنے کی غلطی بتائی۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”جی نہیں، اصل میں بالبر ہی صحیح ہے۔ بار بر غلط ہے۔ بالبر بال سے بنا ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے بگاڑ کر بار بر کر دیا ہے۔“ میں نے اس دلیل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

کچھ دیر رڑکی میں بے مقصد آوارہ پھرتا رہا۔ پھر لاری میں واپس ہر دوار لوٹ آیا۔ بہادر پور کچھ دیر کے لیے رکے۔ غلام قادر بالبر کی پروقار ہستی دوکان کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے ہاتھ بلایا۔ اس پر اس نے دھیان نہ دیا۔ رات کو میں ہر دوار کے واحد سینما گھر ”گنگا ناکیز“ میں فلم ”موجی جیون“ دیکھنے گیا۔ اشتہاروں کی پہلی سلائیڈ نمودار ہوئی۔

”ہدایت نامہ خاوند“..... مصنفہ کویراج ہر نام داس بی اے

میرے خدا! یہ حضرت یہاں بھی موجود تھے۔

پکچر کا انجام بخیر ہوا تو میں اداسی سے منہ لٹکائے واپس اپنے سرائے کے پنجرے کو لوٹا۔ اسٹیشن کے سامنے سے گزرتے وقت سبزھیوں پر ایک دم فراخ مسکراہٹ سے میری مڈبھیڑ ہوئی۔ سیاہ اچکن اور سفید طرارے دار پگڑی میں ایک بہت ہی فراخ مسکراہٹ۔ یہ ”ٹ“ تھا۔ پر ”ٹ“ یہاں کہاں؟

اس اچانک مڈبھیڑ کا اثر کچھ دور ہوا تو میں نے ”ٹ“ سے پوچھا، مجھے یوں تمہارے یہاں آنکلنے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

”ٹ“ مسکرا دیا۔ وہی فراخ مسکراہٹ۔

”تم آئے کیوں؟“

وہی فراخ مسکراہٹ پھر ”چلو آؤ چائے پیئیں“ میں بھوکا ہوں۔“

ہم ریلوے اسٹیشن کے ڈائمنگ روم میں جا بیٹھے۔ ”ٹ“ نے چائے اور توسوں کا آرڈر دیا اور بھوئیں اٹھا کر گویا میرا وزن کرتے ہوئے کہا۔ ”تو یہاں تم رومان تلاش کر رہے ہو۔ کوئی ملا بھی؟“

میں نے جواب دیا۔ ”پالیا ہے، صرف دم کی کسرباتی ہے۔“

ایک فراخ مسکراہٹ کے بعد ”سچ؟“

”سچ!..... یہ بتاؤ تم کب آئے؟“

”چھ بجے کی گاڑی۔ سیدھا سرائے گیا۔ بڑی مشکل سے پتا چلا کہ تم وہیں ہو۔ اپنا صحیح نام تم نے کیوں درج نہ کرایا؟“
 ”اوہ! میں اس کے متعلق لکھنا بھول ہی گیا۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی خودی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ہر پرانی چیز انسان کو ماضی کی طرف کھینچتی ہے۔“

”ٹ“ نے چائے پیالی میں انڈیلی۔ تم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہو۔ کیانی الواقع ایسا ممکن ہے۔“
 ”میرا خیال ہے۔ اگر انسان اس کافی الواقع متمنی ہو۔“
 چائے خلاف معمول بہت اچھی تھی۔

”ٹ“ نے پوچھا ”تم یوں ایک ایسا کیوں اٹھ بھاگے؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ”ٹ“ تمہیں یاد ہوگا۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو میں نے ایک نظم لکھی تھی۔ ایک چھوٹی سی احمقانہ ناپختہ اور بے جوڑی چیز۔ آؤ نکل چلیں۔ آؤ بھاگ چلیں ہمارا یہاں سانس گھٹتا ہے۔ تم میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر ”ٹ“ میں سچ کہتا ہوں انگریزی ضرب المثل کے مطابق یہ میرے جذبات آنے والے حادثات کا پیش خیمہ تھے۔ میں یہاں کیوں بھاگ آیا ہوں۔ اس کی وجہ سمجھنے میں اب تمہیں کوئی زیادہ دقت نہ ہونی چاہیے۔“

ٹ بولا ”زندگی کو سنوارنا چاہیے نہ کہ بگاڑنا۔“

میں نے کہا ”تم زندگی کا سنوارنا کسے کہتے ہو۔ یہ کہ میں امتحان پاس کر لوں ایک محفوظ مگر بے روہ ملازمت حاصل کر لوں۔ ایک بیوقوف باتونی عورت اپنی یا میری موت تک میری زندگی کے ساتھ چپک جائے۔ یہ رسمی رواجی زندگی معاف کرنا ایک تیندوہ ہے جو انسان کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔ بھی میں زندگی کے فلسفے میں اسٹیونسن کا چیلہ ہوں۔ میں تو ایک سیلانی آوارہ گرد کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں اور سیلانی آوارہ گرد ہی کی طرح سڑک کے کنارے چلتا چلتا کسی جھاڑی کی اوٹ میں اس خوبصورت زندگی کو الوداع کہوں گا۔“

”ٹ“ نے میری بات سن کر صرف اس قدر کہا۔ ”میں تمہیں لینے آیا ہوں اور تمہیں چلنا ہوگا۔“

اس کے لہجے میں بلا کا تین تھا۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ”اچھا“

”ٹ“ کی آمد سے رومان ہمیشہ یوں ہی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ واپس جانا پڑتا تھا واپس اسی دنیا میں۔

دوسرے دن ”ٹ“ اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرائے سے باہر نکلے پہلے ڈاک خانے گئے۔ پھر اسپورٹس کا سامان بیچنے والی دکان میں ”ٹ“ کو ڈمبل اور سینے کو کشادہ کرنے والے اسپرنگوں کو دیکھنے اور آزمانے کا خطہ ہے۔ اس کے بعد ٹ کا پروگرام کنگنوں اور چوڑیوں کی دکانوں پر جانے کا تھا۔ اس نے کہا کہ چوڑی گری ہردوار کی خاص صنعت ہے حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہردوار کی صنعت صرف روحانیت ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی اور صنعت پنپ ہی نہیں سکتی۔

ٹ عجیب و غریب آدمی ہے۔ بہت ہی خوش کلام سوکھے سے سوکھے موضوع پر ہری بھری گفتگو کر سکتا ہے۔ ہر چیز سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ڈمبلوں اور سینہ کشادہ کرنے والے اسپرنگوں سے لے کر ریشمی اور سوتی کپڑوں تک۔ کپڑوں کی حس اس میں بہت تنگی ہے۔ چنانچہ اس نے ہردوار کے تمام بزازوں کو اپنی اس حس کا شکار بنایا۔ ایک گرہ کپڑا نہ لیا، لیکن تعجب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ بیسیوں تھان کھولنے پر بھی ہشاش بشاش رہا۔

کچھ وقت یوں گزرا کہ ہم پھر گھاٹ پر نکل آئے۔ سورج کی چمکیلی روشنی میں گھاٹ اپنی جملہ رنگینیوں سمیت پورے جو بن پر تھا۔ تصویروں کا ایک جھر مٹ تھا جو کھلے آسمان تلے کھل رہا تھا۔ میں اور ”ٹ“ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاٹ شالوں، اسٹالوں، سادھوں اور جاموں کے پاس سے گزرتے ہوئے سفید پل پر آئے جو اس گھاٹ کو برلا ٹاور والے گھاٹ سے ملاتا ہے۔ ٹ ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بھسوت ملے سادھو، تلک لگانے والے پانڈؤ، ڈبکیاں لگانے والے یا تری ہر ایک میں ”ٹ“ کے لیے دلچسپی کا سامان موجود تھا اور میرا ”ٹ“ کو گرد و پیش کی چیزوں سے متعارف کرانے اور ان کو دکھانے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اپنی جاگیر پر اپنے کسی دوست کو ادھر ادھر پھرارہا ہوں۔

کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم سڑک پر جانے کے لیے سیر ڈھیوں کی طرف بڑھے تو راستے میں ہمیں ایک عجیب و غریب عورت ملی۔ میں یہاں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ میں نے لکھا دراصل اسی عجیب و غریب عورت کے لیے لکھا۔ کہ میں اس سے ملا، میں نے اسے دیکھا، میں نے اسے محسوس کیا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو گھاٹ پر بھیک مانگ کر پیٹ بھرتی اور تن ڈھاکتی ہیں۔ لیکن وہ ان سے بے حد مختلف تھی اس لیے کہ وہ عورت تھی لیکن اس کا ایک ایک خط و خال کہتا تھا کہ وہ عورت سے یا تو بہت زیادہ ہے یا بہت کم۔ لیکن یہ کی بھی بہت گہری تھی یعنی کہ اگر تھی۔

اس کی آنکھیں صاف اور بے باک تھیں۔ لیکن اس بے باکی میں دور بہت ہی دور ایک بہت ہی بھولی نگاہ جیسے پڑے پڑے گرد آلود ہو گئی تھی۔ نچلا ہونٹ کچھ عجیب مزاحیہ انداز میں نیچے کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ آپس میں کبھی نہیں ملتے تھے۔ شاید

اس خوف سے کہ اگر ملے تو ایک دوسرے سے چپک جائیں۔

اس کا سراپا جل کر سرکشی یا گستاخی اور ایک جلتی ہوئی خواہش یا جلی ہوئی خواہش کا تاثر تھا۔

مجھے معلوم نہیں میرے ان الفاظ کا مطلب بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک جلی ہوئی عورت تھی جس کے بل ابھی تک نہیں گئے تھے۔

پل پر ہمارے سامنے آتے ہی اس نے عجیب مزاحیہ انداز میں کہا ”آؤ باتیں کریں۔ وہاں اس گھاٹ پر گنگامائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔“

”باتیں کریں!“ ”ٹ“ نے اپنے ہونٹوں پر وہ خاص مسکراہٹ پیدا کی جو وہ عورتوں کے دل جیتنے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ یہ مسکراہٹ بے حد میٹھی اور چمکیلی مسکراہٹ ہوتی ہے جس میں ایک دلگیر بانگے کا احساس تنہائی صاف پڑھا جاسکتا ہے۔

”ٹ“ مکمل ترین پیشہ ور عاشق ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس عورت کے لیے اس نے یہ حربہ کیوں استعمال کیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ عورت کوئی بھی ہو اس کے اندر جذبہ رحم کو متحرک کرنا شاید ضروری ہوتا ہے۔

”ٹ“ نے پھر اس سے بڑی ملائگی سے پوچھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

وہ عورت خلا میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میرا نام!..... میرے تو بہت سے نام ہیں۔ جاکئی بائی، سینہ پر بھا، دھرتی ماتا، سیتا، مدر انڈیا۔“

لب دہان، ایسا جیسا بچے کا ہو مگر قبل از وقت بڑا ہو گیا ہو۔ صاف اور بے لاگ آنکھوں میں ایک ناقابل بیان یاس تھی۔ ایک کھوئی ہوئی روشنی۔

”ٹ“ نے دلچسپی لیتے ہوئے صرف اس قدر کہا ”خوب“

اس عورت نے جس کے اتنے سارے نام تھے دریا کی جھلملاتی ہوئی وسعت کی سمت اپنے نیلے بھورے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آؤ نا“ وہاں گنگامائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔“

ٹ بولا۔ ”یہیں بیٹھ جاتیں۔ باتیں ہی ہیں کہیں کر لیں۔ کیوں؟“

”اچھا“

وہ مان گئی۔ ہم تینوں پل کے فرش پر منڈیر کے پاس بیٹھ گئے۔ ٹ، میں اور اس عورت کے علاوہ بیسیوں قسم کے ملنگ، یا تری، سادھو پانڈے، لچے لٹنگے اس پل پر سے گزر رہے تھے۔ ان میں اکثر متجسس نگاہوں سے ہمیں دیکھتے۔ غالباً سوچتے تھے کہ ہم گھاٹ کی

اس عورت کے ساتھ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔

منذیر کے نیچے پوتر تالاب تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ ڈبکی لگانے کے بعد جس وقت انسانی مینڈکیاں باہر نکلتیں تو پہلے سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز اور غلیظ دکھائی دیتیں۔ تعجب ہے کہ وہ پانی جوان کے جسم کی غلاظت دور نہیں کرتا تھا، کیونکر ان کی روح کو مصفیٰ کر دیتا تھا۔

تقریباً تین ساڑھے تین فٹ گہرے پانی میں چھ سات لڑکیاں اور عورتیں اپنی ساڑھیاں اور دھوئیں سمیت کھڑی ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ جب باہر ابھرتیں تو ایک عجیب انداز سے مسکراتیں۔ ان کے جسم کے تمام تر خدو خال تمام ابھار اور خم تمام راز اور اسرار جاے سے باہر تھے۔ ”ٹ“ بہت ہی پرسکون مبصر ہے وہ اس نظارے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اور گھاٹ کی اس بھکارن کی طرف بھی متوجہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض کی جیب سے ریڈ لیمپ سگریٹوں کا پیکٹ نکالا اور ہماری طرف بڑھایا تو ”ٹ“ نے شکریہ ادا کر کے ایک سگریٹ لیا۔

اس عورت نے ہم سب کے سگریٹ سلگائے ایک اپنے لیے سلگایا۔ پھر باتیں شروع ہو گئیں۔

ٹ نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں۔ کیا کرتی ہیں؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”تم نے پریم ادیب کا نام نہیں سنا۔ اس نے ہمارے ساتھ بے وفائی کیا۔ ہم ادھر اس کے سنگ بھلم کمپنی میں ہیروئین کا پارٹ کرتے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھ شادی کا وعدہ کیا۔ پر وہ ایک اور عورت لے آیا۔ ہم یہاں گنگامائی کے چرنوں میں جیون جتانے کے لیے آ گئے۔“

ٹ نے میری طرف دیکھا۔ ایک صرف فلموں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اس کو بتایا۔ ”پریم ادیب ایک ایکٹر ہے۔ کافی مشہور ایکٹر ہے۔“

ٹ نے اس عورت سے پوچھا۔ ”ادھر فلم میں آپ کا نام کیا تھا؟“

اس نے فوراً ہی جواب دیا۔ ”سبھانا سمرتھ“

ظاہر ہے کہ وہ سو بھنا سمرتھ نہیں تھی۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔ ہرگز نہیں۔ ”ٹ! یہ جھوٹ کہتی ہے۔“

مایوسی کا بہت ہی گہرا سایہ اس عورت کے چہرے پر پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد گزر گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے اس کی خود فریبی کے آگے گینے کو نہیں پہنچائی۔

وہ اصرار کرنے لگی۔ نہیں! میں سبھانا سمرتھ ہوں۔ میں ہی سبھانا سمرتھ ہوں۔ سبھانا سمرتھ ہی تو ہوں۔ سبھانا سمرتھ۔

اس تکرار سے وہ مجھے نہیں؛ دراصل خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ سبھانا سمرتھ ہے۔ میں جھوٹا ہوں اور وہ سچی ہے۔ اپنے کو مزید یقین دلانے کی خاطر اس نے ایک فلمی گیت دھیمے دھیمے سروں میں گانا شروع۔ آواز میں فن نہیں تھا، لیکن درد موجود تھا۔

ٹ نے پوچھا۔ ”آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہم..... ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔“

”اوہ! آپ کا نام؟“

ٹ نے جواب دیا۔ ”رام چندر“ ہونٹوں پر وہی فراخ مسکراہٹ تھی۔

عورت نے ٹ کی طرف غور سے دیکھا۔ ”تمہاری شکل بھی رام کی سی ہے۔“ مجھ سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا۔ ”تمہارا نام؟“

”میرا..... مرلی دھر“ مجھے کبھی کوئی رومانی نام نہیں سوجھا۔

عورت مسکرائی۔ ”تمہارے ہاتھ میں مرلی تو ہے نہیں۔“

میں جھینپ گیا۔ مگر ہر دوار میں جہاں ہر اترے تھے، گلابی فضا میں ریڈ لیمپ کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے

لیے محسوس ہوا کہ رومان میری زندگی کے کندھوں سے چھو گیا ہے۔ میرا نہیں کسی اور کا۔ پر جانا پہچانا ہوا۔

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ نیچے تالاب میں عورتیں اپنے گناہ دھوتی رہیں۔ کبھی کبھی ٹ کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ دفعتاً

جانکی یا سبھانا انتہائی طیش میں اٹھی اور پل کی منڈیر کے پاس جا کر اس نے نہانے والیوں کو ایسی ایسی نگلی گالیاں دیں کہ وہ بوکھلا کر اپنے

پاپ دھونے چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ جب وہ ”ٹ“ کے پاس آ کر بیٹھی تو اس نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے بھگا کیوں دیا ان کو۔“

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ خلا میں چند منٹ دیکھ کر اپنی آنکھوں میں سے غصے کا میل صاف کر کے وہ ”ٹ“ سے مخاطب

ہوئی۔ ”ہمیں ایک کمبل لے دو رام رات کو بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔“

مجھے حیرت ہے۔ ”ٹ“ نے بڑے روکھے انداز میں اس سے کہا۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

عورت نے بڑے بھولے پن سے کہا۔ ”ہمیں لے دو گے کمبل۔“

ٹ نے پھر اسی روکھے انداز میں جواب دیا۔ ”نہیں“ لیکن فوراً ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”آپ ہمارے ساتھ چلے۔ یہاں گھاٹ

پر کیا پڑا ہے۔ ہم تینوں اکٹھے رہیں گے۔ اچھا؟“

”میں..... میں کہاں رہوں گی؟“

”جہاں ہم دونوں رہیں گے ہمارے ساتھ“

عورت کی آنکھوں میں وہ جو دُور بہت ہی دور ایک گرد آلودی چیز تھی روشن ہوئی۔ اور پھر یہی چیز دو موٹے موٹے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی۔ ممنون و شکر لہجے میں اس نے کہا۔ ”رام بھی ایسے ہی تھے۔“

یہ کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگی۔ ٹ نے پوچھا ”کیسے؟“

”آپ جیسے بالکل آپ جیسے۔ آپ ہی کی طرح سندر اور بھگت“ خلا میں گڑی ہوئی نگاہیں ”ٹ“ کی طرف پھیر کر اس نے بچوں

کی طرح کہا۔ ”تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔“

ٹ نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔ ”یہ کیسے لگتے ہیں تمہیں؟“

عورت نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ ”یہ لکشمین ہیں..... لکشمین“

کہاں میں اور کہاں پر سکون رام کا البیلا جان پر کھیل جانے والا بھائی لکشمین۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لکشمین کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔

ٹ نے پھر بڑے پیار سے عورت سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

عورت پھر اسی وثوق سے بولی ”میں سیٹے میں سیٹے ہوں۔“

ٹ کے لہجے میں فرزند ساجد بہ پیدا ہو گیا۔ ”سیٹے نہیں، کوشلیا، رام لکشمین کی ماں کوشلیا۔“

”سیٹے نہیں؟“ اس کے لہجے میں انتہائی استعجاب تھا۔ اس بچے کا استعجاب جس کے یقین کامل کو یہ کہہ کر بدلنے کی کوشش کی

جائے۔ ”بھاپو نہیں ماموں“ اور وہ منہ کھولے کہے ”ماموں؟“

ٹ نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”نہیں“

”نہیں“ اور اس کئی ناموں والی عورت کی آنکھوں سے کئی آنسو چھلک پڑے۔

ٹ کا لہجہ فوراً ہی بے حد ملائم ہو گیا۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں اپنی ماں کی طرح چاہیں گے۔ تمہاری سیوا کریں گے۔ ہم

تمہیں اپنے محبت بھرے دل دیں گے۔

”دل“ اس عورت کی آنکھیں کھل کر ڈراؤنی سی ہو گئیں۔ ”دل؟ کہاں ہے دل؟..... لاؤ کہاں ہے تمہارا محبت بھرا دل؟“

اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے وہ ٹکا دل نوچکر باہر نکال لے گی۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ ماں سے محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت استری سے ہوتی ہے۔ شیو کی پارٹی سے شام کی رادھے سے رام کی سیتے سے۔ میں تمہاری سیتے ہوں۔ میں تم سے اس طرح محبت کیا کروں گی جس طرح سیتے رام سے کیا کرتی تھی۔

ٹ اور میں دونوں سمجھ گئے تھے کہ یہ عورت محبت کی بھوک ہے۔ اور بھی زیادہ بھوک ہے اس لیے کہ اس کے آگے ایک بار کھڑے ڈال کر ہٹا لیے گئے ہیں۔ وہ بھیک مانگ رہی تھی ایک حفاظت کرنے والے پچکارنے والے مضبوط ہاتھ کی۔ اور ٹ اس سے ممتا طلب کر رہا تھا جو وہ اپنے وجود میں کسی اور کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نئے جیو کے لیے جس کی دھندلی تصویریں وہ ہزاروں بار اپنی کوکھ میں بنا اور مٹا چکی ہوگی۔

ٹ نے بڑی بے جگری کے ساتھ اس سے کہا۔ ”نہیں سیتے، نہیں“

عورت مایوس ہو گئی اور خلا میں دیکھنے لگی۔ جہاں شاید اس کا رام کھو گیا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک تازہ کوشش کی۔ ٹ سے غالب ہو کر اس نے بڑے ہی دل کو موم کر دینے والے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں پڑی راہ دیکھ رہی ہوں۔ میرا رام ایک دن آئے گا ضرور آئے گا اور مجھے لے جائے گا۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ”گنگا مائی نے مجھے وچن دیا تھا۔ پانی کی بوندوں نے میرے کان میں بتایا تھا۔ جاکی چٹانہ کر تیرا رام ضرور آئے گا۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”سو آج میرا رام آ گیا۔ میں نے کل رات جاڑے میں کانپتے کانپتے ایک سپنا بھی دیکھا تھا۔“ جیسے اس نے آنکھیں بند کر کے خواب کو یاد کیا۔ جیسے رام اور لکشمین دونوں میرے دوارے بھوکے اور پیاسے آئے ہیں۔ رام تمہاری شکل کے تھے اور لکشمین ان کی شکل کے۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ٹ کی طرف بھیک مانگنے والی آنکھوں سے دیکھا، مگر اسے خواب کا جواب نہ ملا۔

بے حد مایوس ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرح ایک سایہ چلتا ہے وہ آہستہ آہستہ سیزھیوں سے اتر کر روانہ ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد گھاٹ کے ان گنت روشنی کے دھبوں میں گم ہو گئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کئی ناموں والی عورت جو تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں اپنے رام کا انتظار کر رہی ہے۔ شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چلی گئی ہے اور میں رام کا کردار اپنے کردار میں سموتا رہ گیا ہوں۔ انسان بھی کس قدر کمزور کس قدر عاجز اور کس قدر قابل رحم تک بیوقوف ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کب تک اپنے موہوم رام کا انتظار کرتی رہے گی؟ کب تک یونہی محبت کی بھیک مانگتی رہے گی؟ کب

تک؟ ایک روز یونہی خلا میں دیکھتی دیکھتی مر جائے گی۔

کیا دوسرے جیون میں اپنے رام کو پالے گی؟ کون جانے؟

میں نے سوچا۔ اس عورت نے چوریاں کی ہوں گی اور یقیناً پانڈوؤں، سادھوؤں اور حجاموں کے مکروہ بازوؤں میں بھی لیٹی ہو گی۔ یہ عورت جس کے بہت سے نام تھے اور جس کی روح گنگا جل سے کہیں زیادہ پوتر تھی۔



سائیں علی حیدر فندک

فندک تخلص، علی حیدر نام۔ خاندان کے نام سے اتنا ہی پتا ملتا ہے کہ والدان کے دھنیے کا پیشہ کرتے تھے اور لاہور میں ملتان سے چھندروں کے ایک گروہ کے ہمراہ آئے تھے۔ انہیں لاہور کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ وہیں کے ہور ہے اور پھر جانے کا نام نہ لیا۔ فندک اٹھارہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ یہ کچھ دن تو روئی دھنک کر گزر اوقات کرتے رہے، مگر اس کام سے طبیعت بہت جلد بھر گئی۔ ایک روز دھنکنے کے سامان کو جو کہ میراث تھا بصد حسرت نذر آتش کیا اور قلندر بن گئے۔ شوخ مزاجی اور موزونی طبع لے کر آئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے شعر میں مضمون باندھنے لگے چنانچہ اس درجہ اس میں کمال پیدا کیا کہ یکتا ہے روزگار ہوئے اور عندلیب زمانہ کہلائے۔

اللہ اللہ کیسے لوگ تھے۔ آج کل کے ہم عصر شاید ان کا کلام سن کر نہیں، مگر انصاف کی بات کہو تو جیسے سادہ روزمرہ کو شعر میں انہوں نے نبھایا ہے وہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔

سنا ہے چند حاسدان کو ہلکوا کہتے تھے اور برملا کہتے تھے۔ ان کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔ فرزند بخش تمیز کہتے تھے، میں نے ان کو درگاہ پیر ڈورے شاہ کے دروازے کے باہر لنگوٹا پہنے دیکھا ہے جلال میں آتے تھے تو لنگوٹا بھی اتار دیتے تھے اور الف ہو جاتے تھے۔ راہ گزاروں کو ایسی بے نقط سناتے کہ سب چھوٹے بڑوں کا ان سے ناک میں دم تھا۔ ان کا ایک چیلہ تھا کہ مشک کی رنگت کی رعایت سے اسے کالو پکارتے۔ وہ ککڑ کا حقہ تازہ کر دیتا، یہ بیٹھے دم لگاتے رہتے۔ بھنگ بھی کالو ہی گھونٹتا تھا۔ ان کے دل میں بھی کالو کی قدر تھی۔ چنانچہ سنا ہے کالو پر ایک مثنوی بھی موزوں کی تھی۔ افسوس کہ اس کے اوراق امتداد زمانہ سے ضائع ہو چکے ہیں اور اس دیوانے کی بسیار جستجو کے باوجود اس مثنوی کا سراغ نہیں مل سکا۔

جیسے ہر باکمال کے حاسد ہوتے ہیں، ان کے بھی تھے کہ ایک بار لاہور کے چند بے فکروں کو ان سے ٹھسٹھول کی سوچھی۔ انہوں نے ان پر ایک جو شیخ باقر ڈگڈگی سے لکھوائی اور رات کو نکلنے کی دیوار پر چپکا آئے۔ صبح ان کی نظر پڑی تو فوراً سمجھ گئے کہ جو کس کے دماغ کی تخلیق ہے۔ پہلے تو غائبانہ اپنے حریفوں کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ پھر اسی وقت بیٹھ کر ڈگڈگی پر ڈیڑھ دو سو اشعار کی ہجو لکھ ماری۔ اس سے ان کی روانی طبع اور مشق سخن کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کالو کے نوکر کے لڑکے کے ہاں موجود ہے۔ اس کے

مطلع میں لکھتے ہیں۔

واہ واہ کیسے بختی ہے ڈگڈگی
ناچتا ہے بندر جب بختی ہے ڈگڈگی
اور ڈگڈگی پہ رکھ دو ایک اور ڈگڈگی
تو برائے نشست بن جاتی ہے کرسی
واہ واہ رے ڈگڈگی

باقی اشعار اس قابل نہیں کہ انہیں نقل کیا جاسکے۔ افسوس! ان جواہرات میں سے بیشتر ہر درجہ تہذیب و شائستگی سے گرے ہوئے ہیں اور کمال فحش اور انتہا درجے کی کثافت سے بھرے ہیں۔ دراصل اس زمانے کے شعراء کا یہ دستور تھا اور ان چیزوں کو شاعری میں روار کھتے تھے۔

سبحان اللہ کیا شگفتہ مزاج یار باش لوگ تھے گو کہ ہجو اور شعر میں ایک دوسرے کی خوب خاک اڑاتے تھے لیکن طبعیتوں کا آئینہ دشمنی اور عناد کے دھوئیں سے میلا ہوتا تھا ایک یہ زمانہ ہے کہ کسی کے بارے میں رسالے میں ایک دو لفظ تنقید کر کے لکھ دو اور وہ بھی بغرض اصلاح تو فوراً منہ کو آتا ہے اور ڈنڈا لے کے پیچھے ہولیتا ہے۔

جوانی میں پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار موچی دروازے کے باہر دنگل ہوا۔ بڑے بڑے نامی پہلوان، لکھنوا اور میرٹھ سے آئے تھے ان کو بھی دیکھنے کا شوق چرایا۔ وہاں پہنچے۔ مہاجے پہلوان اور موٹو پہلوان کی ہندوستان بھر میں زور آزمائی کا شہرہ تھا۔ کشتی کے بعد یہ بھی لنگوٹا کس، خم ٹھونک اکھاڑے کے بیچ جا موجود ہوئے اور رانوں پر ہاتھ مار کر مقابلے کی دعوت دینے لگے۔ منتظمین دنگل نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ اکھاڑا خالی کرو ابھی اور جوڑ ہونا ہے۔ یہ بھلا کس کی سنتے؟ ڈٹے کھڑے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر کو ایک ولایتی نے جو کہ منتظمین کا سربراہ تھا، اکھاڑے میں جا کر ان کی گردن دبوچی اور گھونسنے لگا کر انہیں باہر نکالا۔ اس کے بعد یہ چار مہینے بستر پر صاحب فراش رہے اور ایک سال تک لنگڑا کر چلتے تھے پھر دنگل کا نام نہ لیا اور کہا کرتے تھے ”میاں جوانی میں اچھے اچھوں کو پچھاڑا اب تو ضعیف ہو گئے ہیں۔“

کھانے کے بے حد شوقین تھے۔ ماشاء اللہ ینگ سناتے ہیں کہ میں قندھار سے اونٹوں پر بغرض تجارت کشمش و بادام لادے آتا تھا کہ ڈورے شاہ کی درگاہ کے پاس سے گزر ہوا۔ دیکھا کہ دروازے کے باہر ایک کالا بھنگ شخص تن برہنہ راکھ سر پر سر کو گھٹنوں

میں دیئے بیٹھا ہے۔ ایک ٹونا ککڑ کا حقہ پاس پڑا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر مجھ پر نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر خدا جانے کیا سوچ کر ہاتھ اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رکا تو وہ شخص بولا ”میاں یہ کیا لیے جا رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی کھلاؤ۔“ ماشاء اللہ خان کہتے ہیں کہ میں پہلے تو شپٹایا اور اس شخص کی دیدہ دلیری پر حیران ہوا۔ ایک نو خیز لڑکا کہ جس کی مسیں ابھی نہ بھیگی تھیں، پاس سے گزرا۔ اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے بتایا کہ فندک ہیں۔ یہ حالت زبوں دیکھ کر افسوس ہوا۔ فندک بڑی وضع داری اور رکھ رکھاؤ سے ملے۔ ایک سالم بوری کشمش کی اتر والی اور پھانک پھانک کر کشمش کھاتے رہے۔

عالم پیری میں دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ سخاوت علی اختر ایم ایل اے جو ان کے ساتھ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے کہتے ہیں کہ میں ایک بارتکیہ میں نیم کے پیڑ کے نیچے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سر اٹھا کر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر اپنے چھتروں میں سے جو کس نکالنے میں لگ گئے۔ مجھ سے بات تک نہ کی۔ میں نے بھی دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر اٹھنے لگا تو اوپر دیکھ کر کہا ”میاں! کیسے آئے تھے؟“ میں نے عرض کیا ”شوق زیارت لے آیا۔“ اس پر کہا ”شکل آشنا معلوم ہوتی ہے کیا نام ہے؟“ میں نے نام بتایا۔ بڑی دیر تک سوچتے رہے کہنے لگے۔ ”حافظ کمزور ہو گیا ہے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ لیکن میاں یہ تمہیں اختر تخلص کی کیا سوجھی، کچھ کہا کرتے ہو؟“ میں نے اپنی بیاض نکال کر کھولنی شروع کی کہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگے۔ ”رہنے دو۔ پھر کبھی سہی۔“

جوانی میں کوچہ عشق سے بھی نا آشنا نہیں رہے۔ اگرچہ بعد میں عورت کے نام سے چڑ ہو گئی تھی۔ مشہور ہے کہ تیس تیس سال کے تھے کہ ایک کنجڑے کی بیوی سے عشق ہو گیا۔ جیسے کالے بھنگ یہ خود تھے، ویسی ہی وہ بھی تھی۔ چترک عورت تھی بد تمیز، بے حیا۔ استاد مرحوم نے بھی اس کنجڑن کو دیکھا ہوا تھا اور تعجب کیا کرتے تھے کہ فندک کو اس میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ ان کا پورا دیوان اس کی تعریفوں میں ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، دل پر کوئی حکم نہیں کرتا۔ یہ ایک بار اسے بھگا بھی لے چلے تھے کہ کسی نے کنجڑے کو خبر کر دی۔ اس نے سر بازار انہیں بے عزت کیا۔ کنجڑن نے ان کے سر پر الزام تھوپا۔ اس واقعے کے بعد عورت کے سائے سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور جہاں کہیں کسی عورت کو سامنے سے آتا پاتے، پیٹھ پھیر لیتے۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھار لنگوٹ اتار کر کوٹ اور پتلون پہن لیتے کہ کسی قدر دان نے انہیں دیا تھا اور مال روڈ پر ایک قبوہ خانے میں جا بیٹھتے۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ پانی کا گلاس میز پر رکھا رہتا تھا اور یہ ہیں کہ سر کو کہنیوں پر ڈالے گویا مرا قبے میں بیٹھے ہیں۔ کسی نے قبوہ پلا دیا تو انہوں نے پی لیا ورنہ اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ حضرت زیاں کا کہنا ہے کہ میں نے فندک کو ایک بار موٹر میں بیٹھے دیکھا ہے مگر یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے وہ دوسرے فندک

ہوں۔ حاجی اللہ بخش فندک جن کی مثنوی خیمہ دوزی کے بارے میں مشہور ہے اور جو شہر کے عالی قدر رؤسا کے زمرے میں شمار ہوتے تھے۔

ان کے کلام کے بارے میں یہ ہے کہ ان کے مصرعے عموماً ایک بحر میں نہیں ہوتے۔ انہوں نے گویا شاعری میں ایک نئی روش پیدا کی اور نظم کا رشتہ نثر سے جوڑا۔ یہ اشعار میں لگی لپٹی اٹھا نہیں رکھتے۔ سادگی اور سادگی ان کے کلام کے جوہر ہیں گو کہ اس کا بیشتر حصہ مبتذل اور اخلاق سے گرا ہوا ہے۔ اصل محاورے اور روزمرے کو خواہ پنجابی کا ہو خواہ اردو یا سندھی کا ہاتھ سے نہیں دیتے اور جوں کا توں شعر میں جڑ دیتے ہیں۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ ان کا زور کمال یہ ہے کہ چار پانچ زبانوں کا مرکب تیار کر کے ایک ایسی خوش ذائقہ بھاشا اختراع کی ہے کہ آدمی ہونٹ چاٹتا رہتا ہے۔ آپ نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ ملازمت کے طوق سے بھی دور رہی ہے۔ ہر چند کہ تنگ دستی کی شکایت احباب سے اکثر کرتے تھے لیکن مجال ہے جو وضع داری اور خاندانی شرافت پر حرف آنے دیا ہو۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ ان کے سخن کے ایک جوہر شناس راجہ جلا درائے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک ہرکارے کے ہاتھ انہیں دوسیر لڈو اور دس روپے زادراہ بھیج کر بنگالہ بلوایا۔ انہوں نے لڈو اور دس روپے رکھ لیے اور بوایسی یہ شعر لکھ بھیجے۔

نہیں مجھ سے چھوٹ سکتا لاہور
یہ بن ہے تر و تازہ میں اس کا مور
نہ کر مجھ کو مجبور جلا درائے
کہ بنگال مجھ سے پہنچا نہ جائے

جلا درائے بھی جلد ماننے والے نہ تھے۔ وہ مصر ہوئے اور مزید دوسیر لڈو اور پندرہ روپے جو کہ لاہور سے بنگالہ کا تھرڈ کلاس کا کرایہ تھا ہرکارے کے ہاتھ بھجوا یا اور ساتھ لکھا کہ آپ نہ آئے تو میں خود پہنچتا ہوں۔ یہ نہ گئے۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ اصل میں لاہور نہ چھوٹ سکنے کا قنطربہانہ تھا۔ دراصل انہیں کھنکھاتا تھا کہ جلا درائے نام کیا پتا جی میں آئے تو بلوا کر گلے پر چھری پھیر دے۔ جلا درائے کی خود آنے کی دھمکی سے اتنے ڈرے تھے کہ دو ماہ نیم کے اوپر چڑھ کر سوتے تھے اور کالو کو نیچے پہرے پر کھڑا رکھتے تھے۔ افسوس اب نہ وہ جلا درائے سے قدر دان سخن ہیں اور نہ وہ محبت اور اخلاص۔ چشم بصیرت سے دیکھو تو اس زمانہ میں بھی چمنستان ادب مرغان نواح اور طوطیان خوش الحان سے خالی نہیں مگر کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ اچھے اچھے باکمالوں کو جن میں سے بعض نقادان عالی مقام اور بعض فسانہ طراز ان شیریں مقال ہیں۔ اس حالت میں دیکھے ہیں کہ جیب میں ماچس لیے پھرتے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ

سگریٹ پیش نہیں کرتا۔ اس ناقدری سخن پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

مولوی جنون اس جلا درائے کے قصے کے بارے میں کہا کرتے کہ چند مسخروں نے ان کا مذاق اڑانے کو یہ سوانگ بھرا تھا اور ان کی دم میں نمداباندھا تھا۔ ورنہ جلا درائے انہیں کب بنگلہ بلوانے والے تھے۔

آخری عمر میں فنک دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے تھے کہتے ہیں سوتے میں نیم سے نیچے آگرے اور گھٹنوں کے جوڑ مل گئے۔ یہ بھی سنا ہے کہ دماغ بھی چل گیا تھا کچھ عجب نہیں۔ وہی ماشاء اللہ جنگ محمد خان داروغہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ میں پروانہ سرکار کے ساتھ دو سپاہیوں کو ہمراہ لے کر انہیں پاگل خانے لے جانے کے لیے گیا تو کالو نے انہیں خبر دی۔ ان کے دل میں خدا جانے کیا آئی فوراً درخت پر چڑھ گئے۔ بڑی مشکل سے نیچے اترے۔ کہنے لگے۔ ”میاں محمد خاں! برخوردار تم ہو۔ مجھ کو بوجہ ضعیفی دکھائی کم پڑتا ہے۔ ہاں بھی سمجھا کیوں آئے۔ مگر جلدی کیا ہے ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کالو سے مخاطب ہوئے۔ ”کالو بھنگ پلا دے۔ وہاں سرکار کے گھر تو یہ کہا نصیب ہوگی۔ کالو نے بھنگ گھوٹ کر انہیں پیالہ پیش کیا انہوں نے برہم ہو کر کہا کم بخت پہلے مہمانوں کو پلاؤ۔“ بڑے اصرار سے ہمیں بھنگ پلائی۔ اس میں کلام نہیں کہ طبیعت بڑی متواضع پائی تھی اور مہمانوں پر جان چھڑکتے تھے۔

اس صاحب کمال نے انیس سو چالیس عیسوی میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ پاگل خانے کے پاس ہی ایک قبرستان میں جسے قصابوں کا قبرستان کہتے ہیں دفن ہوئے۔ میاں ڈگڈگی نے ”فنک نیم چڑھا“ سے تاریخ وفات نکالی۔ میں بھی ایک بار حضرت لنگوری کے ہمراہ ان کی قبر پر دعائے مغفرت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی شکستہ ہے کہ اسے دیکھ کر اس پنج روزہ قید حیات کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ دعائے مغفرت سے وہ فارغ ہوئے تو کسی نے بتایا کہ یہ قادر بخش حجام کی قبر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



فورتھ ڈائی مینشن

مسٹر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے جس کی رو سے لمبائی چوڑائی اور گہرائی کے علاوہ ایک چوتھی بعد ”وقت“ کی بھی ہے جدید علم ریاضیات کے سارے تشکل ہی کو بدل دیا ہے۔ مسٹر آئن سٹائن اور معدودے چند دوسرے ریاضی دانوں کے سوا بہت کم لوگ اس نظریہ کی ماہیت کو سمجھ سکنے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور اگر آئن سٹائن ایک سنجیدہ اور مسلمہ شہرت کا مالک نہ ہوتا تو ممکن ہے اس نظریہ کو اس کا ایک مذاق تصور کیا جاتا۔ ایک جدت اور لوگوں کی نظروں میں آنے کے لیے ایک چونکا دینے والا ڈھکوسلا۔ میں نے اس نظریہ کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی، لیکن وقت کے چوتھی بعد (ڈائی مینشن) ہونے کا خیال مجھے بے حد پرکشش اور عجیب لگا ہے۔ اس نظریہ میں فلسفہ اور ریاضی کا امتزاج نظر آتا ہے جو ظاہر انا ممکن ہے۔ کیونکہ فلسفہ اور ریاضی دو متضاد علوم ہیں۔ صرف آئن سٹائن ہی جو ایک ماہر ریاضیات ہونے کے ساتھ ایک گہرا فلسفی بھی ہے ایسے خوبصورت اور حیران کن نظریے کے متعلق سوچ سکتا اور اسے ہندسوں اور مساویوں سے ثابت کر سکتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا دیوتاؤں اور ملکوتی وجودوں کو اپنے آسانی مقاموں میں بھی اعداد و شمار رکھنے کے لیے ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے اگر ان کو بھی ریاضی سے کام لینا پڑتا ہے تو آئن سٹائن کی ایجاد کردہ ریاضی ہوگی۔ جس میں ”وقت“ ضرور ایک چوتھی بعد ہوگا۔ اس شاعر ریاضی دان نے فلسفہ اور ریاضی کو یکجا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک جینس ہے۔

ایک مشہور جدید انگریزی ڈرامہ نگار نے اپنے کئی ڈراموں میں اس نظریہ کو بطور ایک فلسفہ اور ایک مرکزی خیال کے استعمال کیا ہے اور نتائج پرکشش اور عجیب و غریب آدمی اب وقت کو ایک نظریہ سے دیکھنے لگ گئے ہیں۔ مختصر اس انگریزی ڈرامہ نگار نے (اس کا نام پرلیٹل ہے) آئن سٹائن کے نظریہ کی فلسفیانہ اصطلاح میں جو تشریح پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کبھی نہیں بدلتا۔ صرف چوتھی بعد وقت بدلتی ہے۔ اور اس کے بعد رابع کے بدلنے سے آدم بظاہر مختلف نظر آتا ہے اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اس وقت سے جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں محض ایک جنین کی شکل میں ہوتا ہے اس وقت سے جب وہ اپنے باپ کے پٹھوں میں ایک تند Spermi ہوتا ہے اور اس سے پہلے اپنے لائقہ اور موروثوں کے خون میں وہ وہی ایک ہی آدمی ہوتا ہے جو وہ اب ہے جو وہ دس ہزار سال بعد ہوگا۔ میرا خیال ہے ہم سب نے کبھی نہ کبھی یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ہم ہی ”پہلی زندگی“ ہیں۔ ہم

جادوئی اور مدام ہیں اور یہ کہ ہم ازل کی تاریک کھوؤں تک زندہ رہیں گے۔ مذہب کے سب سے بڑے بانیوں نے اسے ضرور محسوس کیا ہوگا ورنہ ہر مذہب میں روحوں کی ازلی تخلیق انسان کی زندگی کی ابدیت اور کسی نہ کسی طریق پر موت کے بعد وجود میں ہونے کا تصور نہ پیش کیا جاتا۔ مہذب مذاہب کو چھوڑ کر افریقہ کے حبشی کا (ہوڈوازم) بھی اس کے سامنے اگرچہ ایک مختلف طریق پر حیات بعد موت اور سزا و جزا کا یہی تخیل رکھتا ہے۔ اور یہ امر کہ آدمی کی ابدیت ہر مذہب کا بنیادی اعتقاد ہے، محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔

اس احساس کو لکھے ہوئے لفظ کی قید میں لایا جاسکتا، اسے صرف کسی الہامی لمحے میں اچانک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی احساس نے ہندوؤں کے مسئلہ تنازع کو جنم دیا اور یہی ایک مسلمان کے سزا و جزا کے عقیدہ کا موجب ہے اس وقت کی ابدیت کے عظیم پس منظر کے سامنے جانچنے پر آدمی کی پیدائش اور موت کی ازلی زندگی میں دو بالکل غیر اہم اور معمولی واقعے نظر آتے ہیں اور صرف اس کے دنیاوی سفر میں آغاز اور اختتام کے دو سنگ میل قرار پاتے ہیں۔

بعض دفعہ یہ آگے بڑھتا ہوا رواں رواں وقت پیچھے بھی دوڑ سکتا ہے اور پھر بظاہر عجیب اور ناقابل فہم باتیں عمل میں آتی ہیں ایسا ہی چونکا دینے والا اور ناقابل فہم تجربہ چند روز ہوئے ان سطور کے لکھنے والے کے ساتھ پیش آیا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس وقت بیٹھا مابعد الطبیعیاتی مسئلہ کو زیر بحث لا کر پڑھنے والے کو اس احساس کے سمجھانے کی غالباً بے فائدہ کوشش کا مرتکب نہ ہوتا۔

میری اول ترین یادوں میں سے ایک جو ایک عرصے کی دیکھی ہوئی خواب کی طرح دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ چار پائی پر سفید چادر میں ملفوف ایک ساکن لپٹی ہوئی شکل کی ہے۔ چادر برف کی طرف چمکیلی سفید ہے۔ چار پائی جس پر وہ ساکن شکل لیٹی ہے ایک وسیع چبوترے کے وسط میں ہے اور اس کے پیچھے ایک وسیع مکان کے برآمدے کے محرابی دروازوں کا پس منظر ہے۔ چار پائی کے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز اور باقی سب لوگوں کے لیے میل مرکزی بنا ہوا ایک لمبا سفید بزرگانہ داڑھی والا شخص ہے۔ بہت سے آدمی اس کے پاس آتے ہیں اور پھر ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ وہ اسی طرح جامد ایک گڑی ہوئی لائٹھ کی طرح کھڑا رہتا ہے۔

وقت غالباً پہلے پہر کا ہے اور دھوپ کی روشنی زرد زریں ہے۔ میں اپنی انامائی بکھان کی انگلی پکڑے ایک سنہری دھوپ میں نہائے ہوئے جیسے شہر میں پراسرار وسیع گلی کوچوں میں چل رہا ہوں (اگرچہ میں اکتیس سال جی چکا ہوں اور کئی ملکوں اور کئی ہواؤں میں سے میں نے اس شہر کی تلاش کی ہے میں نے اس شہر کی تلاش ہے میں نے اس شہر کو نہیں پایا۔ وہ شہر شاید نہ زمین پر ہے نہ آسمان پر۔ ماسوا ایک بچے کے دماغ میں۔ ہاں قدیم فرعونوں کے تھمپس (Thebes) کی تصویروں میں مجھے اس شہر کی ایک جھلک دکھائی دی

ہے) مائی بکھان قدرے تیز تیز چل رہی ہے۔ میری چھوٹی ٹانگیں اس کے ساتھ برابر قدم قدم نہیں رکھ سکتیں اور میں تقریباً گھسٹ رہا ہوں۔ اچانک ہم ایک بڑے لکڑی کے پھانک کے پاس آ کر رکتے ہیں جو کھلا ہے۔ اس میں سے وہ منظر ناگہانی ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے برف سی سفید چادر میں لپٹی ہوئی شکل اور خاموش لوگوں کا منظر جسے میں نے پہلے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں مائی بکھان سے پوچھتا ہوں ”اماں یہ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ کہتی ہے ”بیٹیا، وہ عورت جن کے گھر ہم جاتے رہتے تھے اور جو ہمیں تمہیں کھانڈ کا شربت پینے کے لیے دیا کرتی تھی، مر گئی ہے اور یہ اس کا جنازہ جا رہا ہے۔“

مجھے مرنے کے متعلق کوئی واضح پتا نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ڈراؤنی کچھ ہولناک سی چیز ہے۔ مجھے اس کھانڈ کا شربت پلانے والی موٹی، مہربانی عورت کا اس طرح آ کر چادر اوڑھ کر ساکن لیٹ جانا بے حد عجیب معلوم ہوتا ہے۔

میں مائی بکھان سے اس کے متعلق اور بہت سی باتیں پوچھتا ہوں، لیکن وہ بڑوں کی سی بے اعتنائی کے ساتھ مجھے کوئی جواب نہیں دیتی۔ میں حیران اور عجیب طور سے ڈرا ہوا اس منظر کو دیکھتا ہوں۔

جب سے مجھے یاد ہے اماں بکھان ہماری دایہ تھی۔ ہم اس کو اس تعجب اور تعریف سے دیکھا کرتے تھے جس طرح بچے اپنے سے بڑوں کو دیکھتے ہیں مجھے اس کے بغیر ایک پل چین نہ آتا تھا۔ اسے شاہزادوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصوں کے بیچ میں سو جانے اور خراٹے لینے کی جھلا دینے والی عادت تھی اور مجھے اور میری بہن کو اسے جگانے کے لیے اس کی زور زور سے چنگیاں لینی پڑتیں کیونکہ وہ ایک گہری نیند سوتی تھی۔ وہ جاگتی اور ہم پوچھتے۔ ”اماں بکھان آگے کیا ہوا؟“

”میں کہاں پر تھی؟“ وہ پوچھتی۔

”تو کہہ رہی تھی ناشہزادے نے پری سے پوچھا کہ تو ہنسی کیوں اور روئی کیوں۔“ بے صبری سے اسے یاد کراتے۔

وہ کچھ منٹ اور اٹنگھستے ہوئے قصہ سناتی اور ایک نہایت دلچسپ اور اضطراب کن قصے کے درمیان خراٹے لینے لگتی۔

میری اماں بکھان ایک عام واقفیت کی عورت تھی۔ تقریباً شہر میں ہر کوئی اس کو جانتا تھا اور راستے میں کئی آدمی اس کو ٹھہرا کر اس کی خیریت پوچھتے اور حال لیتے اور دیتے۔ اماں بکھان اپنے چالیس کے سن کے باوجود اور اپنی فرہ مگر مجھے سی صورت کے باوجود اس وقت بھی رومانک عورت تھی اور میرا خیال ہے کافی چاہنے والوں کے نام گنا سکتی تھی۔ اس کے پہلے خاوند مر کھپ گئے تھے یا وہ ان کو

فراموش کر چکی تھی۔ جب میں دوسری میں پڑھتا تھا تو اس نے ہمارے پچاس سالہ سائیکس بابا الہی بخش جسے ہم بابا لایا کہا کرتے تھے اور جو اپنی مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی کے ساتھ ایک نہایت پروقار شخص لگتا تھا۔ نکاح پڑھوایا جو اس کی پہلی شادیوں کی طرح عارضی نوعیت کا ثابت ہوا۔

وہ ایک اچھی اور جہاندیدہ عورت تھی اور غالباً بیشتر گھرانوں میں اس کی جو آؤ بھگت ہوتی تھی وہ اس کے تحصیلدار صاحب کی نوکرائی ہونے کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ادھر ادھر کے حال احوال دینے کے فن میں اپنے طبقے کی ساری عورتوں کی طرح طاق تھی۔ اسے زیادہ باتیں کہیں اور شہروں کے اسکینڈل کے بارے میں ہوتی ہوں گی جن کو سننا اور بحث کرنا ہمارے گھر کی چار دیواری میں محبوس زنانہ مکینوں کا چہیتا مشغلہ ہے مجھے اس کے ساتھ بے حد محبت تھی اور میں اس سے پل بھر کے لیے جدا نہ ہوتا تھا اگر وہ کہیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی تو میں زور زور سے رو کر اس کی دہائی دیتا ضد اور غصہ سے آنگن کے فرش پر لوٹنے لگتا اور اس وقت تک غیر تسلی پذیر ہوتا جب تک کہ اماں بکھان مجھے اٹھا کر سینے سے نہ چمٹا لیتی۔ وہ ضدی اور غصیلی تھی اور مجھے یہ اکثر بتایا گیا ہے کہ میں نے اپنی ضد اور غصہ اماں بکھان سے لیا ہے اگر یہ سچ ہے تو اماں بکھان کا شکر گزار ہوں کیونکہ میری ضد نے مجھے کوئی حماقتوں سے بچایا ہے اور مجھے اپنی مرضی اور خوشی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اکسایا ہے۔ اماں بکھان نے مجھے اپنی آرزو اور اپنا لہجہ ضرور بخشے ہیں۔ میرا دیہاتی سارینگتا ہوا لہجہ بڑی دیر تک میرے گھر والوں کے لیے مذاق اور قدرے مایوسی کا موجب رہا۔ وہ میرے اس لہجہ کی ذمہ داری میری پیاری اماں بکھان کے سر تھوپتے تھے اور میں اس اچھی عورت کا شکر گزار ہوں (وہ مرچکی ہے) کہ اس کی وجہ سے مجھ پر اپنی کسی کوتاہی کا الزام نہیں دھرا جاتا۔ اصلی قصور وارمائی بکھان ٹھہرائی جاتی ہے۔ جن دنوں میں اور اماں بکھان گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے اور موٹی مہربان عورت کے گھروں میں بن بلائے مہمان بنا کرتے تھے ان دنوں کی میری ایک تصویر اب تک میرے بڑی پھوپھی کے تختہ آتش داں پر محفوظ ہے۔ اور اس وقت میرے حلقے اور لباس پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک سیب سے گالوں والا گول مٹول لڑکا جس کے سر پر سلمہ ستاروں سے کاڑھی ہوئی گول ٹوپی ہے اور جس نے اوپر اٹھی ہوئی ٹوؤں والے براؤن بوٹ پہنے ہوئے ہیں ایک شش طرفی کھدی ہوئی میز پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور ایک معصوم متانت سے سامنے دیکھ رہا ہے، پیچھے فوٹو گرافر کا پردہ ہے جس پر جھالروں والے ستون اور کچھ گملے سے رنگے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ مجھے بھی یاد پڑتا ہے سلمہ ستاروں والی ٹوپی مجھے بے حد اچھی لگتی تھی اور میں دوسری جماعت میں آنے تک اس کو پہنتا رہا۔ اونچی اٹھی ہوئی ٹوؤں والے بوٹوں سے مجھے سخت نفرت تھی اور میں ان کو پسند نہ کرتا تھا مگر ان دنوں ان کا رواج عام تھا۔ وہ شش طرفی منقش میز اپنے پائیدان سمیت ظاہر ادا کی ہے اور پھولدار گلاب

والے لیمپ کی طرح اب تک (یعنی ستائیس اٹھائیس سال گزرنے کے بعد تک بھی) ہمارے گھر میں ہے۔

میں تحصیلدار کا ”کا کا“ تھا اس لیے میری والدہ جہاں تک ممکن ہوتا مجھے صاف کپڑوں میں رکھتی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اکثر جب میں اماں بکھان کے ساتھ گشت پر نکلتا تھا تو میرا لباس وہی ہوتا تھا جو میں فوٹو گراف میں پہنے بیٹھا ہوں یعنی سلمہ ستارے والی ٹوپی، ایک زریں سی واسکٹ، شلوار اور انٹھی ہوئی ٹوہ والے (کتنے بدنما) بوٹ۔ جب میں نے بڑے پھانک کے نیچے سے زردیلی ساحرائی دھوپ میں چبوترے پر اس سفید ساکت میت پر نظر ڈالی تو میرا یہی لباس ہوگا۔ اگرچہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کیا کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ گواہ میں جانتا ہوں کہ میرا وہی لباس تھا۔

اس واقعے کے بعد جب میری عمر زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین سال ہوگی میں نو سال اور بہاولنگر میں رہا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کا سنہری زمانہ اسی کھلے پرفریب شہر میں گزرا۔ اس عرصے میں مجھے بھی وہ بے حد بڑے پھانک اور افسانوی وسعت والے چبوترے والا مکان نظر نہ پڑا۔ گو کہ میں نے خاص طور پر اس کی کبھی تلاش نہیں کی۔ کئی دفعہ میں تعجب کرتا کہ وہ میری یاد والی جگہ کون سی تھی اور کہاں تھی۔ مجھے اب یقین ہے کہ اگر میں اس کے پاس سے گزرا ہوں گا تو میں نے اسے پہچانا نہ ہوگا۔ بچپن میں چیزیں اصلیت سے کہیں زیادہ پراسرار اور وسیع لگتی ہیں اور بے حد حیرت ناک!

پھر میرے باپ کی بہاولنگر سے بہاولپور تبدیلی ہوگئی۔ بہاولپور ریاست کا دارالخلافہ تھا، شاندار شہر تھا۔ وہاں نور محل تھا اور سینما۔ وہاں بجلی بھی تھی۔ میں تمام لڑکوں کی طرح ایک نئے اور بڑے شہر میں جانے پر بے حد خوش تھا۔ میں ایک نئے اسکول میں داخل ہوں گا۔ نئے دوست بناؤں گا، نئی اور عجیب و غریب جگہیں دریافت کروں گا۔ زندگی زیادہ دلچسپ ہوگی۔

مگر بہاولپور میرے لیے ایک منحوس شہر ثابت ہوا۔ یہاں ہم ایک تنگ کوچہ میں ایک شاندار پختہ مکان میں آ کر ٹھہرے تھے مگر میں تمنا اور ہڑ کے ساتھ بہاولنگر میں اپنے کچی اینٹوں کے گھر کے خواب دیکھا کرتا۔ وہ مردانہ کی چھوٹی دیوار، وہ دروازے کے باہر ایک لوہے کے بازو سے لٹکتی ہوئی میونسپلٹی کی لائٹیں۔ وہ چھوٹی دیوار کے پرے ریٹلا میدان جہاں میرے دوست مصنوعی جنگیں لڑا کرتے تھے۔ وہ مکان کے عقب میں بڑے برساتی جوہڑ کے پرے سیاہ اور پراسرار ریلوئی، جہاں آدمی جا کر انجنوں اور گاڑیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

بہاولپور میں، میں اپنی جماعت میں چمکا مگر کئی وجوہ سے میں اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ یہاں ایسے دوست نہ تھے جن کے ساتھ مل کر آدمی مصنوعی جنگیں لڑ سکتا ہو یا اینٹوں کے بنے ہوئے قلعوں پر حملے کر سکتا ہو یا رنگین کاغذ کے تاج پہن کر اور لکڑی کی تلوار

کمر میں رسی سے باندھ کر بادشاہ اور وزیر کے ناک کھیل سکتا ہو۔ میں جو ایک شوخ اور صحت مند لڑکا تھا اب زیادہ عرصہ گھر میں گھس کر رہنے لگا۔ میں ایک سوچنے والا اور راہب بن گیا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے میں نے کتابوں میں خود فراموشی اور تفریح ڈھونڈی کتابیں رفتہ رفتہ افیم کی طرح میری آقا بن گئیں اور ایسے دوست جنہوں نے مجھے تمام قدرتی انسانی تعلقات سے بے نیاز کر دیا۔ میں نے بی اے بہاولپور سے پاس کیا اس وقت اپنی انتہائی اور دل کی تاریکی کی وجہ سے میں انسانوں سے ڈرنے لگ گیا تھا اور یقین کرتا تھا کہ میں دیوانگی کی سرحد پر کھڑا ہوں۔

پھر بھی ایک امید تھی۔ وہ امید بہاولنگر تھی۔ یہاں سے صرف سو میل دور دنیا کا خوبصورت ترین اور متبرک ترین شہر تھا جہاں میں کھویا ہوا افق پر سے پاسکتا تھا اور اپنے بچپن کے چمکیلے دن رات کی شاید پھر تسخیر کر سکتا تھا۔ اپنے باپ کی بہاولپور میں تبدیلی کے دس سال بعد گاڑی مجھے پھر ریتلے ٹیلوں اور چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے میدانوں میں سے بہاولپور کی طرف لے جا رہی تھی میں ایک نئی زندگی پھر شروع کرنے کے لیے گھر سے بھاگ رہا تھا مگر نئی زندگی میرے لیے کسی جگہ بھی بہاولنگر کے جج کے بغیر ممکن نہ تھی۔ میں دہلی اور دور دیسوں کا عازم مگر میں نے فیصلہ کیا کہ راستے میں چند گھنٹوں کے لیے بہاولنگر میں ضرور اتروں گا اور اس کی گلیوں میں اپنی کھوئی ہوئی خوشی کی تلاش کروں گا۔

جب گاڑی کو کئی اور گزرگراتی کوئلے کے پچانے ہوئے انباروں، ہنٹ کرتے ہوئے انجنوں، ریلوائی کے بنگلوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی بہاولنگر جنکشن میں داخل ہوئی تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے حلق میں ایک پھانس سی تھی۔ یہ میری زندگی کے متبرک ترین لمحوں میں سے ایک تھا۔

نیچے گملوں والے پلیٹ فارم پر اترنے پر مجھے ایک پرانا دوست مل گیا جسے پہچاننے میں مجھے کچھ وقت ہوئی۔ وہ اب کافی موٹا اور جسیم ہو گیا تھا۔ اور دو ٹھوڑیاں حاصل کر چکا تھا۔ پرسکول کے دنوں میں وہ ہماری مصنوعی جنگوں میں دشمن فوج کا نائب سردار ہوا کرتا اور میں نے ایک دفعہ اس کو چت کر کے اور اس کے سینے پر چڑھ کر لکڑی کی تلوار سے اس کی ناک کاٹنے کی کوشش کی تھی (وہ جنگ ہم نے جیتی تھی) اب وہ محکمہ مال میں گروا اور قانون گویا اس قسم کی کوئی اور چیز تھا وہ میری مریضانہ حالت پر اظہار افسوس کرتا رہا اور پھر اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے پاس چل کر ٹھہروں اور لوگوں سے اس خیالی خوف کے باوجود دس سال کی راہبانہ زندگی کا نتیجہ تھا میں نے اس کی دعوت کو منظور کر لیا۔

گاڑی بہاولنگر میں شام کے سات بجے پہنچی تھی اور سامنے شہر پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے پل پر ہی سے دیکھ لیا کہ ہمارے گھر

کے گرد بہت سے اور مکان بن گئے ہیں اور شہر کی ہیئت بہت کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ ریتلا میدان جہاں ہم کھیلا کرتے تھے اب پکے مکانوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم شہر کے بازاروں میں سے گزرے اور میں نے کئی پرانے چہرے ایک لرزے کے ساتھ پہچانے۔ بازار بالکل ویسے ہی تھے صرف سڑکیں پکی ہو گئی تھیں۔

رات کو میں اپنے دوست کے ہاں رہا۔ دوسرے دن گاڑی نے آگے بارہ بجے چلنا تھا اور میں علی الصبح ہی اپنے دوست سے کسی ملاقات کرنے کا عذر کر کے اکیلا اپنے بچپن کے بہاولنگر کو کھوجنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ میں پہلے اپنے پرانے گھر کی طرف گیا اور آخر اسے ڈھونڈ نکالا۔ مگر یہ ایک مختلف گھر تھا اس میں اتنی ترمیمیں اور اضافے ہوئے تھے کہ اسے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ چھوٹی کچی دیوار کا نشان نہ تھا اور نہ ہی دروازے پر میونسپلٹی کی لائٹن تھی۔ مردانہ اور زنانہ اب دو الگ الگ گھر بنا دیئے گئے تھے۔ یہاں سے میں ہسپتال اور ہائی سکول والی سڑک پر سے ہوتا ہوا ڈیگری گیا جہاں ہم ساون کے دنوں میں بیر بہوٹیاں پکڑنے اور ساونی بنانے جایا کرتے تھے۔ وہاں سے شہر کا باہر سے چکر لگا کر میں مغربی طرف پر پرانے تھیٹر پر آیا جس کی چھت تب بھی نہ تھی اور اب بھی نہ تھی اور جہاں ”نیک پروین“ ”شیر کی گرج عرف چنگیز خان“ اور ”سلور کنگ“ جیسے شاندار کھیل ہوا کرتے تھے۔ اب یہاں ”پاکباز محبت“ لگا ہوا تھا۔ اس تھیٹر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک چوڑی سڑک پر پایا جو مجھے اب یاد نہ تھی۔ یہ سیدھی بازار میں کہیں جا نکلتی ہے۔

میں ایک بڑے کھلے پھانک کے پاس سے گزرا۔ اندر ایک چبوترے پر ایک چارپائی پر سفید چادر میں لپیٹی ہوئی ایک شکل ساکت پڑی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ یاد کا ایک مبہم تار میرے دل میں گونجا، ماضی کی پہنائیوں سے گونجیں آئیں۔ میں نے اس منظر کو پہلے کہیں دیکھا تھا۔ میرے پاؤں پھانک کے باہر گم ہو کر رہ گئے۔

اندر چبوترے پر کئی لوگ جمع تھے۔ بعض رو رہے تھے۔ میت کے پاس ایک لمبا معمر سفید ریش شخص کھڑا تھا اور لوگ اس کے پاس آ کر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ ہر ایک چیز مجھے آشنا لگی اور میں مسکرا کر دیکھنے لگا۔

اسی وقت میں نے اپنے سامنے اتنا نزدیک کہ میں اس کو بازو سے پکڑ کر اٹھا سکتا تھا۔ ایک سیب سے گالوں والا لڑکا دیکھا۔ وہ ایک سلمی ستاروں سے کاڑھی ہوئی قدرے مدھی گول ٹوپی پہنے تھے۔ اس کے پاؤں میں براؤن اونچی ٹوہ والے بوٹ تھے وہ ایک موٹے فربہ چہرے والی عورت کی انگلی پکڑے حیرت سے بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ سامنے چبوترے پر رکھی میت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ فربہ چہرے والے عورت کی قمیض پکڑ کر اس کے ساتھ دبک گیا اور اس کی طرف نظریں اٹھا کر ایک بھاری پنجابی لہجہ میں بولا۔ ”اماں! یہ کیہ ہو گیا اے!“

بوڑھی عورت اپنے ہونٹوں میں سے بڑبڑائی۔ ”کا کا! آغا صاحب کی بیگم جو آپاں نوں کھنڈ کھلاندى ہوندى سی نا اوہ فوت ہو گئی اے۔“ اور پھر وہ نیچے جھکی۔ چھوٹے خوبصورت بچے کی ناک صاف کرنے کے لیے جو اس کے منہ تک بہہ آیا تھا۔ اس کے بعد وہ فر بہ عورت چھوٹے بچے کو ساتھ کھینچتی ہوئی پھاٹک میں سے اندر لے گئی۔ یہ میری زندگی کا سب سے عجیب ترین واقعہ ہے اگرچہ بہت سے اس کا یقین نہیں کریں گے۔



مچھلیاں اور عبدالباقی

دراصل بھتیجے مجھے جو وقت رہی ہے وہ یہ کہ مجھے ایسے حصہ دار نہیں ملتے رہے جن میں سرمایہ لگانے کا حوصلہ ہو۔ ورنہ بزنس میکنیٹ بننا کونسی مشکل چیز ہے۔ ایک سگریٹ تو پلاؤ۔

چچا عبدالباقی اور میں ایک سنہری شام وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے چچا اپنے حصہ داروں کی خساست پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ ہم کو اپنے پچھلے مشترکہ کاروبار میں (جس کا تعلق غالباً پرانے ٹکٹوں کی فروخت سے تھا اور جس میں چچا عبدالباقی اس کا دس سالہ بیٹا عبد الرحمن اور میں برابر کے حصہ دار تھے) بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات قدر سے کشیدہ ہو گئے تھے۔ چچا عبدالباقی کا اپنے حصہ داروں کی خساست کا ذکر مجھے ایک نرم گوشے میں چھوٹنے کی خاطر تھا۔

اس نے مجھے اپنی صفائی کرنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ ”ورنہ“ اس نے سگریٹ پر لمبے پر اطمینان کش لیے ورنہ بھی بختیار میں برے کام کا آدمی ہوں آج تک اپنے سے اچھا آرگنائزر دیکھنے کی حسرت رہی ہے۔ کیا میں نے تم سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پچھلے ہفتے جب میں سیکرٹری تربیت حیوانات سے ملا تو ایک گھنٹے کی ہی گفتگو میں وہ میرا اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ کہنے لگا عبدالباقی صاحب میں متعجب ہوں۔ میری سمجھ سے بالا ہے کہ اس قدر خوبیاں ایک واحد فحل میں کیسے اکٹھی ہو گئیں۔ آپ سچ سچ بتائیے۔ بھلا اتنے عرصہ کہاں چھپے رہے۔ آپ کو تو کسی ملک میں سفیر ہونا چاہیے تھا۔“

ایک فرما بردار بھتیجے کی طرح میں سیکرٹری محکمہ تربیت حیوانات کی چچا کی قابلیت کے متعلق رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ چچا جیسے شخص کے لیے واحد موزوں جگہ سنٹر میں وزارت ہے۔

مسرت کی سلوٹیں اس کے گول دودھ پیتے بچے کے سے چہرے پر نمودار ہوئیں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے فربہ ہاتھ میں لے کر تشکرانہ اور رازداری کے اظہار کے طور پر دبایا۔

”بھئی بختیار۔ تم ان معدود سے چند آدمیوں میں سے ہو جو مجھے سمجھ پاتے ہیں لیکن عبدالباقی کو نستر کون بناتا ہے۔ یہاں تو بھتیجے۔ قابل آدمی کو نزدیک نہیں ٹھہکنے دیا جاتا۔“

ہم پیراڈائز سینما کے سامنے کوئی بیسویں دفعہ رکے۔ ٹکٹ گھر کے سامنے کیو لگنا شروع ہو چکا تھا۔ ہم کچھ دیر کھڑے داخلے کے

اوپر لگے ہوئے فلم کے رنگین اشتہار کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ہم دونوں اس انتظار میں تھے کہ ہم میں سے کون (دوسرے کو) فلم دکھانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری جیب میں لے دے کے صرف ساڑھے بارہ آنے کے پیسے تھے... اور چچا عبدالباقی اپنی جیب میں نقد ڈال کر گھر سے باہر آنے کے حق میں کبھی نہیں رہے۔

”پکچر کنسی ہے۔“ سمن اینڈ ویلصار“ چچا عبدالباقی نے ظاہراً اتفاقاً لہجے میں کہا۔ اچھی معلوم ہوتی ہے سنا ہے بلی کل کہانی ہے۔“

”کیا خیال ہے چچا اسے نہ جائے“ میں نے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ممکن تھا کہ شاید وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا اصول بھول گیا ہو۔

”جیسے تمہاری مرضی“ بھتیجے“ چچا عبدالباقی نے کہا ”اگر تمہاری پکچر دیکھنے کی صلاح ہے تو ابھی سے کیو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میری جیب میں کل بارہ آنے ہیں۔

”اوہو۔ بھی بختیار تم نے مجھے گھر کیوں نہ بتایا کہ تمہارا پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے میں پیسے جیب میں رکھ لیتا۔ ویسے بھتیجے میرا تمہیں یہ مشورہ ہے برامانے کی ضرورت نہیں کہ جب تک جیب میں پیسے نہ ہوں تمہیں لوگوں کو سینما دیکھنے کی دعوت دینے سے احتراز کرنا چاہیے یہ ایٹنی کیٹ نہیں۔“

اس کے انداز میں قدرے رنجش کا اشارہ تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”تم مجھ سے اگلے روز گروی کی دکان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ یہاں پاس ہی کھارادار میں ایک گروی کی دکان ہے جہاں گھڑیاں اور فونٹین پین وغیرہ گروی رکھے جاسکتے ہیں۔“

اس نے امید کی نظروں سے کوٹ کی اوپر والی جیب میں لگے ہوئے پارک فونٹین پین کو دیکھا جسے میں نے اپنے دوست محمد منیر تنویر سے چند دنوں کے لیے مستعار لیا تھا۔

”اس وقت گھڑی میرے پاس نہیں ہے۔ پھر کسی وقت سہی“ میں نے جواب دیا۔

”فونٹین پین بھی وہاں گروی رکھے جاسکتے ہیں“ چچا عبدالباقی نے کہا۔

پروپرائٹرز میرا دوست ہے۔ چلو گروی نہ رکھنا۔ میرے ساتھ آؤ۔ دکان کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔“

”چچا۔ تم مجھے دکان دکھانے پر اتنے مصر ہو۔ جیسے تم خود اسے چلا رہے ہو۔“

اس بات سے اسے کچھ تکلیف پہنچی اور ہم ایک دوسرے سے روٹھے اور کچھ ہوئے پیراڈائز سے واپس ہو کر پگڑی پر درمیان میں فاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔ ایک لخت میں نے دیکھا کہ چچا عبدالباقی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ جاسوسی ناول نگاروں کے الفاظ میں نعش کی طرح زرد۔ اس نے اچانک ایک غوطہ لگایا اور پاس کی دوکانوں میں سے ایک لہو کے اندر پھرتی سے غائب ہو گیا۔ میں کھڑا ہو کر چچا کی اس عجیب حرکت پر تعجب کر رہا تھا۔ ایک طرح دار پگڑی پہنے خوفناک شکل کا انسان جس کچھرے سے ہنٹنوں کے حساب سے برس رہا تھا۔ میرے روبرو آ کر ٹھہر گیا۔

”یہ آدمی جو ابزی آپ کے ساتھ آ رہا تھا کہاں چلا گیا ہے۔“ اس نے اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے کہا۔

”کونسا آدمی“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”وہ آدمی جو آپ کے ہمراہ تھا اس کا نام عبدالباقی ہے“

”عبدالباقی۔ ابھی ابھی آپ کے ساتھ آ رہا تھا“ طرے والا آدمی اب اپنے کو کچھ بے وقوف محسوس کر رہا تھا۔ ”ترکی ٹوپی پہنے ہوا تھا۔ مونا تازہ آدمی ہے۔ معصوم بچوں کا سا چہرہ ہے۔ چور کوریشیوں کی عینک پہنتا ہے۔ کراچی میں اس وقت غالباً سب سے مشہور چار سوئیس ہے“

”میں اسے نہیں جانتا“ میں نے کہا ”ویسے شکریہ۔ میں اس سے بچ کر رہوں گا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے ہمراہ تھا۔“

”ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے! آپ اس سے۔ عبدالباقی سے ملنے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں!“

”اس کو میرا چار ہزار روپیہ دینا ہے۔ اس کے گھر جاؤ تو اندر سے کہلو ابھی جتا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔“

”یہ تو آجکل کئی لوگ کرتے ہیں۔ میں خود اسی طرح کرتا ہوں۔“

طرے دار پگڑی والا شخص مجھے قاتلانہ نگاہوں سے گھورتا ہوا آگے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ارد گرد چچا عبدالباقی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ بالکل غائب ہو چکا تھا اور مجھے کہیں نظر نہ آتا تھا پھر میں نے ایک آواز سنی۔

”بھتیجے آل کلیر ہو گیا ہے؟“

آواز کی سمت دیکھتے ہوئے میں نے چچا عبدالباقی کی چوکور عینکوں کو ہیرکننگ سیون کے سونگ دروازے کے اوپر دیکھتے ہوئے

”آل کلیر ہے۔ آج وہ“ میں نے کہا۔

”اچھی طرح اطمینان کر لو کہ وہ آدمی واقعی چلا گیا ہے۔“

میرے اطمینان دلانے پر وہ سونگ ڈور سے باہر نکلا۔ اس نے مجھ سے آٹھ آنے ادھار لے لیے اور ہیرکننگ سیون میں حجامت کرانے کے لیے لوٹ گیا۔ اس نے کہا کہ حجام استرا لیے اس کا انتظار کر رہا ہے اور اس وقت حجامت کرائے بغیر چل دینا شرافت سے بعید امر ہے۔ جس وقت شیوا کرا کے باہر نکلا تو میں نے اس سے اس طرح بھاگنے کی وجہ دریافت کی۔

”یہ طرے والا شخص کون تھا؟“ میں نے پوچھا ”مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم سے چار ہزار روپیہ لینا ہے“

”اس شخص کا نام ایم اے خان ہے“ چچا عبدالباقی نے مجھے اطلاع دی۔ ”یہ نہایت کم ظرف اور ذلیل انسان ہے یہ موٹر سپیر (spare) پرزوں کے کاروبار میں میرا برابر کا حصہ دار تھا۔ اس کی خساست کی وجہ سے فرم کو سات ہزار روپے کا خسارہ ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ میں چار ہزار روپے کا مال خورد برد کر گیا ہوں۔ دراصل بھتیجے! تم میں ایک مکمل حصہ دار بننے کی صلاحیت ہے۔ تم اور میں اگر مل کر کوئی کام شروع کریں تو...“

چچا عبدالباقی میرا مکمل حصہ دار بننے کے سلسلے میں درست ہی کہہ رہا تھا۔ ہماری دوستی اتنی تباہ کن کاروباری شرکتوں کے بعد بھی فاتحانہ طور پر زندہ رہ گئی تھی۔ لیکن پچھلے تجربات کی بنا پر میں نے اس موڑ کو جو گفتگو اب لینے لگی تھی پسند نہ کیا اور میں محتاط ہو گیا... ”مجھے ابھی ہیرکننگ سیون میں ایک خیال سوچا ہے“ عبدالباقی نے اپنے بازو میرے بازو میں منسلک کرتے ہوئے کہا ”مجھے ہمیشہ اپنی بہترین اس کیبیں شیو کراتے ہوئے سوچتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اس پر غور کرو۔“

”میں اسے سننا چاہتا ہوں“ میں کراہا۔

”بھئی وہی ڈپٹی سیکرٹری تربیت حیوانات، جس سے میں نے پچھلے دنوں ملاقات کی تھی اور جو میرا اس قدر مداح ہے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ میں گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کی خرید کا ٹھیکہ لے لوں۔ اس مجھے سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے یہ ٹھیکہ دلوانے میں پوری مدد دے گا وہ اپنے لیے منافع میں دس فیصد سے زیادہ کی بھی خواہش نہیں رکھتا۔ میں تم سے اس معاملے میں بہت پہلے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر تم مجھے ملے ہی اتنے دن بعد ہو۔“

”کیا وہ تمہیں سفارت دلوانے میں مدد نہیں دے گا۔“ میں نے پوچھا۔

چچا عبدالباقی نے میرے اوجھ واد کو نظر انداز کرتے ہوئے گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کے ٹھیکے کے فوائد مجھ پر واضح کئے۔

”بھئی بختیار یہ ایک ایسی بزنس ہے جس میں نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو گھر بیٹھے بٹھائے نوٹ بنانے والی بات ہے۔ گورنمنٹ فشرز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالر مچھلیوں کے کچھ ہفتے میں دو روز لاتے ہیں۔ ہمارا کام محض اتنا ہو گیا کہ ڈاکس پر جا کر اس مال کو مچھلی کے تھوک بیوپاریوں کے ہاتھ نیلام کر دیں اور رقم جیب میں ڈال کر مزے سے گھر آ جائیں۔ میں نے ابھی شیوار کراتے ہوئے سارا حساب کر کے دیکھا ہے ایک کچھ پر کم از کم پانچ ہزار روپیہ ہمیں بچتا ہے۔ یعنی سب خرچہ وغیرہ نکالنے کے بعد۔“

تو چچا یہ ٹھیکہ تم کیوں نہیں؟ میں نے اپنے آپ کو اس سکیم سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور مزے کی بات یہ ہے“ چچا عبدالباقی نے کہا کہ اس کے لیے زیادہ سرمایہ کی بھی ضرورت نہیں۔ چار ہزار روپے سے کام شروع کیا جاسکتا ہے... یہ تو ڈپٹی سیکرٹری مجھ پر ذاتی طور سے احسان کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اس ٹھیکے کے لیے تو بڑی تک و دور اور سفارش کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ ڈپٹی سیکرٹری میرا گرویدہ ہو گیا ہے“

”لیکن چچا یہ چار ہزار روپے کی رقم تم کہاں سے لو گے“

”بھئی بختیار تمہارا خیال ہے کہ میں تم کو اس میں حصہ دار نہیں بناؤں گا۔ تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ اتنے تعلقات کے بعد میں اس قدر کمیونگی کا مظاہرہ کروں گا... اس پر غور کرو جیتے! یہ سونے کی کان ہے۔ روپیہ کماؤ۔ بزنس میکنیٹ بنو...“

ایک غرارہ پوش لڑکی ہمارے پاس سے گزری اور چچا نے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجائی۔ دراصل وہ اس وقت اپنے کو اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا محسوس کر رہا تھا اس کی چال میں بھی ایک طفلانہ لچک آ گئی تھی۔ مچھلیوں نے مستقبل کو خواہ آئندہ اور گلابی بنا دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے وکٹوریہ روڈ کے آخر میں ایک موٹر شوروم کے سامنے رک گئے۔ بڑے شیشے کے دروازوں کے پیچھے بلی کی تیز سفید روشنی میں نئی چمکیلی موٹر کاریں ایک دوسرے سے ناک بھڑائے کھڑی تھیں۔ چچا عبدالباقی نے ان کو گہری دلچسپی سے دیکھا۔

”جیتے!“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”ذرا سوچو۔ مہینے کے آخر میں ہم دونوں کے پاس فسٹ کلاس موٹر کاریں ہوں گی۔ میں نے تو کیڈ لاک خرید کرنے کا فیصلہ کیا ہے ڈپٹی سیکرٹری تربیت حیوانات کے پاس بھی کیڈ لاک ہے۔ ایک مہینے کے بعد ہم کراچی کے فشن کنگ ہوں گے۔“

عبدالباقی شوروم میں جا کر کاروں کی قیمتیں دریافت کرنے کا آرزو مند تھا لیکن میرے یہ بتانے پر کہ یہ کیڈ لاک کاریں نہیں ہیں۔ بلکہ گھٹیا میں ک کی کاریں ہیں۔ اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔

”آگے چلتے ہوئے اس نے اپنے حصہ دار کو ایک اور فیاضانہ پیشکش کی۔

”اور بھتیجے“ اس نے کہا ”اس دفعہ میں تم کو سرمایہ لگانے کے لیے بھی نہیں کہوں گا اس کے باوجود تمہارا پچاس کا حصہ ہوا۔ سرمایہ کی ایک ایک پائی تک میری ہوگی تمہیں صرف پہلے مجھے چار ہزار روپہ بطور قرض حسنہ کے دینا ہوگا۔ ایک مہینے کے اندر تمہارا یہ چار ہزار تمہیں واپس مل جائے گا۔ ایک ایک پائی...“

”میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں“ میں نے کہا ”چچا اب پیچھے نہ مز چلیں! سامنے میرے ٹیلر کی دوکان ہے۔“
ہم پیچھے مڑ کر چلنے لگے۔

”کیا تمہارا سارے کراچی میں ایک بھی ایسا دوست نہیں جو تمہیں پانچ ہزار کی رقم صرف ایک مہینے کے لیے دے سکے۔ صرف ایک مہینے کے لیے۔“ اس نے پرامید لہجے میں کہا۔ اگلے دن تم مجھ سے اپنے دوست محمد منیر کا ذکر کر رہے تھے مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس کے پاس جاؤ تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ دوست آخر اسی لیے ہوتے ہیں کہ بوقت ضرورت قرض دے سکیں...“ ”کیا خوبصورت لڑکی ہے“ اور اپنے ہونٹ سکیر کر چچا عبدالباقی نے پھر سیٹی بجائی۔

”کیا خوبصورت لڑکی ہے“ کاریم مارک ایک سلونی، اٹھے ہوئے ناک والی حسین سی چیز کے بارے میں کیا گیا تھا جو ہاتھ میں لیڈیز ہینڈ بیگ لٹکائے اونچی ایڑیوں کی گرگابیوں پر ٹپ ٹپ کرتی ہمارے پس سے گزری تھی۔ میں نے چچا عبدالباقی کو کبھی اس قدر رومانٹک اور بشارتیں نہیں دیکھا تھا، جتنا اس شام کو۔ وہ اٹھے پاؤں پھر لڑکی کے پیچھے جانے کا خواہشمند تھا۔ مگر میں نے اس کو پھر یاد دلایا کہ اس طرف میرے ٹیلر کی دوکان ہے۔

ہم فریر ہال کی طرف چلتے گئے۔ مچھلیوں کے گلابی رو پہلی خواب دیکھتے اور شرکت کی شرائط پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے مچھلیوں سے متعلق سب امور کو خوش اسلوبی سے طرے کر لیا۔ اگرچہ ہمیں زندگی میں مچھلیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کبھار ہمارے دسترخوان کی نعمت بنتی تھیں پھر جس معاملہ فہمی اور کاروباری انداز سے ہم نے اس رات مچھلیوں کے متعلق باتیں کیں اس نے ہمیں خود حیران کر دیا۔

دوسرے دن صبح نو بجنے میں اور چچا عبدالباقی وکٹوریہ میں کلنٹن پر ڈپٹی سیکرٹری محکمہ تربیت حیوانات کے دفتر میں گئے۔ میں وکٹوریہ میں بیٹھا رہا اور عبدالباقی ڈپٹی سیکرٹری سے ملنے اندر چلا گیا۔ جب وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو بشارت کی تصویر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے اس نے بڑے فخر سے میرے سامنے لہرایا۔ ڈپٹی سیکرٹری نے اسے اپنے دوست کے نام چٹھی دی تھی جو

ایک ایسے شخص کو جاننا تھا۔ جس کی ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر کے ہیڈ کلرک سے گاڑھی چھنتی تھی۔ حیوانات کے دفتر سے ہم چھ میل کا فاصلہ طے کر کے جمشید روڈ پر اس دوست کی کوٹھھر پہنچے جس کے نام کی چھٹی تھی۔ کوٹھی کے پچھواڑے ایک گٹھا ہوا شخص جاگلیا اور بیان پہنے اور لوہار کی دھونکی کی طرح ہانپتا ہوا ایک ہنڈ پمپ کے دستے کو اس تندی اور آہنی عزم سے چلا رہا تھا جیسے دنیا کے مستقبل کا اس پر دار و مدار ہو۔ ہنڈ پمپ کے منہ سے ایک بڑکا پائپ کوٹھی کی دوسری منزل پر جاتا تھا۔

”معاف کرنا بھائی“ چچا عبدالباقی نے اسے پوچھا۔ ”کیا محمد احسن اشرفی صاحب اسی کوٹھی میں اقامت پذیر ہیں۔“

”بالکل“ اس آدمی نے ہنڈ پمپ پر اپنی مشقت کو روکتے اور اپنے ماتھے سے پسینے کو پونچھتے ہوئے جواب دیا ”قطعاً“ بلکہ محمد احسن یہ تاجیز ہے“ پھر اس نے اپنی ہیبت کدائی کی معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”بدبخت نوکر پھر آج بھاگ گیا ہے میں اوپر کی منزل پر رہتا ہوں مجھے ہر صبح اوپر پانی پہنچانے کے لیے اس بدبخت پمپ سے دو گھنٹے دھینگا مشتی کرنا پڑتی ہے۔ میرے سات بچے ہیں اور وہ سب نہانے کے عادی ہیں میں خود مینہ میں ایک دو دفعہ نہاتا ہوں۔ فرمائیے کیسے تشریف لائے ہیں۔“

”کریم الدین صاحب نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے“ عبدالباقی نے اسے بتایا۔

”حاجی کریم الدین صاحب نے دیا ہوگا۔ مہربانی کر کے ان سے کہہ دیں کہ میں یہ مکان ہرگز خالی نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ میرے سات بچے ہیں۔“

نہیں یہ مسٹر کریم الدین صاحب ڈپٹی سیکرٹری حیوانات کی چھٹی ہے“ چچا نے اسے تسلی دی۔

”مچھلیوں کے کنٹریکٹ کے متعلق تو نہیں“ اس آدمی نے اعتماد سے پوچھا۔

”ہاں اسی کے متعلق ہے۔ غالباً کریم الدین صاحب نے آپ سے اس سلسلے میں میرا ذکر ضرور کیا ہوگا۔ میرا نام ایچ اے اے باقی ہے۔“

ہم اس جواب سے اتنے بھونچا رہ گئے کہ کچھ عرصے تک کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر چچا عبدالباقی نے پوچھا ”تو گویا ان لوگوں کو ابھی کنٹریکٹ نہیں مل سکے۔“

”کنٹریکٹ! ان میں سے ہر ایک کو کنٹریکٹ مل چکا ہے۔ وہ کچھ عرصے کے بعد چھوڑ کے چلے جاتے ہیں ان میں سے دو اس وقت جیل میں ہیں۔“

”جیل میں؟“ چچا عبدالباقی نے ہڑبڑا کر احتجاج کیا۔

”بالکل! مطلقاً ان بدبختوں نے وقت پر گورنمنٹ کو ٹھیکے کی رقم ادا نہ کی تھی۔ اور پھر صاحب۔ انہوں نے میری مسز اور مجھ پر دن و ہاڑے انفسٹن سٹریٹ میں گندے انڈے پھینکے۔ آپ حضرات تو اچھے خاصے معزز معلوم ہوتے ہیں!“

”دیکھو مسٹر بختیار سیٹھ“ چچا عبدالباقی نے اپنی آنکھ میں ٹمٹماہٹ لیے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”ہم لوگوں کی اخلاقی حالت کس قدر پست ہو چکی ہے برسر بازار لیڈیز پر گندے انڈے پھینکنا اور پھر بے چارے اشرفی صاحب نے انہیں ٹھیکہ لے کر دیا تھا۔“

”ہاں ایچ اے باقی ہے“ چچا عبدالباقی نے پروقار انداز میں اسے درست کیا۔ ”حاجی عبدالباقی میں علیگ ہوں۔“

”او معاف کیجئے۔ آپ صاحبان تھوڑی دیر تک تشریف رکھئے۔ برآمدہ میں دو اسٹول رکھے ہیں۔ میں ذرا اس کام سے فارغ ہوں۔“

وہ آدھ گھنٹے تک فارغ ہو کر آئی۔ اب وہ ایک نیلی سفید پتلون اور ایک خوفناک امریکن بوشرٹ پہنے ہوئے تھا جس کے انچ انچ پر اخباروں کی قتل، طلاق اور جارحانہ عشق کی سنسنی خیز کمنگنز چھپی ہوئی تھیں۔ محمد احسن اشرفی ان شخصوں میں سے تھا جو خبروں کو پڑھنے کی بجائے اوڑھنے میں یقین رکھتے ہیں۔

چچا عبدالباقی نے اسے ڈپٹی سیکرٹری کا خط دیا۔ اشرفی نے اسے سرسری انداز سے اور بے دلی سے پڑھا۔

”آپ کا ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں رسوخ ہے“ چچا نے پوچھا۔

”رسوخ!“ اشرفی بولا ”میرا دوست ایک شخص کو جانتا ہے جو فشریز کے ہیڈ کلرک کو جانتا ہے۔ بلکہ وہ شخص اس ہیڈ کلرک کا سگا ماموں ہے۔ میں آپ کو اس دوست کے نام خط لکھ دیتا ہوں اسے گیارہ بجے سے پہلے مل لیجئے۔ اس وقت تک وہ گھر پر ہوتا ہے اس کے بعد وہ مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا ہے۔“

”مچھلیاں پکڑنے؟“ چچا نے چہیں ہنسی ہو کر کہا۔

”ہاں یہ اس کی بابی ہے۔ بابی! کچھ عرصہ پہلے اس کی بابی کلکٹس جمع کرنا تھی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۳۰ء کے بنے ہوئی مرتبان جمع کرنے کا شوق کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ اسکول میں میرا ہم جماعت تھا اس کی بابی ایک صندوق میں مینڈک پکڑ پکڑ کر بند کرنا تھا... آپ جانتے ہیں بعض لوگ بابی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ لوگ اب جانے کی کریں ورنہ وہ گھر پر نہیں ملے گا۔“

چچا عبدالباقی نے اسے بتایا کہ اس نے اس کے نام ایک خط دینے کا وعدہ کیا تھا۔

”خط ضروری نہیں ہوگا“ اس نے کہا ”آپ اس سے کہہ کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔“

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کٹھی سے باہر آ کر وکٹوریہ میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ چچا کو یاد آ گا کہ اشرفی نے ہمیں دوست کا نام اور پتا تو بتایا ہی نہیں۔ ہم پھر واپس اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو وہ ہمارے ساتھ چلے گا۔ ہم نے اس کرم فرمائی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے مزید شرمندہ نہ کریں اور یہ کہ ہماری امداد کرنا اس کا فرض ہے۔

ہم نے اس کرم فرمائی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے مزید شرمندہ نہ کریں اور یہ کہ ہماری امداد کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کے بعد ہمیں اسٹولوں پر بٹھا کر وہ اوپر چڑھ گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ نیچے آیا تو اسکے ساتھ پانچ چھوٹے اشرفی اور تھے اگر دنیا میں ان سے زیادہ بدتمیز اور ناخوشگوار بچے اور کہیں ہیں تو میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ اپنے باپ کے بچپن کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے تھے اور اشرفی چھاپ واضح طور پر ان کی پیشانیوں پر ثبت تھی۔

”معاف کیجیے۔ سیٹھ عبداللہ فانی صاحب مجھے قدرے دیر ہوگئی“ اس نے معذرت چاہی۔

”میرا نام عبدالباقی ہے“ چچا نے وقار سے کہا۔

”اوہ عبدالباقی... ہاں تو صاحب بات یہ ہوئی کہ بچے ابھی سکول کے لیے تیار نہ ہوئے تھے۔ آپ حضرات اگر برا نہ مانیں تو بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد عبداللہ فانی کے ہاں چلیں گے۔ آپ ٹیکسی میں آئے ہیں نا“

”وکٹوریہ میں بھی ٹھیک ہی ہے۔ اگرچہ بچوں کو دیر تو ہو جائے گی۔ میں اپنی کار لے چلتا۔ لیکن اس کا سٹیرنگ ٹوٹ گیا ہے۔“

اشرفی کے بچوں کو ان کے سکولوں میں چھوڑنے میں ہمیں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ وہ دو مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے جن میں ایک اسی سینیاں لائنز کی طرف تھا اور دوسرا میری ویدر کا کٹاؤر کے پاس۔ ویسے ان میں سے کوئی بھی اسکول جانے کا شائق نہ تھا وہ سب کلفٹن جانا چاہتے تھے اور بے حد بگڑے ہوئے بچے تھے۔ اور اپنے سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف تھے۔

بچوں کو سکولوں میں پہنچانے کے بعد محمد احسن کو یاد آ گیا کہ اس کی بیوی کے لیے ایک سویٹر اور بچوں کے لیے جرابیں صابن ہیر آئل وغیرہ خریدنا ہیں۔

”اگر آپ حضرات برانہ مانیں“ اس نے بولٹن مارکیٹ کے پاس وکٹوریہ ٹھہراتے ہوئے کہا ”تو میں یہاں سے کچھ ضروریات کی چیزیں خرید کر لوں۔ بدبخت بچے صابون اور تیل دو روز میں ختم کر دیتے ہیں۔ میں ابھی منٹ میں آیا“ وہ پورے ایک گھنٹے کے بعد آیا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مارکیٹ کے ارد گرد کی سب دوکانوں کو چھان مارا ہے اس نے کئی سوئٹر، کئی جرابوں کے جوڑے اور صابن اور ہیرا آئل کی بوتلیں دوکانوں پر دیکھیں، لیکن وہ سوئٹر وہ جرابیں، صابون اور ہیرا آئل نہ تھا جو وہ خریدنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ صرف ایک ربڑ کا چھوٹا گیند خرید کر کے لایا اور اس کے متعلق بھی اسے شکایت تھی کہ دوکاندار نے اسے لوٹ لیا ہے۔

”بدبخت دوکانداروں نے ہر چیز کے بھاؤ چڑھا رکھے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر آپ حضرات برانہ مانیں تو میں ایک منٹ کے لیے جو نا بازار بھی ہواؤں۔“

مختصر اُپ کو جو نا بازار میں ڈیڑھ گھنٹہ لگانے کے بعد جہاں سے اس نے ایک لوہے کا کفگیر خریدا، اس نے ہمیں اطلاع دی کہ اب اس کے دوست کے ہاں جانا فضول ہے، کیونکہ اب وہ یقیناً مچھلیاں پکڑنے جا چکا ہوگا۔ ”اگر آپ برانہ مانیں“ اس نے کہا ”تو مجھے کوٹھی پر چھوڑ دیں۔ معاف کیجئے۔ آپ حضرات کو بے حد تکلیف ہوئی۔ کل نو بجے آپ پھر میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں تو بہتر ہوگا۔ بدبخت وکٹوریہ بہت وقت لیتی ہے۔“

ہمنے اسے اس کی کوٹھی پر چھوڑا۔

چچا عبدالباقی نے اس سے پوچھا ”آپ ہمیں اپنے دوست کا پتا تو بتا دیجئے۔ ہم ان سے خود ملنے کی کوشش کریں گے۔“

نہیں صاحب، یہ بھی کوئی بات ہے، میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا“ اس نے کہا۔

”عبدالحنان ذرا ٹیڑھی کھیر ہے“

”ان کا نام عبدالحنان ہے؟“ چچا نے پوچھا۔

”بالکل۔ مطلقاً“ محمد احسان شرفی نے کہا۔

”غالباً وہی تو نہیں جو سویٹ میٹر چنٹ ہیں؟“

”نہیں یہ اور ہیں یہ مولوی عبدالحنان ہیں“

”کہاں رہتے ہیں؟“

اس نے ذرا تامل کے بعد ہمیں میریٹ روڈ پر ایک پتا بتایا۔ مگر ساتھ ہی اس نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ ہم اس کو ہمراہ لیے بغیر عبداللہ خان سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔

”نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ چچا نے اسے یقین دلایا۔

وکتور یہ میں لوٹے وقت چچا عبداللہ خان نے جو اس شخص کے خلاف بھرا بیٹھا تھا جی بھر کر اپنا غبار نکالا۔ اس اشرفی کے بچے کو دیکھو یہ کوئی انسانیت ہے۔ یہ خرید کرنا ہے وہ خرید کرنا ہے یہاں چلو۔ جیسے وکتور یہ اس کے باپ کی ہے بختیار بھی۔ کل اس شخص کے یہاں آنے کی بجائے سیدھے مولوی عبداللہ خان کے پاس چلیں گے تم نے دیکھا میں نے اس سے عبداللہ خان کا پتا کیسی حکمت عملی سے اگلوایا۔ وہ اسے نہیں بتا چاہتا تھا۔“

جب ہم نے وکتور یہ کو چچا کے مکان پر رخصت کیا تو وکتور یہ والا سات روپے سے کم لینے پر رضامند نہ ہوا۔ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے کرایہ ادا کیا۔ چچا عبداللہ خان پاس کھڑا بے تعلقانہ انداز میں دیکھتا رہا۔

مولوی عبداللہ خان میریٹ روڈ پر ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اور ہم نے اس کا پتا بڑی مشکل سے ڈھونڈا وہ خود بھی ایک انتہائی تنگ و تاریک قسم کا آدمی نکلا۔ بانس کی طرح لمبا اور سارے کا سارا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ ایک مشینی آدمی کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اعضا ناگہانی دھچکوں کے ساتھ حرکت میں آتے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے ایک چھوٹی سی کارڈینل رچیلو (cardinal richiliew) ٹائپ ڈاڑھی معلق تھی۔ ایک نہایت ہی بوسیدہ اور شرمناک ڈاڑھی۔ جس وقت ہم اس کے پتا پر پہنچے وہ ایک نہایت قدیمی پلس فور اور ایوننگ کیپ پہنے اور ہاتھ میں مچھلی پکڑے سبزھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہم نے اسے عین موقع پر پکڑا تھا ورنہ وہ گھر پر ہمیں یقیناً نہ مل سکتا۔

ہم نے اسے بتایا کہ ہم کو محمد احسن اشرفی صاحب نے اس کے پاس بھیجا ہے اور اس نے فوراً ہم سے پوچھا کہ آیا ہماری تشریف آوری گورنمنٹ کی مچھلیوں کے ٹھیکے سے متعلق ہے ہم نے اسے یقین دلایا کہ یہی ہمارے حاضری ہونے کا مقصد ہے۔ چچا عبداللہ خان نے اس کی قیافہ شناسی کی مناسب الفاظ میں داد دی۔

اس نے کہا کہ وہ ہمیں ضرور یہ ٹھیکہ دلوانے میں حتی الامکان تنگ و دو کرے گا اور چونکہ ہمیں اشرفی صاحب نے بھیجا اس لیے وہ ہم سے بالکل معمولی کمیشن چارج کرے گا۔

کمیشن کے ذکر نے ہمیں حیران کر دیا۔ چچا عبداللہ خان نے اسے بتایا کہ ہم دراصل ڈپٹی سیکرٹری کریم الدین صاحب کے اپنے

آدمی ہیں اور یہ کہ ہمارا خیال نہ تھا کہ کمیشن دینے کا کوئی سوال بھی پیدا ہوگا۔“

ایک انتہائی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

”کیا آپ کو معلوم نہیں؟“ اس نے کہا ”کہ ڈائریکٹر فشریز کے عملے کو دیئے دلائے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اپنے لیے تو مجھے ایک پائی تک کی خواہش نہیں، ویسے آپ کو خود خیال کرنا چاہیے کہ یہ ٹھیک لینا سخت مشکل کام ہے۔ آئیے اوپر چل کر دفتر میں بیٹھیں۔“

ہم میزھیاں چڑھ کر اوپر اس کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس کا دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کچھونے میں ایک تل اور ایک بالٹی ظاہر کرتے تھے کہ غسل خانہ بھی یہیں ہے۔ ایک میز کے آریار دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کی نشست ادھڑ جانے کی وجہ سے غائب تھی۔۔۔ تل کے اوپر ایک رنگین تصویر ایک کیل سے لٹک رہی تھی۔ جس میں قائد اعظم اور لیاقت علی خان چاندستاروں والی ٹوپیاں اور ۱۸۶۰ء کی ترکی فوج کی وردیاں پہنے اور مجاہدانہ شمشیروں سے لیس، سطلطفا نہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

اس نے جلدی سے اپنے آپ کو دفتر کی واحد قابل استعمال کرسی پر متمکن کرتے ہوئے بغیر نشست والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”تشریف رکھئے۔ معاف کیجئے۔ کرسی یہاں ایک ہی ہے۔ آپ میں سے ایک صاحب میز پر بیٹھ سکتے ہیں۔“

چچا عبدالباقی نے میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ میں بے نشست کرسی کے بیرونی چوبی فریم کے سرے پر اٹک کر بیٹھ گیا۔

”آپ اطمینان سے ہو بیٹھئے“ اس نے میرے ساتھ خوش اخلاقی برتی۔ اس نے اپنی پلس فور کی جیب میں سے ایک پرانا پائپ

اور کاغذ میں لپیٹی ہوئی تمباکو کی پڑیا نکالی اور تمباکو کو اپنی ہتھیلیوں میں مسلتے ہوئے اس نے اپنی مائمی آنکھوں سے ہمارا جائزہ لیا۔

”مجھے سگریٹ پینے کی عادت نہیں“ اس نے کہا ”اس لیے میں آپ کو سگریٹ پیش کرنے سے معذور ہوں۔ اگر آپکی جیب میں

پائپ ہو تو یہ تمباکو کو حاضر ہے“ اس نے پائپ کو منہ میں لگائے اور سلگاتے ہوئے کاروباری باتوں کا آغاز کیا۔

”ہاں تو صاحبان“ اس نے کہا ”کچھ دیئے بغیر ٹھیکے کامل جانا ناممکن ہے۔“ اس نے متعدد کمشنوں ارندرانوں کی فہرست گنائی جن

کا دیا جانا ضروری تھا۔ ایک تو اس کلرک کا کمیشن تھا جو ہم سے ٹنڈر لے گا۔ ورنہ وہ اسے گم کر سکتا ہے۔ پھر اس شخص کا کمیشن ہوگا جو

دوسرے ٹنڈر دینے والوں کے سر بمبر ٹنڈروں کو کھول کر ہمیں ان کا آفر بتائے گا تاکہ ہم اپنے ٹنڈر میں سب سے زیادہ آفر سے ایک

دو پیسے زائد کا آفر کریں۔ پھر ہیڈ کلرک تھا۔

اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے پیئیں۔ بد قسمتی سے اس کی بیوی کہیں باہر تھی اور چائے گھر پر تیار نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئی وہ ہمیں

”نیچے“ دی اسٹیٹ پہلوان ہٹل“ میں لے گیا چچا عبدالباقی اور میں می چائے کی ایک ایک پیالی پی۔ کیونکہ ہم ناشتہ کر کے آئے

تھے۔ مولوی عبدالحنان نے چائے کی پیالی کے ساتھ چارٹوسٹ اور دو آ ملیٹ بھی ختم کئے۔ اٹھتے ہوئے اس نے چچا عبدالباقی کو کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے لیے کہا۔ چچا نے مجھ سے چار روپے ادھار کر بل ادا کیا۔

مولوی عبدالحنان چاہتا تھا کہ کمیشنوں کی رقم جو اس کے حساب کے مطابق ساڑھے تین سو بنتی تھی، فوراً اس کو دے دی جائے۔ پھر جس جس سے نمٹنا ہوگا وہ خود نمٹ لے گا اور ہمارے لیے درد سہی نہ رہے گی۔ چچا عبدالباقی نے کاروباری ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ ہم ضروری کمیشن وغیرہ خود دیں گے۔ اس سے مولوی عبدالحنان کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے کہا کہ اس کے دل کو دکھ پہنچا ہے کہ ہم اس اعتماد نہیں کر رہے اس نے ہمیں کئی ایسی پارٹیوں کے نام گنوائے جنہوں نے اسے پچاس پچاس ہزار تک کی رقم بغیر رسید کے سوئپ دی تھی۔

ہوٹل سے ہم ٹیکسی لے کر ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں گئے۔ مولوی عبدالحنان ہمیں باہر بیچ پر بٹھا کر خود ایک کمرے میں چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا اور اس نے ہمیں اندر آ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم ایک بڑے کمرے میں سے جس میں کئی زرد روٹریاں پیتے ہوئے کلرک میزوں پر ٹانگیں رکھے ہوئے گئیں ہانک رہے تھے۔ ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی میز کے پرلی طرف فائلوں کے پہاڑوں کے پیچھے ایک بھینگی آنکھوں والے قدرے ترش رو شخص نے اٹھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ سامنے ہماری طرف دیکھنے کی بجائے اطراف کی دیواروں کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں یہ ہیڈ کلرک تھا جس کے ہاتھ میں ہماری قسمت تھی۔

”اچھا تو آپ گورنمنٹ فشریز کے ٹھیکے کے منڈور دینا چاہتے ہیں“ اس نے دونوں دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس ٹھیکے کے لیے بڑا زبردست کمپنیشن ہے پچھلے دو دن میں ہمیں بڑی بڑی معتبر پارٹیوں سے پچاس کے لگ بھگ منڈر موصول ہو چکے ہیں۔ آپ چونکہ بھائی عبدالحنان صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ اس لیے آپ کی ہر طرح امداد کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ یہ دیکھتے یہ سب منڈر ہیں۔“ اس نے ایک پرلدی ہوئی ایک مبہم ڈھیری کی سمت اشارہ کیا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر دی ”سب سے زیادہ آفر کھنڈا والا کمپنی نے اپنے منڈر میں دیا ہے۔ یعنی آٹھ ٹن کے کیچ کا چار ہزار روپے آپ چار ہزار ایک روپے کا منڈر دے دیں“

اس نے ایک منڈر فارم ہماری طرف بڑھا دیا۔ چچا عبدالباقی نے مولوی عبدالحنان کی ہدایت کے مطابق اسے پر کیا۔ ہیڈ کلرک نے ہمیں ایک ہزار روپے بطور ضمانت کے اسی روز یا اس سے اگلے روز گورنمنٹ ٹریڈری میں داخل کر دینے کی ہدایت کی۔

ٹریڈری رسید آپ یا تو بھائی عبدالحنان کو دے دیں یا براہ راست مجھے پہنچا دیں۔ میں خود اسے آپ کے منڈر کے ساتھ منتھی

کرنے کے بعد ٹنڈر کو مہر لگا دوں گا لیجئے پان سے شوق کیجئے

اس کے بعد مولوی عبدالحنان چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے گیا۔ ان کے درمیان کچھ دیر کھسرپہر ہوتی رہی۔ پھر چچا عبدالباقی مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ٹنڈر قبول کرانے کے لیے دوسو روپے پر فیصلہ ہوا ہے۔

”تمہارے پاس دوسو روپے ہیں“ اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

مجھے اس روز ایک بزرگ کی معرفت بوڑھے آدمی نے تین سو روپے بھجوائے تھے۔ جو اس وقت میری جیب میں تھے۔ جو اس وقت میری جیب میں تھے مجھے خیال آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ مگر چچا نے مجھے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتے دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی چچا کے اندر دوسرے لوگوں کی جیبوں میں پڑے ہوئے نوٹوں کو سونگھ لینے کی حس حیرت ناک طور پر تیز ہے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے دوسو روپے کے نوٹ چچا عبدالباقی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ چچا عبدالحنان کو ایک طرف لے گیا اور نوٹوں کو اس کی جیب میں ڈال دیا۔ الحنان نے ہیڈ کلرک کے پیچھے چپکے سے جا کر نوٹوں کے کچھ حصہ کو ہیڈ کلرک کی جیب میں منتقل کر دیا۔

اس رسم کے بعد ہیڈ کلرک پہلے سے زیادہ ترش اور گھبرایا ہوا ہمیں وداع کرنے کے لیے اٹھا ”آپ حضرات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور کوئی خدمت ہو تو بندہ ہر طرح سے حاضر ہے۔“

دفتر کے باہر پہنچ کر چچا عبدالباقی نے مجھے سرزنش کی ”دیکھو۔ اختیار! تمہیں وہاں ہیڈ کلرک کے سامنے روپے نکالنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا ایسے کاموں کا تجربہ نہیں اور پھر تم یہ سمجھو کہ یہ دوسو روپے کی رقم میں سے دیئے ہیں۔ جو تم بطور قرض دینے والے ہو۔“

کھار اور کے پاس سے گزرتے ہوئے مولوی عبدالحنان نے مجھ سے پندرہ روپے ادھا لیے۔ اس نے ایک پھیری والے سے کریم پاؤڈر، سستی لپ سنک اور ایک دیسی عطر کی شیشی خرید کی۔ ہم نے اسے میریٹ روڈ پر اس کے فلیٹ پر چھوڑا۔ اس نے ہم سے کہا کہ اگلے روز ہم ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر جاتے ہوئے اسے ضرور ساتھ لے لیں۔ چچا عبدالباقی نے اس سے وعدہ کر لیا۔

”یہ مولوی عبدالحنان بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے“ راستے میں چچا عبدالباقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اس کی ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں بڑی جان پہچان ہے اور ہیڈ کلرک تو اس کا مرید ہے۔ اس کنٹریکٹ کو حاصل کرنا بڑا مشکل ہے ذرا سوچو دو روز میں پچاس ٹنڈر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے کیوں نہ ہو۔ بھتیجے! ایک کیچ پر پانچ ہزار کا منافع وہ پڑا ہے یہ تو بے چارہ

کریم الدین علیگ نکلا ادھر سے مولوی عبدالحنان نے بھاگ دوڑ کی کہ ہمارا چانس اس قدر روشن ہو گیا، دور نہ رسوخ کے بغیر کون پوچھتا ہے۔ اچھا! آج ہی چار ہزار روپے کا انتظام کر کے مجھے فوراً دے دو۔ محمد منیر تنویر سے لینے کی کوشش کرو۔ ہاں یہ آج کالمیشن اور ٹیکسی وغیرہ کا خرچہ اگر تم چاہو تو اس چار ہزار میں سے وضع کر سکتے ہو۔“

”محمد منیر کے بارے میں مجھے یقین نہیں کہ وہ چار ہزار روپے دے دے گا۔“ میں نے کہا۔

”وہ تمہارے باپ کی ہڈیوں کا ایکسپورٹ ایجنٹ ہے۔“ چچا عبدالباقی نے مجھے ڈھارس دی۔ ”وہ بوڑھے آدمی کے حساب میں سے ہی تمہیں یہ رقم دے سکتا ہے۔ بوڑھے آدمی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ایک مہینے کے اندر ہی تم یہ رقم محمد منیر کو لوٹا سکتے ہو۔“

دوسری صبح میں محمد منیر تنویر سے میکوڈروڈ پر اس کے دفتر میں ملنے کے لیے گیا۔ محمد منیر تنویر دوسرے تیسرے مہینے اپنے سٹاف کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ میں نے مس سینڈو کی بجائے ایک نئی لیڈی ریسپشنسٹ کو ڈسک کے پیچھے بیٹھے ہوئے پایا جو میرے اور محمد منیر تنویر کے لیے تکلفانہ تعلقات کو نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک کافی حسین اور پیاری چیز تھی اور اگرچہ ہم ظہمی طبقہ اناٹ سے دور رہنے کے قائل ہیں تاہم ہم شروع سے نسوانی حسن کے قدرداں رہے ہیں۔

محمد منیر تنویر کے پاس اس وقت کوئی ملاقاتی تھا اور لیڈی ریسپشنسٹ نے مجھے کچھ دیر انتظار کرایا۔ ملاقاتی کے جانے کے بعد ریسپشنسٹ نے میرا چٹ اندر بھجوا دیا اور تنویر نے فوراً مجھے اندر بلوایا۔

محمد منیر تنویر مجھ سے اٹھ کر ملا اس نے ایک گرم جوش اور پراعتماد مصافحہ کیا۔ ”آؤ بھی چاہئے اتنا عرصہ تم ملے ہی نہیں“ تنویر نے ملی جلی اردو اور پنجابی میں کہا۔ ”کہا رہتے ہو۔“

اس نے بجلی سے کام کرنے والی گھنٹی بجائی اور چپراسی کو چائے لانے کے لیے کہا۔ اس نے میز کی دراز میں چھپائے ہوئے پانچ سو پچپن کا سگرٹوں کا ٹین نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”چاچا! ہماری نئی ریسپشنسٹ دیکھی ہے؟“ اس نے گھومنے والی گدے دار کرسی پر تقریباً لیٹتے ہوئے اور سگریٹ کا ایک پف چھت کی طرف پھونکتے ہوئے کہا، ”ہے ٹافسٹ کا اس! داد دے پھر ہمارے چوائس کی! واقفیت کرادوں تمہاری اس سے آج چلو میٹرو پول! یہ بھی آرہی ہے۔ ڈنر سوٹ ہے نا تمہارے پاس؟“

”میرے پاس کہاں ہے ڈنر سوٹ؟“

پھر تو مشکل ہے چاچا! تم نے ڈنر سوٹ بھی نہیں بنوایا۔ اچھا پھر اور سنا کیا بتا ہے۔ اور میاں پیسے کما۔ عیش کر دیکھ میں چند سال پہلے

کیا تھا۔ اب میری شان دیکھ۔ لارڈ بوگی بوگی کل مجھے ہنگری کے ”مغل“ موٹر سائیکلوں کی سول ایجنسی دے گیا ہے۔ میں ایک امریکن فرم کے اشتراک میں ملیر میں ایک بولٹ نٹ بنانے کی فیکٹری بھی بنوا رہا ہوں۔ یہ ہو گیا تو بس پھر تو میں واقعی بزنس میگنیٹ ہو جاؤں گا۔ محمد منیر تنویری بولٹ کنگ آف پاکستان۔ عیش کرا کے دکھاؤں گا تمہیں میاں بجز بٹو۔ لے چائے پی۔“

میز پر فون کی گھنٹی بجی اور محمد منیر تنویر اپنی گھومنے والی کرسی پر اس قدر صفائی اور مستعدی سے ریسیور اٹھانے کے لیے گھوما کہ میں ششدر رہ گیا۔

”جی ہاں ایک مہینے کے اندر اندر مال آ جائے گا۔ شپ ہو چکا ہے۔ ایک تہائی ٹیکنگلی ادا کرنا ہوگا۔“

”پھنس گیا۔“ محمد منیر تنویر نے ریسیور رکھتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ ”چاچا میری کتاب دیکھی ہے تم نے۔“ ”ترانہ تنویر“ اور اس نے گھنٹی بجائی اپنے دفتر کے ایک کلرک کو بلوایا۔ اس نے اسے حکم دیا کہ مجھے ”ترانہ تنویر“ کی ایک جلد پیش کرے۔

محمد منیر تنویر اسکول کے ایام میں غزلیں اور نظمیں کہا کرتا تھا اور کسی قدر ادیب مشہور تھا۔ ”ترانہ تنویر“ بھی انہی دنوں کی غزلیات کا مجموعہ تھا (ویسے اس میں سے بعض غزلیں قاضی شیر حسن اختر جلد ساز کی جودت طبع کا نتیجہ تھیں جو اسکول کے طالب علموں اور دوسرے لڑکوں سے مکمل غزل موزوں کر دینے کے چار آنے چارج کیا کرتے تھے)

کلرک نے کتاب کی ایک کاپی مجھے لا کر دی۔ محمد منیر تنویر نے ”ترانہ تنویر“ کو بے حد خوبصورت انداز میں طبع کرایا تھا۔ جلد نیلے مرا کو چمڑے کی تھی اور اس پر سنہری الفاظ میں کتاب اور مصنف کا نام کندہ تھا۔ اندر کا کاغذ چمکیلا بہترین آرٹ پیپر تھا اور کتاب اس اہتمام سے چھاپی گئی تھی جیسے تاج اور پیکو کے عکسی قرآن شریف قیمت پانچ روپے تھی۔

”دیکھو پھر چاچا“ کتاب چھپوائی ہے نا پھر پورے تین ہزار روپے اس پر لاگت آئی ہے میرے خیال میں سارے پاکستان میں میں واحد بزنس میگنیٹ ہوں جس کو شعر و ادب میں کافی دسترس ہے۔ میں نے ”ترانہ تنویر“ کی جلدیں گورنر جنرل اور سب منسٹرز کو بھجوائی ہیں۔“

اس نے کلرک کو گھنٹی بجا کر بلایا۔

”بھئی وہ ترانہ تنویر“ کی ایک جلد تم نے مولوی تمیز الدین خاں صاحب کو بھجوا دی ہے نا۔“

”ابھی نہیں جناب عالی“ کلرک نے جواب دیا۔

”یہ آج ہی بھجوا دیجئے“ محمد منیر تنویر اپنے اسٹاف سے خوش اخلاقی برتتا ہے اور ایک کاپی ڈپٹی کنٹرولر امپورٹ اکسپورٹ کو بھی بھجوانی

ہے۔“

”لا چاچا“ اس نے کہا۔ ”تیری جلد کو آٹو گراف کر دیں“ اور اس نے کتاب کے سرورق پر ”بختیار خلیجی کی نذر۔ احمد منیر تنویر“ لکھ دیا۔
 ”ارے بختیار خلیجی کی نذر۔ محمد تنویر“ لکھ دیا۔“

”ارے مولانا۔ میں نے عرصہ ہوا شعر و شاعری چھوڑ رکھی ہے ورنہ اگر لکھتا رہتا تو اس وقت تمہارے جوش۔ فراق وغیرہ جتنا مشہور ہوتا۔ اصل میں ادیب بننے کا بھی ایک وقتی شوق ہوتا ہے۔ اچھا چاچا! کل میں نے لارڈ بوگی بوگی کی آنر میں ڈنر دیا ہے تم بھی آؤ گے! ڈنر سوٹ ہے نا تمہارے پاس؟“

میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی دیر پہلے بھی میں اسے بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے۔

”ایک ڈنر سوٹ تو بنوا چھوڑ چاچا“ اس نے مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا ”تو بھی اسی طرح حاجی بغلول کا حاجی بغلول رہا.....“
 ”محمد منیر تنویر“ میں نے آخر کہا ”ہم اسکول میں اکٹھے تھے“

”ہاں چاچا تھے۔ بالکل تھے“

”ہم لنگوٹھے دوست تھے۔“ میں نے کہا۔

”چاچا۔ بات کر“

”کیا تم مجھے آج چار ہزار روپے فی الفور ادھار دے سکتے ہو۔ صرف ایک مہینے کے لیے“
 محمد منیر تنویر کی پراعتماد خوش مزاجی اس کے چہرے سے ایک چھلکے کی طرح اتر گئی۔ وہ غمگین ہو گیا۔

”ج“

”بالکل سچی بات ہے!“ اور میں نے مچھلیوں کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے بارے میں اپنی کوششوں کا اس سے ذکر کیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے اس سکیم کے بارے میں کیا رائے قائم کی مگر اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ”کل تم میرے پاس آتے تو میں تمہیں چھ ہزار روپے تک دے سکتا تھا۔ آج.....“

”یہ تمہیں کرنا پڑے گا۔ محمد منیر تنویر“ میں نے کہا ”ہم کلاس فیلو تھے۔ میں نے تمہارے میٹرک کے امتحان کی فیس داخلہ دی تھی۔“
 ”اچھا ٹھہریے“ وہ اب برقانی طور پر پر تکلف ہو گیا۔ جیسے ہم اجنبی ہوں اس نے گھنٹی بجائی۔ کلرک کے آنے پر تنویر نے اسے چار ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا کہ اسے فوراً کیش کرا لائے۔ اس نے ایک اسٹامپ لگے کاغذ پر مجھے سے چار ہزار روپے کی رسید لے لی۔

جب کلرک کیش لے آیا تو میں نوٹوں کو اندر کی جیب میں ٹھونس کر اٹھ کھڑا ہوا.... محمد منیر تنویر نے مجھ سے اٹھ کر مصافحہ کیا لیکن وہ پہلے کی سی گرجوٹی بالکل مفقود تھی مجھے یقین ہے کہ میرے جانے کے بعد ہی اس نے اسٹینو کو بلوا کر بوڑھے آدمی کے نام خط ڈکلیٹ کرایا ہوگا کہ میں بوڑھے آدمی کے حساب میں سے چار ہزار روپے اس سے لے گیا ہوں!

اگلے دن کوئی نو بجے مولوی عبدالحمنان کو ہمراہ لے کر ہم بولٹن مارکیٹ کے سامنے ٹریڈری میں ایک ہزار جمع کرانے کے لیے گئے۔ کھڑکی کے آگے روپے جمع کرانے والوں کا ایک بے حد لمبا کیوتھا۔ چچا اور میں اس میں کھڑے ہو گئے۔ کیو آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا اور جب ہم خدا خدا کر کے کھڑکی کے پاس پہنچے تو اس پر ”ٹریڈری کلوزڈ“ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ”ٹریڈری گیارہ بجے بند ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز ہم علی الصبح کوئی پانچ بجے ہی ٹریڈری کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ آٹھ بجے ہمیں پتا چلا کہ ہم کیو میں سب سے پہلے اور آخری تھے۔ آج ٹریڈری میں چھٹی تھی۔ تیسرے دن ہم روپیہ وصول کرنے والے کلرک کے پاس پہنچ گئے، لیکن اس نے روپیہ جمع کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے سب ٹریڈری کہاں ہے آخر ایک شخص نے بتایا کہ وہ میونسپل کارپوریشن کے بازو میں ہے۔ ہم فوراً بھاگ بھاگ سب ٹریڈری میں پہنچے۔ آدھ گھنٹے کے بعد فارموں والی کھڑکی کے پاس پہنچنے پر پتا چلا کہ چھپے ہوئے فارم ختم ہو چکے ہیں۔ ایک پان چباتے ہوئے کلرک نے سٹرک کے پار ایک ٹائپ کرنے والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”وہاں سے آپ کو ٹائپ شدہ فارم آٹھ آنہ فی فارم کے حساب سے دستیاب ہو جائیں گے۔“

ٹائپ والے کی دوکان کا نام ”وی ڈرائل سو جرنل ٹائپنگ اسکول تھا“ پروپرائٹر (جو ایک سفید پتلون پر پرانی خاکی پیٹی کافوجی کوٹ پہنے ہوئے تھا نہایت خوش اخلاق شخص ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا۔ ہمیں دو فارم دیئے اور کہا کہ ہم انہیں بھر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے ایک روپیہ فی فارم چارج کیا۔ فارموں کو بھر کر ہم پھر فارم لینے والے کلرک کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت چائے پی رہا تھا۔ چائے پی کر اس نے اطمینان سے بیڑی سلگائی۔ بیڑی ختم کرنے کے بعد اس نے ہم سے فارم لے لئے اور چالان بنا کر ہمارے حوالے کیا کہ اسے روپیہ جمع کراتے ہوئے ٹریڈری میں دے دیں۔ چالان لے کر ہم واپس ٹریڈری کو بھاگے۔ وہ بند ہو چکی تھی۔ اس سے اگلے روز صبح چار بجے ٹریڈری کے باہر جا کر کھڑے ہوئے۔ اس دفعہ ہم کیو میں سب سے پیش تھے آٹھ بجے کلرک کے آنے پر ہمارا روپیہ واقعی جمع ہو گیا اور ہم نے ٹریڈری رسید لے کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

ٹریڈری رسید ہم نے مولوی عبدالحمنان کو جا کر دی کہ اسے ہیڈ کلرک کو پہنچا دے۔ مولوی عبدالحمنان سے اب ہماری کافی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اس حد تک کہ ایک دو دفعہ اس نے مجھے اپنا قدیم پاپ بھی پینے کے لیے دیا۔ چچا عبدالباقی نے اس کو زیادہ دوست

بنانے کی خاطر گھر کے دو پرانے مرتبان جو ۱۹۱۰ء سے بھی بہت پہلے کے خرید شدہ تھے اس کو تحفہ نذر سکے (پرانے مرتبان جمع کرنا مولوی عبدالحنان کی ہابیوں میں سے ایک تھی)

مجھ پر عبدالحنان خاص طور پر مہربان ہو گیا۔ ہماری اس سے ملاقات کو چار روز ہی ہوئے تھے کہ اس نے مجھے اپنے دفتر میں ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ آیا میں اس کی طرف کی شادی کرنا چاہوں گا جس نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا اور ابھی ابھی شادی کے قابل ہوئی تھی۔ میں نے شائستہ انداز میں ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ میرے انکار سے اسے صدمہ پہنچا۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کی لڑکی کم از کم چالیس برس کی تھی اور قطعی طور پر مہری ہونے کی وجہ سے اب تک کنواری تھی۔ کوئی سات روز کے بعد مولوی عبدالحنان سے ملنے پر اس نے ہمیں یہ خوش خبری دی کہ ہمارا انڈر منظور ہو گیا ہے۔ چچا عبدالباقی نے عبدالباقی نے عبدالحنان کی پیٹھ ٹھونکی کہ سب اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ عبدالحنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے کمیشن کا مطالبہ کیا۔

ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔ اسے ساتھ لے کر ہم فوراً ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں پہنچے۔ ہیڈ کلرک نے ہم سے شرائط کے فارموں پر دستخط کرائے اور ہمیں ہدایت کی کہ ہم سر دست دو ہزار روپے کی رقم ٹریژری میں ڈائریکٹر فشریز کے نام کریڈٹ کرا دیں۔ اس نے ہمیں یہ بھی اطلاع دی کہ ہمارا پہلا فننگ ٹرالر جمع یا سنچر کی شام کو کیا ڈی گودی میں لگ جائے گا اور یہ کہ ہم ڈائریکٹر کاسرٹیفکیٹ ٹرالر کے فورمین کو دکھا کر مال کی ڈیوری لیجے کے لیے تیار رہیں ورنہ نقصان کی صورت میں فشریز ڈیپارٹمنٹ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

”میری رائے میں عبدالباقی خان“ مولوی عبدالحنان چچا کو ہمیشہ عبدالباقی خاں کہہ کر پکارتا تھا ”آپ ٹرالر کو ان لوڈ کرانے کے لیے ڈاکس پر ہی مال کو نیلام کرا دیں۔ اس سے آپ ان کو مارکیٹ میں فروخت کرنے کی بک بک سے بچ جائیں گے۔“ ہمیں یہ مشورہ بڑا اچھا لگا۔ اسی روز کراچی کے ”توپ و تفنگ“ میں ایک اٹھارہ روپے دیا گیا کہ مچھلیوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جمعہ یا سنچر کو بولی دینے کے لیے کیا ڈی ڈاکس پر جہاں چارٹن مچھلی کا نیلام ہوگا تشریف لے آئیں۔

”جمعہ کی شام کو“ چچا عبدالباقی نے کہا ”پانچ ہزار روپیہ ہماری جیب میں ہوگا۔ سچتے بختیار! میں ابھی سے اپنی جیب میں اسے چھتکتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔“

جمعہ کے روز ہم دو پہر کے بجے ہی کیا ڈی ڈاکس پر جا پہنچے۔ ہمارا فننگ ٹرالر ابھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ مولوی عبدالحنان نے جو

ہمارے ہمراہ تھا، کہیں سے پتا کر کے ہمیں بتایا کہ ٹرلر غالباً شام کے پانچ بجے چھ نمبر گودی میں برتھ ہوگا ہم نے ایک دو گھنٹے حاجیوں کے ایک جہاز کو دیکھنے میں صرف کئے۔ چار بجے کے قریب تین چار کاروباری قسم کے لوگ نمبر ۶ گودی پر منڈلاتے ہوئے ہمیں نظر پڑے۔ مولوی عبدالحنان انہیں پہچانتا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ بولی دینے والی پارٹیاں ہیں۔ بقول اس کے ان میں سے ایک کراچی فشنگ مارکیٹ کی سب سے زبردست پارٹی تھی۔ کم از کم پانچ چھ لاکھ کی مالیت کی۔

چچا عبدالباقی اپنے بہترین پروقار انداز میں مسکراتا ہوا ان کی طرف گیا۔

”آپ صاحبان تھوڑی دیر انتظار کیجئے“ اس نے کہا ”فشنگ ٹرلر ایک آدھ گھنٹے تک گودی میں لگ جائے گا۔ اسی وقت ہم نیلام کا آغاز کر دیں گے۔“

”کیج کتنا ہے اندازاً“ ایک لال ڈاڑھی والے شخص نے پوچھا۔

”چارٹن کے ایرب“ ایک میلے کوٹ اور گول ٹوپی والے میسی نے کہا۔ ”ہم کو اور بھی کام ہے نا“ سالا۔ ادھر مچھلی کا دھندنا ہی تو نہیں ہے۔“

مولوی عبدالحنان نے چچا عبدالباقی اور مجھ کو ایک طرف لا کر سمجھایا کہ پارٹیاں بہت بڑی بڑی ہیں اور ان کو اس طرح جانے دینا غلطی ہوگی۔ اس نے کہا کہ نیلام کے لیے ضروری نہیں کہ ٹرلر کے آنے پر ہی کی جائے۔ اس کا آغاز ابھی سے کیا جاسکتا ہے۔ چچا کی خواہش تھی کہ میں نیلام کروں، لیکن میں نے اس کام میں بالکل تجربہ نہ ہونے کی بنا پر صاف انکار کر دیا۔ آخر چارونا چار چچا نے اپنے آپ کو گودی پر پڑے ہوئے ایک لکڑی کے کریٹ پر کھڑا کر لیا۔ چار پانچ بولی دینے والے حضرات ڈاکس کے کچھ مزدور اور ساتھ آتھ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

”خاموش صاحبان“ چچا عبدالباقی نے ایک بہترین پیشہ ور نیلام کرنے والے کے لہجے میں کہا۔ ”گورنمنٹ فشریز کی چارٹن مچھلی جو ٹرلر ابھی لا رہا ہے نیلام کی جاتی ہے۔ بولے صاحبان۔ چارٹن فسٹ کلاس کو الٹی اور ہر قسم کی تازہ مچھلی کے لیے۔ پالمیٹ، جھنگا اور رنگارنگ کی مچھلی کے لیے بولے صاحبان۔“

”پانچ روپے“ کالے کوٹ اور گول ٹوپی والے میمن نے بولی دی۔ دو تین آدمی ہنسے۔ ”پانچ روپے بارہ آنے“ ایک زبڑ ڈاڑھی والے شخص نے جس کا چہرہ مجھے بے حد آشنا لگا، آواز دی۔

”چھ روپے“ کالے کوٹ والے نے کہا۔

”آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں“ چچا عبدالباقی نے انہیں سرزنش کی ”اگر آپ اسی طرح بولی دیں گے تو ہمیں مجبوراً نیلام کو بند کرنا پڑے گا۔“

”دوسوروپے مولوی عبدالحنان نے جو بولی دینے والوں میں جاشامل ہوا تھا آواز دی۔
 ”دوسوروپے صاحب! دوسوروپے۔ آئیے۔ کم از کم پانچ ہزار کے مال کا دوسوروپے“ چچا نے مجمع کی حوصلہ افزائی کی۔
 ”دوسوروپے بارہ آنے“ کا لے کوٹ والا بولا۔
 ”دوسوا ایک“ سبز ڈاڑھی بلی۔

”چار سوروپے“ مولوی عبدالحنان نے پھر بولی کو اوپر چڑھایا۔ ہمارے چہروں پر پھر سے رنگ آ گیا۔
 ”چار سوروپے آئیے چار سوروپے صاحبان چارٹن فسٹ کوالٹی فسٹ کوالٹی۔ تازہ بہترین فش کے لیے۔ یہ سمندر کی مچھلی ہے۔
 دریائی، لیاری میں پکڑی ہوئی مچھلی نہیں“ چچا عبدالباقی کا لہجہ اب پر امیدوار پر اعتماد تھا۔
 ”یہ اسوا ایک“ پھر کا لے کوٹ والے نے کہا۔

”چار سو بیس“ سبز ڈاڑھی نے اچھلتے ہوئے چچا عبدالباقی کی سمت بازو سے اشارہ کیا۔
 ”چار سو بیس روپے صاحبان۔ چار سو بیس۔ بحیرہ عرب کی خوبصورت ستھری چارٹن مچھلی کے لیے صرف چار سوروپے۔ آئیے
 صاحبان۔ وہیل مچھلی جتنی بڑی بڑی مچھلی۔“ چچا سراپا نیلام کرنے والا تھا۔
 ”ایک ہزار روپے“ مولوی عبدالحنان بولا۔

یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بولی گیا ہ سوروپے تک آ کر رک گئی اور چچا عبدالباقی کی سار منتوں کے باوجود کوئی بھی
 عبدالحنان کی آخری بولی کو بڑھانے پر تیار نہ ہوا۔ ہماری چڑھتی ہوئی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں یعنی چچا عبدالباقی کو پورا یقین تھا
 کہ بولی چار ہزار روپے سے اوپر جائے گی۔

”آپ حضرات تشریف لے جائیے“ چچا نے خشمگیں ہو کر کہا۔ ”آپ نے ہمارا وقت ضائع کیا ہے“
 کاروباری آدمی آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر سبز ڈاڑھی والا آدمی چچا کے پاس آیا ”دیکھو بارہ سوروپے میں بات پکی کرو۔
 مارکیٹ میں تم کو اس سی آدمی رقم بھی نہیں ملے گی۔ مچھلی بہت آنے کی وجہ سے نرخ بڑے گرے ہوئے ہیں یہ میرا آخری بڑے ہے“
 ”جنہم میں جاؤ“ چچا عبدالباقی نے اس سے کہا۔ وہ چڑھ گیا تھا۔

”حاجی صاحب۔ گرم مت ہو“ سبز رڈ اڑھی نے تہل سے کہا ”میں نے تمہارے فائدے کی بات کی ہے“ میں سوچنے لگا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟

”جائیے صاحب“ چچا نے کہا ”میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مچھلی فروخت نہیں کرنا چاہتا میں ایک مچھلی بھی فروخت نہیں کروں گا۔“
مجمع سے دور ہٹ کر ایک بھوری موٹھوں والا چھوٹا سا آدمی مولوی عبدالحنان سے کہہ رہا تھا۔ اس فشنگ ٹرالر کا ڈوب جانا۔ بڑی ٹریجڈی ہے۔ ہاربر ماسٹر کہتا ہے کہ اس کے پینڈے میں سوراخ تھا۔“

میں بدحواس ہو کر ”چچا عبدالباقی کی طرف بھاگا اور اسے ٹرالر کے ڈوبنے کی خبر سے مطلع کیا۔ اس نے بڑی دلیری سے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں مولوی عبدالحنان اپنی پیس فور میں ایک ماتمی چال چلتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ ٹرالر کے ڈوب جانے سے اسے بے حد افسوس ہے۔

”یہ کوئی اور ٹرالر ہوگا بھتیجے!“ چچا نے مردانگی سے کہا ”یہ ٹرالر ہمارا نہیں ہو سکتا۔“ مولوی عبدالحنان کو یقین تھا کہ یہ وہی ٹرالر تھا۔
چچا عبدالباقی نے کسٹم ہاؤس کے دفتر سے باربر ماسٹر کو رینگ کر کے دریافت کیا کہ آیا کسی فشنگ ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع آئی ہے۔ باربر ماسٹر نے جواب دیا کہ اسے کوئی علم نہیں لیکن اگر یہ فشریز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالروں میں ایک ہے تو اسے اس کے ڈوبنے بے حد خوشی ہوگی۔ کیونکہ ان ٹرالروں نے ہاربر کو خواہ مخواہ ہلاک کر رکھا ہے۔

ہم نے آٹھ بجے رات تک ٹرالر کا انتظار کیا۔ جب یہ نہ آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ضرور ڈوب گیا ہوگا۔
”اس کا مطلب یہ ہے“ میں نے کہا ”اب ہمیں اگلے ہفتے تک دوسرے ٹرالر کیج کا انتظار کرنا پڑے گا۔“
عبدالحنان نے ہمیں بتایا۔ ”گورنمنٹ اس ٹرالر کی مچھلی آپ کو شرائط کے مطابق فروخت کر دی ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ ٹرالر ڈوب گیا ہے تو نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگلے کیج کے لیے آپ کو مزید رقم جمع کرانا ہوگی۔“
جب ہم ڈاکس سے واپس ہوئے تو چچا اور میں دنیا کے دو غمگین ترین آدمی تھے۔

رات کو ۹ بجے مولوی عبدالحنان میرے فلیٹ پر مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کے ہمراہ ایک چوڑے منہ اور چھٹی ناک والی ایک چالیس سالہ عورت تھی۔ اس نے اونچی ایزویوں والی گرگابیاں اور فراک پہن رکھا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ جراب کے بغیر تھی۔
میرے دروازہ کھولنے پر عبدالحنان نے کہا ”میں اپنی بیٹی سے تمہارا تعارف کرانے آیا ہوں۔ تم اسے نہایت کم سخن اور مخلص پاؤ گے۔“

میں نے محض اخلاقاً اس خاتون کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے کوری احقانہ نظروں سے دیکھا۔

”اس سے کچھ کہنا فضول ہے“ عبدالحنان بولا ”وہ بالکل بہری ہے۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے“ میں نے ہمدردی جتائی

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا“ عبدالحنان نے مجھے ایک طرف لے جکا کر سرگوشی میں کہا۔

”مولوی عبدالحنان! تمہارا اس سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں“ عبدالحنان نے پہلو بدل کر کہا۔ ”اچھا مسٹر بختیار مجھے کل شام کے لیے ڈنر سوٹ درکار ہے۔ محمد احسن

صاحب اشرفی نے مجھے اور چند اور دوستوں کو کل رات ڈنر پر بیچ لکڑری میں مدعو کیا ہے۔ معدودہ انہوں نے دراصل میری بیٹی شریفین کو کیا ہے، لیکن چونکہ اس کو ایسکو رٹ کرنے کے لیے ضرور کوئی ہمراہ ہونا چاہیئے۔ اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔ چاہو تو تم بھی اس کے ساتھ جا سکتے ہو۔“

”میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے“ میں نے کہا۔

”عبدالباقی خاں کے پاس ہے“ اس نے پوچھا ”پچھلے سال اس کے پاس غالباً ڈنر سوٹ تھا۔ وہ آج کل اس کے ڈارنگ روم

میں ٹیبل کلاتھ کا کام دے رہا ہے“

”تمہارے کسی اور دوست کے پاس ہے۔ مسٹر بختیار۔ مجھے ڈنر سوٹ کہیں نہ کہیں سے ضرور لے دو۔“

میں نے اسے جلد ٹالنے کے لیے محمد منیر تنویر کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنا ڈنر سوٹ ایک رات کے لیے

مولوی عبدالحنان کو دے دے۔ ”مولوی عبدالحنان“ میں نے لکھا۔ بڑے شریف اور مرتجان مرنج بزرگ ہیں اور ان کی لڑکی شریفین کا

ایک عیب ان کا بہرہ پن ہے۔ ورنہ بڑی پرکشش اور سلیقہ شعار خاتون ہیں۔“

عبدالحنان اور اس کی بیٹی تھوڑی دیر اور ٹھہرے عبدالحنان ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پانچ

روپے مانگے جو میں نے اسے دے دیئے۔

اگلے دن ہم فشریز کے دفتر میں گئے۔ وہاں ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ ہیڈ کلرک نے کہا کہ ڈیپارٹمنٹ کے پاس

لے دے کے یہی ایک کام کا ٹرالر تھا۔ باقی پانچ ٹرالر پیندوں میں سوراخوں کی وجہ سے ایک مدت سے بے کار پڑے تھے۔ فشریز

ڈیپارٹمنٹ نے انگلستان سے چار ہزار روپے ماہیوار پر ایک ٹیکنیکل ایکسپرٹ کی خدمات حاصل کی تھیں جو ڈیپارٹمنٹ نے انگلستان

سے چار ہزار روپے ماہوار پر ایک ٹیکنیکل ایکسپرٹ کی خدمات حاصل کی تھیں جو ڈی پارٹنٹ کو سوارخوں کے بند کرنے کے متعلق مشورہ دے گا۔

ہیڈ کلرک سے ملنے کے بعد مولوی عبدالحنان اور ہم مزید تفتیش کی خاطر سیاری ڈاکس پر جانکے نمبر ۶ گودی پر ایک زنگ آلود ٹیڑھی قتل والی چیز کھڑی دھواں چھوڑ رہی تھی۔ اس سے مچھلی کی تیز بو آ رہی تھی۔ یہ ہمارا ٹراٹر تھا اس کے ڈوبنے کی خبر کسی نے یونہی اڑا دی تھی۔

ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مچھلی کو نیلام کرنے کی بجائے ہم اسے خود مارکیٹ کر کے فروخت کریں گے۔ تین ہزار روپیہ تو ہم کو ٹھیکے کی شرائط کے مطابق حکومت کو ادا کرنا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ جب تک ہم اس کو کم از کم چار ہزار میں فروخت نہ کریں گے۔ یہ ہمارے لئے گھائے کا سودا تھا۔ نیلام میں بولی بارہ سو سے اوپر نہ گئی تھی۔ اس قیمت کو قبول کر لینے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

ہم نے ٹرالر کے فورمین کو مل کر محکمہ فشریز کا خط دکھایا اور اس نے کہا کہ ہم مچھلی کی ڈلیوری لے سکتے ہیں۔ ہم نے فوراً مچھلیوں کو گودی پر ان لوڈ کرنا شروع کر دیا۔ چچا عبدالباقی نے مجھے شہر میں ایک سو خالی بوریاں لانے کے لیے تنہا۔ جب میں بڑی مشکل سے خالی بوریاں لے کر آیا تو مچھلیوں کو ان میں بھرنے کا کام شروع ہوا جو کہیں شام کے پانچ بجے جا کر ختم ہوا۔

مچھلیوں کو چھ اونٹ گاڑیوں میں لدوا کر ہم روانہ ہوئے۔ کل والے بولی دینے والوں میں سے ایک دو آج بھی موجود تھے۔ ان میں سبز ڈاڑھی والا شخص بھی تھا۔ اب وہ چچا عبدالباقی کے پاس آیا۔

”بارہ سو روپے میں دے دو۔ باقی خرچہ میں ادا کروں گا۔ تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں“ اس نے پھر پیش کش کی۔

”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں“ چچا عبدالباقی نے شرکرا سے بتلایا ”کہ میں یہ مچھلی تمہیں فروخت نہیں کروں گا“

”فروخت آپ کیے نہیں کریں گے۔ آخر اتنی چارٹن مچھلی آپ کیا کریں گے“

”یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم اس سے جو بھی کریں۔ تم کو کیا؟ بتاؤں تمہیں ہم کیا کریں گے۔ ہم ان کو غربا میں تقسیم کریں گے۔ ہم

ان کو کھالیں گے۔ ہم ان کو واپس سمندر میں پھینک دیں گے، لیکن تمہیں ہرگز نہ چھینیں گے“ چچا عبدالباقی غصے میں تھا۔

”آپ کو اسے سمندر ہی میں غلابا واپس پھینکنا پڑے گا۔ مارکیٹ میں اسے کوئی دیکھے گا بھی نہیں“

”جہنم میں جاؤ“ چچا گرجا۔

”میں تمہارے فائدے کی بات کر رہا ہوں“ سبز ڈاڑھی نے کہا ”تم چھتاؤ گے“

”میرا پیچھا چھوڑو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ مچھلی فروخت نہ ہوگی۔ کیا میں پولیس کو بلاؤں۔ بختیار پولیس کو بلاؤ۔“

”جہنم میں جاؤ“ سبز ڈاڑھی نے بھی جاتے ہوئے وار کیا۔

”میں تمہیں پہلے وہاں پہنچا کر رہوں گا“ چچا نے اسے اطمینان دلایا۔

چنا کر ایک واکسٹم لکی چوکی پر کسٹم والوں نے ہمارا بڑا وقت ضائع کیا۔ ایک ریلوے گاڑی کی سی ٹوپی والے شخص نے ہم سے دو درجن بوریاں کھلو کر اندر سے جھانکا۔ غالباً اس کے نزدیک اس امر کا قوی امکان تھا کہ ہم مچھلیوں میں سونا چھپا کر لے جا رہے ہیں۔ پورے تین گھنٹے ان لوگوں نے ہمیں خراب کیا اور آخر میں انہوں نے ایک درجن بوریاں اٹھو کر اپنے یہاں رکھ لیں جن کی وہ فرصت کے وقت اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس میں مجھے سبز ڈاڑھی والے کا ہاتھ معلوم ہوا۔ اس نے شاید کسٹم والوں کو ہمارے خلاف کر دیا تھا میں نے اسے اس عرصے میں کئی دفعہ کسٹم کے انیک انسپکٹر کے ساتھ ہم نوالہ وہم پیالیہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ابیں ضرور بتایا ہوگا کہ ہم سمگلر ہیں اور فی الواقع چچا عبدالباقی گودی پر کام کروانے کے بعد اپنی چڑھی ہوئی آستنیوں کے ساتھ کویت یا بہرین کی طرف کا کوئی مشکوک قزاق یا سمگلر ہونے کا اثر دیتا تھا۔

کسٹم سے گزرنے کے بعد میں نے سبز ڈاڑھی والے کو نگاہ میں رکھا۔ وہ اب بھی ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یک لخت اس نے ایک حرکت کی جو مجھے بری عجیب لگی۔ اس کی ڈاڑھی ایک طرف سے اتر گئی تھی اور وہ اسے بات سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس کو چپکانے کے لیے صحیح قسم کی گوند استعمال نہیں کی تھی۔ فوراً مجھے پتا لگ گیا کہ اس کا چہرہ کیوں اتنا زیادہ آشنا تھا۔ یہ شخص محمد احسن اشرفی تھا۔ مصنوعی ڈاڑھی کے ساتھ۔

میں نے چچا عبدالباقی کو جا کر بتایا کہ میری رائے میں سبز ڈاڑھی والا شخص محمد احسن اشرفی تھا۔

”بختیار۔ تم میں چہروں کے یاد رکھنے کا ملکہ مطلق نہیں ہے“ اس نے کہا ”محمد احسن اشرفی کی ڈاڑھی نہیں تھی“

جب میں نے اسے ڈاڑھی کو جمانے کا واقعہ سنایا تو اس نے اس پر غور کیا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ اسے میں نے کہیں دیکھا ہے اس کے نقوش محمد احسن اشرفی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اچھا ذرا

ٹھہرو۔“

چچا عبدالباقی سبز ڈاڑھی والے شخص کی طرف گیا۔

”ہاں تو بارہ سو آپ نے کہے تھے؟“ اس نے کہا۔

”اور ان لوڈنگ وغیرہ کا خرچہ بھی دوں گا۔“ سبز ڈاڑھی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”بارہ سو روپے“ چچا عبدالباقی نے سوچا۔ ”ذرا قبلہ معاف کیجئے۔ آپ کی ڈاڑھی میں دو تنکے الجھے ہوئے ہیں۔“ ایک پھر تیلی حرکت سے چچا نے سبز ڈاڑھی کو ہاتھ سے جھٹک کر دیا۔ ڈاڑھی بالکل صاف ایک گال اور ٹھوڑی سے اتر آئی اور محمد احسن اشرفی کے آشنا تقوش نمایاں ہو گئے اشرفی نے ڈاڑھی کو پھر جلدی سے جمانے کی کوشش کی۔

”تم محمد احسن اشرفی ہو“ چچا عبدالباقی نے فاتحانہ لہکار سے اسے چیلنج کیا۔

”تم نے میری ڈاڑھی پر کیوں ہاتھ ڈالا“ اشرفی بولا ”برسر بازار تم نے میر ہٹک کی ہے۔ بہت سے لوگ دیکھ رہے تھے۔“

”تمہاری ڈاڑھی جعلی ہے اتو تم یقیناً اشرفی ہو۔“

”ڈاڑھی میری اپنی ہے۔ کھال میں چند حیاتیات کی کمی کی وجہ سے یہ کبھی کبھی جھڑنے لگی ہے۔“ اشرفی نے کہا ”تمہیں اسے جعلی کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا“

”کیا تم محمد احسن جائے جہنم میں۔ میرا نام حاجی چراغ دین ہے“

”اب رہنے بھی دو۔ مسٹر اشرفی“ چچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے تمہیں پہچان لیا۔ ویسے یہ بتاؤ کہ اس طرح کرنے سے

تمہارا آئیڈیا کیا ہے؟“

”محمد احسن کی ایسی تیمی۔ حاجی چراغ دین، صدر انجمن مچھلی فروشاں کراچی ہوں۔“

اشرفی نے اصرار کیا ”بولو تم بارہ سو روپے میں مچھلی فروش کرتے ہو یا نہیں“

”تم ایک کینے رذیل شخص ہو“ چچا نے کہا۔

فشریز کا ہیڈ کلرک ہمیں آگے پل پر رکشہ میں آتا ہوا ملا۔ اس نے دیر سے پہنچنے کی معذرت کی اور چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”تین من مچھلی ابی سینیا لائنز میں کوارٹر اٹھارہ میں پہنچا دیں۔ میری لڑکی کی کل شادی ہے۔ عبدالحنان آپ کو جگہ دکھا دیگا۔“

ہیڈ کلرک رکشا میں واپس چلا گیا۔

فنش مارکیٹ میں مایوسی ہماری منتظر تھی۔ جیسا کہ کہ محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین نے پیش گوئی کی تھی۔ وہاں کوئی بھی ہماری مچھلی کو خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ بیشتر مارکیٹ والوں کا سلوک ہمارے ساتھ تسخرانہ اور ترحم آمیز تھا اور انہوں نے فوراً بھانپ لیا

تھا کہ ہم مچھلی کے بیوپار کی ابجد سے بھی نا بلد ہیں۔ وہ لوگ دو یا تین بار کھلم کھلا بنے اور عبدالباقی اور میرے بارے میں ایسی باتیں کہنے لگے جو لکھی نہیں جاسکتیں۔ آخر ایک بوڑھے دوکاندار نے ہمیں سمجھایا۔ ”میاں یہاں کا سارا مچھلی کا بزنس بڑے بڑے ٹھیکے داروں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے آپس میں ایک کر رکھا ہے اگر تم اس مچھلی کا بزنس بڑے بڑے ٹھیکے داروں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے آپس میں ایک کر رکھا ہے اگر تم اس مچھلی کو یہاں مفت بھی دو تو کوئی نہیں لے گا۔“

محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین چچا کے پاس آیا ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مچھلی ایسے نہیں بک سکتی۔ بارہ سو روپے میں اب بھی سارا لاٹ لینے کے لیے تیار ہوں خرچہ“

”اشرفی تم ایک دھوکہ باز ہو“ چچا عبدالباقی نہیں ہوگا اگر میں نے تمہیں ایک بھی مچھلی فروخت کی۔“

”اشرفی اشرفی! کیا کہتے ہو۔ میں حاجی چراغ دین ہوں“

آٹھ بجے جب ہم مچھلی کو مارکیٹ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو عبدالباقی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فی الحال چچا کے مکان واقع جیل روڈ کے احاطہ میں سٹیک کر دیا جائے۔ چچا کو اس امر کا یقین تھا کہ ایک دو روز میں مچھلی کے تھوک فروش اسے چار ہزار تک دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

ہم نے ابھی ساری امید نہیں کھوئی تھی مگر حالات ناموافقیت اختیار کر رہے تھے۔ پچھلے تریسوں کیپنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ چچا کی ایک اور سکیم سرمایہ لگانے والے حصہ دار بختیار ظلمی کو چار ہزار کے زیاں میں مبتلا کر کے اپنے ناگزیر اور حسرت ناک خاتمہ پر پہنچ چکی ہے۔

ہم نے مچھلی کے بوروں کو چچا کے مکان کے پچھلے احاطے میں ڈھیر کر دیا۔ یہ احاطہ پہلے بھی کئی بار مختلف اور عجیب و غریب اشیاء کے اسٹور کا کام دے چکا تھا۔ پاس کے کئی ہمسائے دیوار پر سے ہمیں بوروں کو ڈھیر لگاتے دیکھنے لگے اور جو اجرت ہمیں اونٹ گاڑی والوں کو دینا پڑی اس ڈر سے یہاں نہیں دی جاتی کہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔

دو تین دن مارکیٹ میں سرتوڑ کوششوں کے باوجود ہمیں مچھلیوں کا کوئی خریدار نہ ملا۔ چچا عبدالباقی نے آخر تجویز پیش کی کہ ہم مچھلیوں کو تھوک فروخت کرنے کی بجائے پرچون میں بیچیں ایک بورڈ ”باقی فش سپلائی کمپنی“ چچا عبدالباقی کے مکان کے پھاٹک پر لگا دیا گیا۔ اس کے نیچے ہی گاہکوں کے لیے مختلف قسم کی مچھلیوں کی فہرست ان کی قیمتوں کے ساتھ چسپاں کر دی گئی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے پورا ایک دن مختلف مچھلیوں کی قیمت مقرر کرنے پر صرف کیا۔ پہلے دن کوئی بھی گاہک مچھلی خرید کرنے نہ آیا۔ چچا عبدالباقی

لوگوں کی مچھلیوں سے اس قدر بے اعتنائی سے متحیر اور خفا تھا۔

مولوی عبدالحنان شام کو البتہ اپنی بوسیدہ پلس فورس میں آیا۔ ہم نے اس دن سے جب سے ہم ٹرالر سے مچھلیاں لائے تھے اس ی شکل نہیں دیکھی تھی اور چا عبدالباقی کو یقین تھا کہ وہ بھی محمد احسن اشرفی اور دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہے آتے ہی اس نے مجھے اپنا پاپ پینے کے لے پیش کیا۔ جس میں نے خود داری کے جذبہ کے تحت قبول نہ کیا۔ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ پھر اس نے ہمیں اطلاع دی کہ میٹھادر کے راحت جان ہوٹل کے مہجر حاجی حسین بخش نے اس کا داماد بننا منظور کر لیا ہے۔ شرائط پر دستخط وغیرہ ہو چکے ہیں اور ڈھائی سو روپے پر فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے ایک نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

عبدالحنان نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ برائے نام کمیشن پر باقی فش کمپنی کے سیزمین کی حیثیت سے کام کرے گا اور ایک دو روز تک اپنے ہونے والے داماد حاجی حسنین بخش سے کم از کم پندرہ سیر مچھلی کا آرڈر لے آگئے گا۔ ہم نے شکر رنجی کی بنا پر اور اس کے دو غلے پن کو جانتے ہوئے اس سے زیادہ کھل کر باتیں نہ کیں۔ جاتے ہوئے مولوی عبدالحنان اپنی واسکٹ اور پلس فور کی جیبوں میں پانچ چھ مختلف قسم کی مچھلیاں ڈال کر لے گیا۔ انہیں وہ باقی فش سپلائی کمپنی کی مچھلیوں کے نمونوں کے طور پر اپنے داماد کو دکھانے کا آ زور مند تھا۔

”یہ مولوی عبدالحنان کام کا آدمی ہے“ چچا عبدالباقی نے کہا ”ممکن ہے یہ محمد احسن اشرفی وغیرہ سے نہ ملا ہوا ہو۔ اب ہوٹلوں کے آرڈر شروع ہو جائیں گے۔ ہم بازار سے کہیں کم قیمت پر سپلائی کر رہے ہیں۔ تم ایک کام کرو۔ کل اپنی جیب میں ایک نوٹ بک لے کر کراچی کے بڑے بڑے ہوٹلوں مثلاً میٹروپول، پیلس وغیرہ کے مینجروں سے ملاقات کرو اور ان سے مچھلی کے آرڈر بک کر لو۔ اس سے تمہیں سلیز مین کے کام کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔

چار دن کے بعد مچھلی سڑنے اور بو چھوڑنے لگی۔ یہ اس قدر تیز اور بے پناہ تھی کہ آدمی اسے دو فرلانگ دور سے سونگھ سکتا تھا۔ مسٹر عبدالباقی نے چچا کو الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ مچھلی فوراً یہاں سے اٹھوانہ دی گئی تو وہ اپنے میکے چلی جائے گی۔ چچا عبدالباقی نے مجھ سے عورتوں کی خود غرضی اور تنگدلی کی شکایت کی۔

اسی دن ساتھ کی کوٹھیبوں اور مکانوں کے ہمسائے ایک وفد کی صورت میں چچا کے پاس آئے۔ انہوں نے شکایت کی کہ مچھلی کی سڑاندگی وجہ سے ان کی زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے اور اسے فوراً یہاں سے اٹھوایا جائے۔

چچا نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔

”یہ میرا مکان ہے۔ یہاں میں چاہوں تو گھوڑے باندھ سکتا ہوں۔ بکرے ذبح کر سکتا ہوں۔ آلو کاشت کر سکتا ہوں۔ بحیثیت مالک مکان یہ حقوق مجھے حکومت کی طرف سے حاصل ہیں۔ آپ لوگوں کو مچھلی کی بوٹا پسند ہے تو آپ کہیں اور جا کر رہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ بوٹا بہت خوش گوار لگتی ہے۔“

وفا سخت غصے میں رخصت ہوا۔ اس کے ممبروں نے چچا کو دھمکی دی کہ وہ ہیلتھ افسر کو رپورٹ کریں گے۔

مولوی عبدالحنان اس عرصے میں تین چار دفعہ آیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ آرڈر بک کرنے کے لیے پوری جان مار رہا ہے۔ آخر دفعہ وہ چار بورے وہاں سے اٹھوا کر اپنے داماد کی مالی حالت آجکل اتنی اچھی نہیں“ اس نے کہا ”اے مہینے کے آخر میں بل بھجوادو۔ اس وقت وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہوگا۔“

”میرے داماد کی مالی حالت آج کل اتنی اچھی نہیں“ اس نے کہا۔ ”اے مہینے کے آخر میں بل بھجوادو۔ اس وقت وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہوگا۔“

دوسری دفعہ ایک اور پیشکش لایا۔ جس سے اس پوری سازش کا حال جو ہمیں تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی ہم پر کھل گیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ہماری بربادی ایک منظم منصوبہ بازی کے تحت پلین کی گئی ہے اور یہ کہ غنڈوں کا ایک پورا اسٹڈیکیٹ ہمارے خلاف کام کرتا رہا ہے۔

مولوی عبدالحنان کراچی کے ایک فش کنگ کی پیش کش لایا۔

”عبدالباقی خاں۔ وہ سارے لاٹ کے لیے چار سو روپے دینے کو تیار ہے۔ میرے خیال میں اب تم اسے بیچ دو۔ مال سٹر رہا ہے۔“

”چار سو“ چچا نے کہا۔ اس فش کنگ کا نام کیا ہے؟

”حاجی چراغ دین جس نے اس دن ڈاک پر بولی بھی دی تھی۔“

”تمہارا مطلب محمد احسن اشرفی سے ہے؟“

مولوی عبدالحنان کا منہ کھلا رہ گیا۔

”نکل جاؤ“ چچا عبدالباقی گرجا۔ ”تم سب لوگ ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہو۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ براہ

مہربانی میرے وہ مرتبان جو میں نے تمہیں دیئے تھے واپس کر دو۔“

عبدالحنان کو ان الفاظ نے صدمہ پہنچایا۔

”عبدالباقی خاں! میں نے آپ کی خاطر اتنی دوڑ دھوپ کی دن رات ایک کیا۔ ایک ہفتے سے میں فشنگ کے لیے نہیں جا سکا۔

اس سے میری صحت پر اثر پڑا ہے۔“

”مولوی عبدالحنان“ چچا عبدالباقی نے پوچھا ”اب سچ بٹاؤ۔ تم لوگوں نے کتنے ٹنڈر دینے والوں کو اس طرح خراب کیا ہے۔“

”عبدالباقی خاں۔ مجھے فی الواقع تمہاری اس بدظنی سے دلی صدمہ پہنچا ہے۔“

”اچھا۔ اب دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھتا چاہتا۔“

دو ہو جانے سے پہلے عبدالحنان نے مجھے ایک طرف لے جا کر یقین دلایا کہ اگر میں نے اس کی بیٹی شریفین کے متعلق اپنی رائے

تبدیل کر دی ہو تو وہ مجھے اپنی دامادی میں لینے کے لیے تیار ہے کیونکہ شریفین کو راحت جان ہوٹل کا مینجر پسند نہیں آیا ”چار جز“ انے کہا

”صرف ڈیرھ سو روپے ہوں گے“

عبدالحنان کے چلے جانے کے بعد چچا عبدالباقی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا جیتے بختیار ان سب لوگوں نے مچھلیوں

کے ٹھیکے داروں کو تباہ کرنے کی منظم سازش کی ہے۔ میں اب اس سنڈیکیٹ کے طریقہ کار کو سمجھ گیا ہوں۔ پہلے نئے شکاروں سے ٹنڈر

دلاوایا جاتا ہے اور ان کو خوب لوٹا جاتا ہے۔ پھر ٹنڈر کو ایک مجوزہ پلین کے مطابق قبول کر لیا جاتا ہے۔ ٹرار کے کچھ کی نیلام پر ایک ہزار

سے زیادہ بولی نہیں دی جاتی اور بے چارہ ٹھیکیدار یہ جانتے ہوئے کہ وہ مارکیٹ میں مال کو کھپا نہیں سکتا، آخر مال کو اس قیمت پر ہی

فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس طرح ٹھیکیدار بے چارے کا بالکل پلستر ہو جاتا ہے اور یہ لوگ سارا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ محمد احسن اشرفی، مولوی عبدالحنان

اور فریزر کا ہیڈ کلرک سب اس انجمن کے ممبر ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ اس ریکٹ کو ایک باقاعدہ بزنس فرم کی لائیز پر چلا رہے ہیں۔ تم اخبار و

کے دو تین ایڈیٹروں کو جانتے ہو۔ اس ریکٹ کے خلاف ان میں لکھو۔ ان کو ایکسپوز کرو۔“

”مگر ڈپٹی سیکرٹری تعلیم و تربیت حیوانات“

”وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔ وہ شکار پھانستا ہے۔ دیکھو بختیار کتنا بڑا ریکٹ ہے۔“

چچا عبدالباقی اور میں بیٹھے اس سنڈیکیٹ کے ممبروں کی کمیونٹی اور ذلالت پر گرم بحث کر رہے تھے کہ نیچے سے کچھ شور سانسائی دیا۔

تھوڑی دیر بعد چچا کے لڑکے عبدالرحمن نے آکر ہمیں بتایا کہ دو پولیس مین اور بہت سے آدمی نیچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

”ان سے کہو میں گھر پر نہیں ہوں“ عبدالباقی نے غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر ہیں“

”کتنی دفعہ عبدالرحمن میں نے تم کو سمجھایا ہے۔ اچھا ان کو اوپر بلا لو۔“

”میں نیچے نہیں جاؤں گا“ عبدالباقی اس نازک موقع پر بھی وقار اور سرد جرات کا مجسمہ تھا۔

ایک دھاریدار ریشمی سوٹ میں ایک موٹا سا آدمی اپنے ساتھ پولیس مین لیے اوپر آیا۔

”آئیے۔ صاحبان تشریف رکھئے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا ”سنائیے۔ کیسے آنا ہوا۔ بختیار انہیں سگریٹ پیش کرو۔“

”نہیں میں بیٹھوں گا نہیں“ نووارد نے روکھے پن سے کہا ”میں ہیلتھ افسر ہوں۔ آ کے محلے والوں نے مجھ سے درخواست کی ہے

کہ آپ نے یہاں مچھلی اسٹاک کی ہے۔ جس کی سڑاند کی وجہ سے ان کی صحت خطرہ میں ہے۔ بڑی سڑاندی Smell ہے۔

”مجھے تو نہیں آ رہی“ چچا نے کہا ”کیوں بختیار! تمہیں آ رہی ہے۔“

”آپ یہاں میونسپل قواعد کے مطابق مچھلی اسٹاک نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی مارکیٹ نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ گلتی سڑتی مچھلی

فوراً یہاں سے اٹھوا کر دور پھینکوانے وغیرہ کا خرچہ آپ کو دینا ہوگا اور میونسپل کمیٹی شہریوں کی صحت کو خطرے میں ڈالنے کی بنا پر آپ

کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی۔

”سنو۔“ چچا عبدالباقی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ڈیموکریسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں مچھلی بھی اسٹاک نہیں کر

سکتا۔“ چچا اور میں بالکونی سے میونسپل کمیٹی کے آدمیوں کو چھکڑوں میں مچھلی کے بورے لا دتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل خون

کے آنسو رو رہے تھے مگر بے بس تھے۔ پانچ چھ پولیس مین بھی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ظاہراً یہ مچھلی پھینکوانے کے لیے جا رہی تھی۔ بعد

میں ہمیں پتا چلا کہ کئی بورے مارکیٹ میں فروخت ہوئے۔

یہ اس مچھلیوں کے قصہ کا خاتمہ تھا۔ لیکن یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب نہ ہوگا۔

اس کے چند دن بعد چچا عبدالباقی اور میں القسطن سڑیٹ پر منگشت کر رہے تھے۔ اچانک ہم نے سامنے سے محمد احسن اشرفی

بچوں کی پوری فوج کی فوج کو آتے دیکھا۔

وہ ابھی کچھ دور تھے۔ چچا نے میرے ہانہ ٹوہ کر کہا۔ ”بختیار! ادھر آ جاؤ۔“ ہم ایک چھوٹی گلی میں ہو لیے۔ چچا نے یہاں ایک

اسٹال سے دور درجن کچھ انڈے خریدے اس نے ایک درجن انڈے مجھے دے دیئے۔

جب اشرفی کنٹینٹ سامنے سڑک سے گزری تو ہم نے ان پر نشانہ باندھ باندھ کر انڈے مارے۔ یقین ہے کہ وہ سب اپنے نشانوں پر لگے۔ دوسرے لمحے میں اور چچا عبدالباقی گلی میں بھاگتے ہوئے پیراڈائز کے جھوم میں مل جل گئے۔ کچر کا نام ”مولی ڈک“ تھا اور یہ ایک اچھی کچر تھی!



رفتار ادب

(تبصرے کے لیے چار جلدوں کا بھیجنا ضروری ہے۔ دو مدیر اور تبصرہ نگار کے لیے اور دوران کے کے احباب میں تقسیم کرنے کے لیے۔ تبصرے کے بعد مدیر اور تبصرہ نگار کی جلدوں کو مکتبہ کی طرف سے آدھی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ چار سے کم جلدیں بھیجنے پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ ادارہ کے قواعد کے مطابق جلدیں واپس نہیں ہوں گی)

۱۔ اندھے بیڑے ودیگر پرندے

مصنفہ ... بہادر علی فلکی

ناشر ... حاجی رب نواز اینڈ سنز۔ سوداگران کتب جو ناما ریٹ کراچی

صفحات ۲۲۵ ... (پچاس صفحے کا دیباچہ اور پچیس صفحے کے اشتہارات میں اس میں شامل ہیں)

قیمت ... پانچ روپے فی جلد (عام خریداروں سے) ایک روپیہ آٹھ آنے (تاجران کتب سے)

”اندھے بیڑے ودیگر پرندے“ اردو زبان اور شکاریوں میں سے ہیں اور ادب میں نئے نئے جلوہ نما ہوئے ہیں۔ ہم اسے ادب کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں۔ اور دفور مسرت سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فلکی صاحب قلم کے بھی اتنے دھنی ثابت ہوئے ہیں، جتنے جال اور غلیل کے۔ ان کے قلم نے رنگینی بیان میں کھل کر طرارے بھرے ہیں۔

فلکی صاحب نے کتاب کے شروع کی تقریر میں اپنے بچپن اور جوانی کے سیر حاصل حالات زندگی لکھ دیئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طائر نوازی اور صیادی ان کی گھٹی میں ودیعت ہوئی تھی۔ ان کے والد ملتان کے نامی کبوتر بازوں میں سے تھے۔ فلکی صاحب لکھتے ہیں کہ بچپن ہی سے مجھے بیڑ بازی، کبوتر بازی اور تیتروں کی لڑائی کا خط تھا۔ میرے والد مجھے اس سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بیٹا تم میرے دیکھا دیکھی کیوں عاقبت خراب کرتے ہو۔ آج کل اسے معزز پیشہ نہیں سمجھا جاتا۔ فلکی صاحب بھلا خاندانی پیشے کو کیسے چھوڑ دیتے۔ ایک دو بار والد نے انہیں پینا بھی لیکن اس کا ان پر الٹا اثر ہوا۔ ایک دن کبوتر اڑاتے اٹارے کو ٹھے

سے نیچے آگرے۔ اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دو مہینے ہسپتال میں رہے۔

بعض باتیں فلکی صاحب نے کتاب میں ایس لکھ دی ہیں۔ جن کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ مثلاً وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک مدت تک یاروں کے کبوتر چراچرا کر اپنا کابک بھتے رہے۔ آخر پکڑے گئے اور یار لوگوں نے ان کی مرمت کی اور ان سے حلف نامہ لکھوایا کہ پھر ایسا نہیں کروں گا۔ ایک دفعہ یہ گوشت کی مارکیٹ سے بیڑوں کا ایک ٹوکرا دوکاندار کی نظر بچا کر اٹھالائے۔ ہماری نظر میں اسی باتیں لکھنا ان کے لیے واجب نہ تھا۔ ایسی صاف گوئی سے خام طبع طاہر نواز غیر صحت مند اثر قبول کریں گے۔ فلکی صاحب کو چاہیے کہ اگلے ایڈیشن میں سے یہ قابل اعتراض حصے حذف کر دیں۔ ایک نقص اور بھی کھلتا ہے۔ فلکی صاحب پرندوں کے متعلق ذکر کرتے کرتے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ گویا وہ خود بھی پرندہ ہیں اور ان کے ساتھ پرواز کر رہے ہیں۔ اس سے مضمون کی سنجیدگی پر حرف آتا ہے۔ نام کتاب اندھے بٹیرے کی موزونیت کا جواز پیش کرتے ہوئے فلکی صاحب نے رائے ظاہر کی ہے کہ بٹیرے جب پکڑے جاتے ہیں تو دانے کے لٹچ میں اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کو پس و پیش سمجھائی نہیں دیتا۔ فلکی صاحب یہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ ہمارا علم اس میدان میں صفر ہے۔ بہر حال نام کے موزوں ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ادبی جمود کے اس دور میں یہ جدت قابل ستائش ہے اور فرح بخش بھی۔

دوسرے پرندے جو اس نادر کتاب میں فلکی صاحب کے ہمراہ کلکاریاں بھرتے ہیں کبوتر، دینا، کوا، چیل اور بلبل ہیں۔ لٹے کبوتر، مانگ کبوتر اور قلندر کبوتر پر الگ الگ باب ہیں۔ جن میں کام کی باتیں ہیں اور کبوتروں کی جنی زندگی کی حیرت خیز جھلکیاں فلکی صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے بیان کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے عریانی سے دامن بچا لیا ہے اور کہیں بھی قانون کی زد میں نہیں آتے۔ چیل کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ بات کہ چیل دھوپ میں انڈہ چھوڑ دیتی ہے غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ چلچلاتی دھوپ میں کئی کئی گھنٹے اس امر کی تحقیق اور مشاہدے کی خاطر سرگرداں پھرے ہیں لیکن ایک بار بھی کسی چیل کو انڈا چھوڑتے نہیں دیکھا۔ ہمیں ان سے اختلاف ہے دیکھا تو ہم نے بھی نہیں مگر محاورہ غلط نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس موضوع پر دلچسپ بحث ہو سکتی ہے جس کے لیے اس پرچے کے صفحات ہمیشہ حاضر ہیں۔

عبارت سلیس اور عام فہم ہے کیونکہ فلکی صاحب نے آٹھویں کے بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ کتابت کی غلطیاں البتہ جا بجا ہیں۔ کاتب اچھا نہیں ملا اور فلکی صاحب خود دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے نظر ثانی نہیں کر سکتے۔ پہلے ہی صفحے پر فلکی صاحب کا نام فلکی کے بجائے نکلی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح کاتب نے ہر جگہ چیل کو چیل لکھا ہے۔ دو تین مقام پر بلبل لکھا گیا ہے ممکن ہے کاتب اندھا

ہو۔

ہم فلکی صاحب کو ان اغزشوں سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں فلکی صاحب کے ایک دوست کا ویجاچہ بھی شامل ہے یہ صاحب طائر نواز کا لقب استعمال کرتے ہیں اور جلد ساز ہیں چنانچہ اس کتاب کی جلد بھی انہی نے باندھی ہے۔ جلد مضبوط ہے۔ سر رنگے سرورق پر ایک بلبل کی تصویر ہے۔ جو چیل سے زیادہ مشابہ ہے۔ کسی جدید آرٹسٹ کا اعجاز ہے۔ مجموعی طور پر کتاب خوب ہے ہمارے احباب نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ ناشران سے گزارش ہے کہ ہو سکے تو دو جلدیں اور بھجوادیں۔

کیونکہ مکتبہ کے لیے اب کوئی جلد اس کتاب کی ہمارے پاس موجود نہیں۔

۲۔ دوشیزہ کاغان عرف کابلی مجاہد

(اسلامی تاریخی ناول)

مصنفہ... نمکین خلد آبادی

ناشر... اسلام بک ڈپونڈو آدم

صفحات ۸۹۵...

قیمت... آٹھ روپے پندرہ آنے

ایک سال کے قلیل عرصے میں یہ نمکین خلد آبادی صاحب کا ساتواں اسلامی تاریخی ناول ہے۔ نمکین خلد آبادی کو اس ڈھنگ کے لکھنے والوں میں مستقل مقام حاصل ہے ہم نے اس ناول کو کہیں کہیں سے دیکھا ہے لیکن ہمارے احباب میں سبکی ایک اسے پڑھ چکے ہیں اور اب نمکین صاحب کے آٹھویں ناول کے لیے مکتبہ میں آئے بیٹھے ہیں ہم نے انہیں یقین دلایا ہے کہ ان کی مراد جلد پوری ہوگی، تھوڑا صبر کریں۔

ناول بے حد دلچسپ ہے۔ مکالموں کی روانی اور واقعات نگاری کی لطافت کے لیے نمکین صاحب پہلے ہی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ کئی ایک مکالمے تین تین صفحات تک چلے گئے ہیں اور بولنے والے کو تھکن نہیں ہوتی۔ ایک جگہ کابلی مجاہد بالاکوٹ میں پردے کی آڑ سے ہیردین ماہ جبین سے ملاقات کرتا ہے تو بے تکان بڑی فصیح اور مرصع اردو میں کئی کئی صفحے تک بولے چلا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ زمانے کے کابلی کتنے فصیح البیان ہوتے تھے۔ آجکل کے نوجوان کابلی مجاہدوں کی جگہ پر ہوتے تو بغلیں جاکنے لگتے اور چند ٹوٹے

پھوٹے فقروں سے زائد کچھ نہ کہتے۔

اسلامی تاریخی ناول نگاروں کو عموماً کرداروں کے نام تلاش کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ نمکین صاحب نے اس وقت پر یوں قابو پایا ہے کہ کوئی سے دو نام لے کر بیچ میں بن یا ابن جڑ دیتے ہیں۔ کابلی مجاہد کا نام احمد بن اکرم ہے آجکل کے ”کابلی خان“ کہلاتے پھرتے ہیں۔ نمکین صاحب کا تاریخی مطالعہ وسیع ہے۔ اس ناول سے ہمیں پتہ لگا کہ حضرت اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں بھی تاریخی کا رواج ہو چکا تھا۔ اور مکانات میں گیس بھی جلائے جاتے تھے۔

نمکین خلد آبادی کے یہ تازہ ترین کوشش ہر پڑھنے والے کو ان تاریخی معلومات اور قدرت بیان کا قائل کر دے گی۔ کیا ہم ان سے درخواست کر سکتے ہیں۔ کہ ہمیں بتائیں کہ آپ نے یہ معلومات کون سی کتاب سے فراہم کی ہیں؟ ہم بھی اپنے تاریخی علم کو اپنی ڈیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ جو بے حد تشنہ ہے۔ مزید ان سے التماس ہے کہ آپ نے اپنے پہلے ناولوں کے چند مکالموں کو بعینہ الفاظ میں اس ناول میں استعمال کیا ہے۔ اس سے اجتناب کریں تو بہتر ہے۔ اس لیے یہ ناول پڑھتے ہوئے ہمیں شبہ گزرا کہ ہم نے اسے پہلے کہیں پڑھا ہے۔ ٹائٹل دوبارہ دیکھا تو اطمینان ہوا۔

ناول کی قیمت موجودہ مہنگائی کو دیکھتے ہوئے نہایت مناسب ہے، بلکہ کم ہے کتابت، طباعت نفیس ہے۔ کاغذ ناشر نے نہایت چکنا اور دبیز لگایا ہے۔ خدا جانے اسے کہاں سے دستیاب ہوا۔ ہمیں تو ”چمگاؤ“ کے لیے عام کرتا فلی بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ ناول کے سرورق پر کابلی مجاہد کے چہرے پاڈاڑھی دکھائی گئی ہے۔ حالانکہ ناول میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ سرورق کے دوسری طرف نادر شاہی خضاب کا اعلان بھی خوب ہے ناشر سے گزارش ہے کہ چار جلدیں مزید بھیج دیں، پہلی جلدوں کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں گئیں۔

تسخیر جنات

(حصہ اول و دوم)

بمعدہ تصویر مصنف و جنات

مصنفہ ... خاکپائے فقیر جلال شاہ صاحب

ناشر ... جناب پبلیکیشنز

صفحات ... دو سو

ہدیہ ... دو روپے (عام خریداروں سے) تین روپے (اشراف و امراء سے)

متذکرہ بالا کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ہمارے روحانی اور جناتی ادب میں ایک بڑے خلاء کو بطریق احسن پورا کرے گی۔ اہل ذوق اور جنات کے ستائے ہوئے تیرہ بختیوں کے لوہقین ایک مدت سے ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کر رہے تھے چنانچہ ہم نے ماہنامہ ”چمکاؤ“ میں ایسے حضرات کے متعدد خطوط بھی شائع کئے ہیں جن میں انہوں نے ہم سے یہ درخواست کی تھی کہ جنات کے رام کرنے کی کوئی معیار کتاب ہماری نگاہ میں ہو تو انہیں مطلع کریں ہم عدیم الفرستی کی وجہ سے ان خطوط کا جواب نہ دے سکتے۔ سچ یہ ہے کہ کوئی معیاری تصنیف اس موضوع پر ہماری نظر میں بھینہ تھی۔ حالانکہ ”چمکاؤ“ کے ڈیکلریشن داخل کرنے کے وقت ہی سے ہم خود ایسی کتاب کی تلاش میں تھے۔ قارئین کے خطوط میں سے ایک خط ایک جن کا بھی تھا۔ اس نے اپنا پتا نہیں لکھا تھا۔ بعض باتیں جو اس نے ہمارے متعلق لکھی تھیں غالباً غلط فہمی کی بنا پر تھیں ورنہ ہمیں اہل جنات سے کسی قسم کی ذاتی پر خاش نہیں۔

عرصہ ہوا کہ درگاہ بک ڈپو کی مطبوعہ ایک کتاب جنات کے پوشیدہ اور پر اسرار حالات پر ایک کرم فرما کے پاس دیکھی تھی، لیکن وہ تصنیف کچھ اس لحاظ سے ادھوری اور تشنہ تھی کہ کئی ایک مشہور جنوں کے نام اور سوانح عمریاں تک اس میں درج نہ تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک خامی یہ تھی کہ جنات کی تسخیر کے جو طریقے اور نسخے بتائے گئے تھے وہ بے حد مشکل اور پرانے تھے۔ مصنف یا خود کنات ہی ان پر عمل کر سکتے تھے وہ کسی انسان کے بس کا روگ نہیں تھے۔ جلال شاہ صاحب کی تصنیف جامع تو نہیں کہی جاسکتی پھر بھی بڑی حد تک ان خامیوں سے مبرا ہے۔ اس میں تقریباً سب ابجانات کی مکمل سوانح عمریاں موجود ہیں اور کتاب کے اخیر میں اشاریہ بھی ہے جس سے فوراً پتا چل سکتا ہے کہ کس جن کے حالات یا ذکر کتاب کے کس صفحے پر ہے البتہ جنات کے نام پہلے معلوم ہونا ضروری ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کتاب کی یہ ہے کہ جنات کی تسخیر کے طریقے سہل ماڈرن اور سائنٹیفک ہیں۔ مصنف کا طرز نگارش بھی کھلتا ہوا ہے۔ ان کا اصلی نام بتانے کی ہمیں اجازت نہیں، لیکن وہ اردو کے ایک مشہور و معروف تنقید نگار ہیں۔ ادبی جمود کے بعد تنقید نگاروں کے لیے کوئی کام نہیں رہا۔ اس لیے وہ ادب کی دوسری اصناف کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ یہ اردو کے لیے نیک فال ہے۔

شاہ صاحب کو جنات اور بھوت پریت کا خاصا علم ہے جو ہماری رائے میں معدودے چند اردو دان ادباء کو ہی نصیب ہوگا۔ چنانچہ صفحہ پچھتر پر خود رقم طراز ہیں ”جنات کا بادشاہ ڈخداہ والد صاحب قبلہ سے درسلینے آیا کرتا تھا اور ان سے بیعت ترہا۔ اس فقیر کا بھی دمنخواہ اور دوست ہے۔“

ان کے جنات کو تسخیر کرنے کے نسخے خود ان کے اپنے آزمودہ ہیں۔ شاہ صاحب کے سہل اور تیر بہدف نسخوں کو پرانے مشکل اور

نا قابل عمل نسخوں سے وہی نسبت ہے۔ جو غالباً ہومیو پیتھی کو ایلو پیتھی سے ہے گویا وہ جناتی امراض کے ہومیو پیتھ ہیں جو ایک چار آنے کی خوراک سے برسوں کی بیماری کو نفع و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ اڑتالیس پر ہری سنگھ جن کو دور کرنے کا نسخہ یوں لکھا ہے ”سولا ہیٹ سر پر رکھو اور مصلے پر بیتھ کر چار سفریٹ (بگلے کے یا سکی اور بڑھیا برانڈ کے ہوں تو بہتر ہے) بیک وقت منہ میں لے کر سگاؤ۔ دھوئیں کو نختنوں کی راہ سے چھوڑو۔ انشاء اللہ ہری سنگھ نختنوں سے دھوئیں میں تحلیل ہو کر خارج ہو جائے گا۔ میرا اپنا آزمودہ ہے۔“

اس سہل نسخے کے برعکس ہری سنگھ جن کو دور کرنے کا جو نسخہ پرانے عاملوں اور حکمائے روحانی کی بیاضوں میں درج ہے اس میں باقی ریاضتیں اور روزشیں تو ایک طرف ہیں روز کا چلہ (بکری کے دودھ پر) ہی خود عمل کرنے والے کو جن بنانے کے لیے کافی ہے۔

اس انسانی امراض کا سبب جنات ہیں۔ دق کی بیماری کا ذمہ دار انہوں نے ایک جن ہو چا موچی کو بتایا ہے ایس ایہی ہوگا۔ ہم نے تو ہو چا موچی کا نام بھی پہلے نہ سنا تھا۔ اسی طرح انہوں نے ہماری کئی معاشی خرابیوں کو بھی جنات سے منسوب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ رشوت خوری، ذخیرہ اندوزی، خود نمائی، غزل گوئی، یہ سب امراض جنات کی پیدا کردہ ہیں۔

انہوں نے ایک دوست کا ذکر کیا ہے جو پہلے بھلا چنگا تھا۔ ایک لخت غزل گوئی کرنے لگ گیا۔ پانچ پانچ غزلیں روزانہ نظم معرا میں لکھتا تھا اور انہیں ڈاک میں بھیج کر ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ شاہ صاحب تاڑ گئے کہ اس پر سلطانہ نامی کوئی جن سوار ہے اس شخص کے والدین سخت پریشان تھے۔ شاہ صاحب نے اس کا علاج کیا اور سلطانہ جن کو نکالا۔ آج کل بقول مصنف وہ شخص بالکل صحت یاب ہے اور برسر روزگار ہے الفنسٹن اسٹریٹ کے ایک ہوٹل میں ہیڈ بیرا ہے ”سلطانہ“ کے جانے کے بعد اس نے معرا چھوڑ مقفے غزل تک نہیں لکھی۔ حقیقتاً شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر جنات کی ریشہ دوانیوں اور فتنہ پرداز یوں کو بے نقاب کر کے ملک و قوم کی ایک خدمت سرنا جمادی ہے۔ ادارہ ”چمگا دڑ“ نے اس تصنیف گراں پایہ کو اول درجے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے چنانچہ اس ماہ سے ”چمگا دڑ“ جلال شاہ صاحب کے نام ایک سال کے لیے بالکل مفت جاری کر دیا گیا ہے۔

کتاب صوری و معنوی محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ اندر جنات کی دس تصاویر اور خاکے شامل ہیں۔ مصنف کی اپنی تصویر بھی انہیں تصاویر میں آگئی ہے جس سے بعض اصحاب کو غلط فہمی ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہرج تو کوئی نہیں، لیکن ان کی تصویر کتاب کے شروع میں ہوتی تو زیادہ موزوں تھا۔ گرد پوش پر ہری سنگھ کی سہرنگی تصویر ہے۔ حالانکہ نام نیچے مصنف کا لکھا ہے۔

ہمیں مجلہ ایڈیشن کی دس جلدیں برائے تصویرہ موصول ہوئی ہیں دوسرے ناشرین کو بھی چاہیے کہ اس معاملے میں خست سے کام نہ لیا کریں۔

یہ کتاب مصنف سے پوری قیمت پر یا مکتبہ چمگا دڑ سے نصف قیمت پر حاصل کی جاسکتا ہے۔
مندرجہ ذیل موصول شدہ کتب پر تبصرہ آئندہ کے ”چمگا دڑ“ میں ہوگا۔

۱۔ دردنامہ یک جرس کارواں (طویل ترین تمثیلی نظموں کا مجموعہ) از حضرت ادریس الکلامی۔

۲۔ نوالدین پاشا عرف ترکی حرم کے راز۔ اسلامی تاریخی ناول۔ از نمکین خلد آبادی۔

۳۔ آسمانی سفرنامہ از مولانا عبدالقدیر فانوس۔

۴۔ تفہیم التثقید (بہت ٹھوس تنقیدی مقالے) از پروفیسر ڈاکٹر کرم الہی نقاد۔

نوٹ: مقالات حالی پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ ناشرین نے ہمیں صرف تین جلدیں کتاب کی بھیجی ہیں۔



ایک باتصویر سوسائٹی میگزین

حال ہی میں نے ایک انگریزی کے سوسائٹی میگزین سے کچھ کچھ وابستہ ہو رہا ہوں۔ وابستہ ان معنوں میں کہ گو اس کی ادارت اور اشاعت کا مجھ سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں لیکن اس کی ہونے والی مدیرہ مس نیک پروین میری منہ بولی خالہ ہیں۔ میں نے انہیں پچھلے مہینے ہی دریافت کیا ہے۔ کیونکہ جب سے میری دو حقیقی خالائیں ایک کے پیچھے دوسری اللہ کو پیاری ہوئی ہیں، میں نئی خالائیں کی ٹوہ میں رہتا ہوں۔ ان دنوں ایک ہمدرد گھڑ خالہ کے بغیر زندگی گزارنا حماقت ہے۔

مس نیک پروین جو سوسائٹی میگزین نکال رہی ہیں۔ اس کا نام "The Viewer" ہوگا۔ پہلے شمارے کی ترتیب تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ "منگلری چیئر" "ماتان چیئر" "لاہور کالنگ" "کراچی ڈیزائنڈ نائٹس" کے مستقل فیچر لکھوائے جا چکے ہیں۔ ڈیٹکریشن کے ملنے میں ناگزیر تاخیر کی وجہ سے میگزین ابھی چھپ کر مارکیٹ میں نہیں آ سکا جو بڑی افسوسناک بات ہے۔ ایک مہینہ اور دیر ہوگئی تو خالہ کو سب فیچر دوبارہ لکھوانے پڑیں گے اور فوٹوں بلاکوں پر جو محنت لگی ہے وہ الگ اکارت جائے گی۔ مس نیک پروین جب سے میری خالہ بنی ہیں مجھ پر خاصی مہربان ہیں اور میگزین کے بارے میں مجھ سے ہمیشہ مشورے لیتی ہیں۔ چند دن ہوئے جب میں انہیں ملنے گیا تو انہوں نے مجھے "کراچی ڈیزائنڈ نائٹس" کا فیچر لکھنے کو دیا اور کہا کہ اسے برش اپ کرنے کے بعد واپس لوٹا دوں۔ یہ فیچر مس نیک پروین کی ایک عزیزہ کا لکھا ہوا ہے جو کراچی میں کسی کالج میں اکتساب علم کر رہی ہیں۔

افسوس کہ میں اپنی خالہ کی شفقت کے لائق ثابت نہیں ہوا۔ فیچر کو پڑھتے ہی میری باجھیں کھل گئیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس فیچر کے اردو ترجمہ کو قبل از وقت اشاعت کے لیے دے کر میں نہ صرف ایک ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں بلکہ مجھے ایک ایسی خالہ سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے جو مشکل سے دستیاب نہیں ہوئی تھیں۔ میں سب سوچ بچار کے بعد یہ پرخطر قدم اٹھا رہا ہوں۔ آخر اردو پڑھنے والوں کو ایسے دلفریب فیچر سے کیوں محروم رکھا جائے۔

اور یہ ہیں کراچی کے شب و روز مس نیک پروین کی بھانجی کی نگاہ میں۔

کراچی کے شب و روز

کراچی میں ان دنوں بڑا سہانا موسم ہے، سمندر کی ٹھنڈی ہوا دلوں کو لہراتی ہے۔ گھاس سبز لگتی ہے اور درخت ہرے بھرے۔ قدرتا ایسے موسم میں پارٹیاں دینے اور پارٹیوں پر بلانے میں لطف آتا ہے۔ ہوٹل میٹروپول، بیچ لگژری اور کراچی کلب ان خوش پوشاک ہنستے ہوئے لوگوں کی آماجگاہ ہیں جو کراچی کو جنت بنانے پر گویا تلے ہوئے ہیں۔

یوم آزادی

طومانیہ کی جمہوریہ کا یوم آزادی منانے کے لیے طومانوی سفیر کاؤنٹ ڈراکولا نے اس بار اپنے گھر میں ڈنر دیا۔ کاؤنٹس ڈراکولا چونکہ اپنے پالتو ایرانی بے ”مینو“ کا علاج کرانے سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی ہیں اس لیے استقبالیہ مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ عورتوں کو قدرتا بڑی مایوسی ہوئی اور کئی مردوں کو بھی۔ سروبوئے اور میزوں کی سجاوٹ کا انتظام ان سلیقہ شعار اور منتظم خواتین بیگم گلابی، مسز ہر اور فرالین الغرابی البحرابی کی تحویل میں تھا اور انہوں نے اسے بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ وہ پورا دن اپنے گھروں سے غائب رہیں۔ طومانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے گملے جا بجا محرابوں اور دیواروں سے آویزاں تھا اور ان سے اصلی پھولوں کی سی مہک آتی تھی۔ فرالین الغرابی البحرابی کاغذی پھولوں کا معطر کرنے میں بڑا کمال درجہ رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ بڑا ہی خاص فنکشن تھا اس لیے بوئے میں سالم بریان ہرن، مچھلی کے قتلے مرغ پلاؤ، سلاڈ چکن سلاڈ، مچھلی سلاڈ، سوڈا منٹ وغیرہ چنے گئے تھے۔ بیگم گلابی نے جن کے ذمے یہ کام تھا، ہر چیز بڑی خوبی سے میز پر سجائی تھی۔ فرالین الغرابی البحرابی مسٹر کلب علی وہمی اور کاؤنٹ ڈراکولا کا بل ٹیریر کتا بچے بیچ برساتی میں ٹھہرے تاکہ اگر کوئی خواتین غلطی سے آجائیں تو انہیں روک لیں۔ خواتین تو نہیں آئیں البتہ پانچ چھ بن بلائے مہمان ڈنر جیکٹ پہنے ایک ٹیکسی میں سے اترے لیکن کلب علی وہمی نے جو ایسی صورتوں کو فوراً بھانپ جاتے ہیں انہیں خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے بتا دیا کہ وہ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ بل ٹیریر کو دیکھ کر وہ فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی ایک اور شخص ایک مصنوعی داڑھی لگائے آیا۔ اس نے خود کو غریبیہ کا قونصل بتایا۔ اس کے پاس طومانیہ نشان سے مزین دعوتی رقعہ بھی تھا۔ بل ٹیریر اس فرضی قونصل کو سڑک تک چھوڑ آیا۔ کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ غریبیہ کا کوئی قونصل خانہ پاکستان میں نہیں۔ ایسے شہر پسند لوگ اب اس شہر میں بہت ہو گئے ہیں جن کا شعل مانگے کے ایوننگ سوٹ پہن کر پارٹیوں میں جا گھسنا ہے اور حکومت کو ان کے بارے میں جلد کوئی موثر قدم اٹھانا چاہیے۔

سو کے لگ بھگ معزز اور میز مہمان اس فنکشن میں شریک ہوئے۔ شریک ہونے والے میں پیر بلند اختر آف جمال گوٹھ، شیخ باز بہادر، مسٹر اقلیدس آف رائل بنگال ٹائیگر کمپنی، ڈاکٹر لقمان، صدر شعبہ منطق اور اے پی موللا آف گلوب ٹرانزولینڈ بھی شامل تھے۔

ایک اعزازی ڈنر

ویوری تانیا کے آرٹ اور کرکٹ کے وزیر موسیو ایم فالسٹاف ان دنوں اپنے ملک کی کرکٹ ٹیم کے ہمراہ کراچی آئے ہوئے ہیں۔ ویوری تانیا کے نائب قونصل اور میڈم تارا پورا نے ان کے اعزاز میں اپنے خوشنما محلہ میں ایک پر تکلف استقبالیہ دیا۔ جس میں حکومت کے سیکرٹریوں، سفارتی ارکان، معزز تاجار اور دونوں ملکوں کی کرکٹ ٹیموں کے کھلاڑی شامل ہوئے۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے کھلاڑی اپنے بیٹ ساتھ لائے تھے۔

گھروں پر استقبالیہ دینے کا رواج اب عام ہو چلا ہے۔ دراصل ہوٹل میں اس خانگیٹ کا احساس مفقود ہوتا ہے جو گھروں میں ہوتا ہے پھر ہوٹل والے بل بھی بڑھا چڑھا کر بناتے ہیں۔ شکر ہے کہ اس استقبالیہ میں عورتیں بھی مدعو تھیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ بے چاری میڈم تارا پورا پورچ میں اکیلی کھڑی مہمانوں کا استقبال کر رہی ہیں۔ موسیو تارا پورا پر آدھ گھنٹہ پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا اور ان کا شو فر انہیں کار میں لٹا کر رومی حالت میں سول ہسپتال لے گیا تھا۔ ہم سب کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا اور ہم نے میڈم تارا پورا سے اظہار ہمدردی کیا۔

میڈم تارا پورا شری رینگ کار ریشمی فراک پہنے تھیں۔ گردن اور سینے سے کھلا گلے میں دور یا چندن ہار تھا۔ جس کے نقلی موتی جگمگ کرتے تھے۔ اٹھارہ سال کا سن اور اٹھتی ہوئی جوانی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ پچھلے سال ہی ان کا موسیو تارا پورا سے بیاہ ہوا تھا۔ آئس کریم بڑی لذیذ تھی۔ میں نے ساری عمر ایسی لذیذ آئس کریم نہیں کھائی۔ مہمانوں نے ہر ایک چیز سے پورا انصاف کیا۔ موسیو تارا پورا کی عدم موجودگی محسوس تک نہ ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے شوہر اپنی بیویوں کے بغیر تھے۔ دو تین بیگمات بھی اپنے شوہروں کے بغیر چلی آئی تھیں۔ مسٹر پوکرا اور مسز وہی جو آج کل اکٹھے دیکھے جاتے ہیں ایک کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دور ہونے کی وجہ سے میں ان کی باتیں نہ سن سکی۔

پارٹی دیر تک رات ہوتی رہی۔ موسیو ایم فالسٹاف پانی چہلوں اور دل لگیوں سے خواتین کو ہنساتے رہے۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ خوب پر لطف استقبالیہ تھا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔

ایک عشائیہ

مسٹر اور مسز جمعہ نے اپنے احباب کو ایک عشاء پر بلایا۔ مہمان باہر لان میں بیٹھے پھول بڑے شاندار تھے کیونکہ مسٹر جمعہ کی بانی باغبانی ہے۔ چائے اور آئس کریم کے آنے تک جمعہ حسین اپنی باغبانی کے قصے سناتے رہے۔

مسز جمعہ حسین جار جٹ کی سرخ ساڑھی پہنے تھیں جس کا فیتہ زری کا تھا۔ غالباً ان کی شادی سے پہلے کا ہوگا کیونکہ آج کل تو جار جٹ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ بیگم کا بوس چمپئی غرارہ قمیص میں بڑی سویٹ دکھائی دے رہی تھیں۔ مینا عزیز شفق رنگ کا ریشمی دوپٹہ اوڑھے جس کے پلے سنہری تھے۔ مسٹر برکت آغا سے باتیں کر رہی تھیں۔ بیگم عام بخت بھی جریب ٹیکتی ہوئی ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں جاتی تھیں اور ایسے فقرے کستی تھیں کہ سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ستر سال کی عمر میں بھی ہر پارٹی میں دندناتی ہوئی پہنچتی ہیں اور بناؤ چناؤ جوانوں سے کم نہیں کرتیں۔ زعفرانی ساڑھی میں حسین زہت منیر اپنے شوہر کی ہابیز کے متعلق سنا رہی تھیں۔ مسٹر زہت منیر کی ہابیوں میں ایک جنگلی ریکھوں کو سدھانا بھی ہے ان کی دوسری خوشگوار بانی ہوائی بندوق سے لوگوں کی ٹوپیاں اڑانا ہے۔ مسٹر آئی جمعہ اپنے گاف کے تجربات سنا رہے تھے سیاست سے فارغ ہونے کے بعد مسٹر جمعہ نے اپنی مکمل توجہ گاف کو دے دی ہے۔ مسٹر بھبھو جیا آف بلیک میلرز لمیٹڈ جو حال ہی میں ویانا سے لوٹے ہیں ویانا میں رہنے کے فوائد پر روشنی ڈال رہے تھے۔ ان کی رائے میں کراچی اور ویانا کی زندگی میں بہت فرق تھا۔ وہ اگلے ہفتے پھر ویانا آنا جا رہے ہیں۔

آم سب نے خوب لطف سے کھائے۔ مسٹر جمعہ حسین کے ایک دوست ہر سال انہیں سندھ سے آموں کے ٹوکے بھجواتے ہیں۔

ایک کاک ٹیل پارٹی

قاضی اور بیگم مجاور علی نے پچھلے دنوں میاں اور بیگم آئی نوح کے فرزند اور بہو میاں اور بیگم تربوز کے اعزاز میں ایک کاک ٹیل اور ڈنر پارٹی دی۔ میاں اور بیگم تربوز کی شادی حال ہی میں ملتان میں ہوئی تھی۔ پہلی بیگم تربوز جواب بیگم مجاور علی ہیں چمپئی نائلن کے غرارہ قمیص میں طرارے بھرتی ہوئی پارٹی کی جان تھیں۔ بیگم تربوز کو کراچی میں پہلی بار اپنے سوشل اسٹیٹس کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور نہ ملتان میں تو وہ اپنے اسٹیٹس کے لوگوں کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ معزز مہمانوں میں مسٹر اور بیگم بگھیر پرنس اور پرنس فخر الملوک مولوی لطف علی ڈائریکٹر لطف بیوٹی پروڈکشن اور مسٹر نیو شامل تھے۔ فقیر ابوالکشف نے میجر ڈومو کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے نبھائے۔ مسٹر نیو نے جو کاک ٹیل مکس کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اپنی پوری فارم میں تھے۔ کاک ٹیل پارٹی کے دوران میں قاضی مجاور علی جو ضعف قلب کے مریض ہیں کولیسٹس ہو گئے۔ فقیر ابوالکشف اور مسٹر نیو انہیں اٹھا کر اوپر باتھ روم میں

شاہر کے نیچے رکھ آئے۔ قاضی مجاور علی پانی سے شرابور ایونگ سوٹ میں بالکل ٹھنڈے ہوئے ایک گھنٹے کے بعد نیچے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی سب نے گانا شروع کر دیا۔

”اوہ ہی ازاے جالی گڈ فیلو“

بیشتر مہمان رات کو وہیں میزوں کے نیچے سو گئے۔ صبح ان کو ٹیکسیوں میں لاد کر ان کے گھروں تک پہنچایا گیا۔

شادی

پچھلے دنوں ایک کشیدہ قامت خوبو جرنلسٹ کی شادی ایک حسین آہو چشم لڑکی سے ہوئی۔ یہ جرنلسٹ روزنامہ ”فساد“ کے مسٹر نگہیرا ہیں جو اپنے کالم میں ہمارے نمائندہ خصوصی مقیم بان واشنگٹن یا ماسکو کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن اکثر کراچی میں پائے جاتے ہیں۔ آپ اس ہر دعویٰ کو جوڑے ڈاکٹر اور نیگم نگہیرا کے فرزند دلہند ہیں جن کی خوبصورتی اور دوراندیشی سے ترتیب دی ہوئی پارٹیاں کئی ہونے والی شادیوں کی داغ بیل ڈالتی ہیں۔ دلہن جو چودھری اور نیگم لال دین کی دختر صالح اختر ہیں، فالسٹی اٹلس کا غرارہ پہنے تھیں، تارکشی کا پیش بہادو پہنے جس کے سنہری پلے دو دو بالشت لٹک رہے تھے، عروسانہ طریق پر اوڑھے تھیں۔ سر پر طلائی جڑاؤ، چھیکا، گنگنے جڑے ہوئے کی جھال۔ ناک میں بناوٹی سونے کی نتھ، کانوں میں آویزے غالباً بناوٹی سونے کے گلے میں تین لڑا چندن ہار جس کے بناوٹی موتی آنکھیں خیرہ کرتے تھے۔ سب زیورات چاند سے مکھڑے پر خوب چبھتے تھے۔

دلہن جسم چرائے آنکھیں جھکائے، سسٹی سسٹائی بیٹھی تھیں۔ جیسا کہ دلہنوں کو بیٹھنا چاہیے۔ دلہا بالکل دولہا لگ رہے تھے۔ مہمانوں نے فردا فردا ان کو شاباش دی اور ان کی پیٹھ ٹھونکی۔

مہمانوں میں حکومت کے ڈپٹی سیکرٹری، سفارت خانوں کے تھرڈ سیکرٹری، اخبارات کے نمائندگان خصوصی مسٹر عباس علی آف عباس سائیکلر، مسٹر مستنصر بیگم الغرابی البحرابی حال ہی میں اپنے بلے ”مینو“ کے ساتھ سوئٹزر لینڈ سے لوٹی ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ وہ وہاں مینو کے علاج کے لیے گئی تھیں جو بیمار ہے۔ مینو کو ابھی پوری طرح افاقہ نہیں ہوا مگر پہلے سے بہت بہتر ہے۔ پیر جمال گوٹھ اور مسٹر افریت اپنی بیویوں کے بغیر آئے تھے جو دماغی ہسپتال میں ہیں۔ مسٹر عباس علی اپنے نانو کول اور قرمزی بو میں بڑے پر تمکنت اور سنجیدہ تھے۔ مسز حمزہ شفق ساڑی میں مسٹر نیپو سے باتیں کر رہی تھیں جو چو گو شیعہ ٹوپی اور سیاہ پھولدار پرین میں بڑے بانگے دکھائی دیتے تھے۔ شیخ شیرازی اپنے نیلے سوٹ میں ہر کسی سے لطف کی باتیں کر رہے تھے اور ان خواتین سے جن کے چہرے ان کو نئے معلوم ہوتے تھے بڑھ بڑھ کر اپنا تعارف کر رہے تھے۔ خدا نے جوڑے کو ہمیشہ شاد کام اور خوش و خرم رکھے۔

(یہاں تک تو مس نیک پروین کی عزیزہ کا لکھا ہوا فیچر ہے لیکن کراچی میں ان دنوں اور فنکشن ہوا جسے ”کراچی کے شب و روز“ کو راؤنڈ آف کرنے کی خاطر درج کیا جاتا ہے اس کا اضافہ ان چار منگ لوگوں کو ناگوار نہیں گزرے گا)

ایک چائے کی دعوت

حال ہی میں جمعرات کے روز چاکیواڑہ میں ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی انجمن کے صدر بھلے ڈینو نے اپنے منجھلے بیٹے عمر ڈینو کے ملازم ہونے کی خوشی میں غریب النواز ہوٹل پر اپنے احباب اور انجمن کے ممبروں کو چائے کی دعوت دی۔ مسٹر بھلے ڈینو کے دوست ایک مدت سے اس دعوت کا تقاضا کر رہے تھے۔ عمر ڈینو کلف دار سبز عمامے اور چار گزرے کی نیلی شلوار میں بڑے چار منگ اور وضع دار لگ رہے تھے۔ سب مہمانوں نے اسے لیاری بس سروس میں کنڈکٹر کی جگہ پر تعینات ہونے پر مبارکباد دی۔

غریب النواز میں صرف مرد دعوت تھے۔ چاکیواڑہ میں ابھی تک مخلوط پارٹیاں کا رواج نہیں پہنچا۔ معزز مہمانوں میں سائیں اللہ لوگ سنیاسی عامل، کامل و طبیب روحانی نبیرہ ڈاکٹر غریب محمد مرحوم حکیم حاذق محمد دین اسپ۔ ایک فلمی کامیڈین ایم بخولی اور نور علی مالک و پروپرائٹر ماشاء اللہ بوٹ ہاؤس شریک تھے۔ لڑکے کے ماموں سکھے ڈینو جن کی دختر نیک اختر کے ساتھ مسٹر عمر ڈینو کی شادی طے ہو چکی ہے۔ خاص پارٹی میں شمولیت کی خاطر نواب شاہ سے آئے تھے۔ آپ کا وہاں افیون کا ٹھیکہ ہے۔ سائیں اللہ لوگ سنیاسی اپنی ناف تک لمبی ریش اور بورے کی فرغل میں بڑے چار منگ دکھائی دیتے تھے۔ آپ نے دیر تک اپنی نئی روحانی ایجادات کے کرشموں سے حاضرین کو دم بخود رکھا اور مسٹر عمر ڈینو کے بازو پر اپنا تیار کردہ ایک خاص کراماتی تعویذ باندھا۔ محمد دین اسپ نے ایک قطعہ پڑھا جس سے عمر ڈینو کے ملازمت کے روز کی تاریخ نکلتی تھی۔ پارٹی ہنسی خوشی میں ختم ہوئی۔

نوٹ: یہ ایک معصوم ہیرو ڈی ہے، سوسائٹی میگزینوں کی۔ سب نام اور واقعات بالکل فرضی ہیں اور فرد یا طبقے کو خفیف کرنا مطلوب نہیں۔ اس مضمون کو ایک ہیرو ڈی کی حیثیت میں پڑھا اور پرکھا جائے۔



مسٹر گھامڑ کا ادبی کیریئر

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیہ

اپنی دال روئی کی طرف سے قدرے مطمئن ہونے کے بعد مسٹر گھامڑ کو نام پیدا کرنے کا سودا اسما یا۔ اس نے سیاست کے میدان کی طرف نظر کی۔ یہاں بڑی مشکلات دکھائی دیں۔ سیاست میں کامیاب ہونے کے لیے جس چرپ زبانی اور چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ قدرت نے مسٹر گھامڑ کو دو بیعت نہ کی تھی۔ پھر ایک دن اس نے اپنے دوست فقیر ورکشا والے کے ہاتھ میں اردو کے ایک ماہنامے کا خاص نمبر دیکھا۔ اس نے یہ نمبر اپنے دوست سے مانگ لیا اور گھر آ کر اس کی ورق گردانی شروع کی۔ اس ماہنامے کے پہلے تین چار صفحات ادیبوں کی تصویروں کے تھے جن میں سے بیشتر گنجے اور معک پرندے لگتے تھے۔ اس کے بعد دو صفحے ان ادیبوں کے تعارف کے لیے وقف تھے۔ جن کے بعد مقالوں، افسانوں اور نظموں کا ایک طومار تھا۔ گھامڑ نے سب مضامین کو اسے لیے تک پڑھا۔ بیشتر مقالے اور نظمیں اس کی سمجھ سے بالاتھیں۔ لیکن وہ انکی علیست اور گہرائیں سے بے حد مرعوب ہوا۔ اس نے قینچی سے مقالہ نویسوں کی تصویروں کو رسالے میں سے کاٹ کر دیوار پر چسپاں کر دیا۔ اس کا انہیں فریم کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر اس کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے اس کے بعد گھامڑ اردو ادب کا ایک بڑا سنجیدہ پڑھنے والا بن گیا اور جیسا کہ قدرتی امر ہے اسے بھی اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کی خواہش ستانے لگی۔ ادبی شہرت اسے ایک ایسی چیز محسوس ہوئی جس کے حصول کے لیے نہ روپے کی ضرورت تھی اور نہ چرب زبانی کی اور جس کا حاصل کر لینا اسے بہت آسان نظر آیا۔

لیکن ادبی شہرت حاصل کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ اس نے پہلے پہل ایک رکشا والے کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ اس نے اسے رسالہ ”قدریں“ میں چھپنے کے لیے بھیجا اور اس پرچے کے اگلے شمارے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اگلا شمارہ خریدا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ فہرست مضامین کو اوپر نیچے تک پڑھا۔ اس کی کہانی اس میں نہیں تھی۔ یہ اس سے اگلے شمارے میں بھی نہیں تھی۔ اس نے ایڈیٹر کو خط لکھا۔ جس میں اس نے کہانی کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ گھامڑ نے ہمت نہ ہاری۔ اب اس کے لیے اس نے ایک جدید طرز کی معرلظم ”زنداں میں شام“ لکھی اس کا بھی وہی حشر ہوا جو کہانی کا ہوا تھا اس کے بعد اس نے خاص نمبر کے سب سے عالمانہ مقالہ کے نمونے کو سامنے رکھ کے ”ادب میں بحران کا پس منظر“ کے عنوان سے ایک مقالہ

لکھا۔ یہ بھی نہ چھپا اور نہ ”قدریں“ کے ایڈیٹر نے اس کی رسید دی۔

مایوس ہو کر اس نے سوچا کہ یوں تو کام نہ بنے گا، کوئی اور ترکیب لڑانی چاہیے چنانچہ یہ تجویز اس کے ذہن میں آئی کہ کسی طرح ”قدریں“ کے ایڈیٹر سے دوستی گانٹھنا چاہیے۔ اس نے خاص نمبر میں ایڈیٹر کا فوٹو دیکھا تھا۔ ایک موٹا سا پلا ہوا آدمی جو ایڈیٹر سے زیادہ پھل فروش لگتا تھا۔ ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایڈیٹر کو کافی ہاؤس کی سیڑھیوں پر اوپر چڑھتے دیکھا۔ گھامڑ بھی فوراً اس کے پیچھے اوپر چڑھ آیا، اس نے ایڈیٹر کو ایک کونے کی خالی میز کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا۔ گھامڑ بھی وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایڈیٹر سے کہا ”معاف کیجئے! آپ ہندو پاکستان کے عظیم ادیب عاقل فریادی تو نہیں؟“

”بندہ ہی عال فریادی ہے“ ایڈیٹر نے خوشی سے ایک لمبی کی طرح خرخراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے آپ کا فوٹو دیکھا تھا اور اسی سے آپ کو پہچانا ہے“ گھامڑ نے کہا، ”میں آپ کے فن کا بڑا مداح ہوں۔ آپ کے ماہنامے کو باقاعدہ پڑھتا ہوں آپ کی نظم ”سرگوشی“ مجھے بڑی پسند آئی، کہئے کافی ہاٹ پیجے گا یا کولڈ۔ ابھی بھرا۔“

گھامڑ نے ایڈیٹر کے لیے کافی کے ساتھ کیک بھی منگوائے اور کافی کے بعد انہوں نے آئس کریم بھی کھائی۔ گھامڑ نے اس شام ایڈیٹر کی مہمان نوازی میں بڑی دریادلی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنی سارے دن کی کمائی مسٹر عاقل فریادی پر خرچ کر دی لیکن اسے اس کا ذرہ برابر بھی افسوس نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رقم جو وہ خرچ کر رہا ہے یہ ادبی شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے انوسٹمنٹ ہے جس کے لگانے سے اسے درلغ نہ کرنا چاہیے۔ کافی کے بعد دو گھنٹے جدید ادب اور لکھنے والوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ جن سے گھامڑ نے نتیجہ نکالا کہ مسٹر عاقل فریادی کی اپنی رائے میں اس وقت اردو کا بہترین نقاد افسانہ نگار اور شاعر۔ صرف عاقل فریادی تھا۔

گھامڑ ادب کے بارے چند مبہم اور محتاط خیالات کا اظہار کیا۔ کئی ایک اچھے لکھنے والوں کے نام لیے اور ادبی بحران پر تشویش ظاہر کی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک اتفاقہ لہجے میں اس کا ذکر بھی کر دیا کہ وہ موجودہ ادب کے انخطاطی رجحانات کو ایک مقالے میں زیر بحث لا رہا ہے۔ ”لکھنے کے بعد مجھے دے دیجئے“ ایڈیٹر نے کہا ”ایسے مقالوں کی ہمیں بڑی ضرورت ہے۔ آپ کا ادب کے بارے میں مطمح نظر بے حد وسیع ہے۔“

گھامڑ اور ایڈیٹر رفتہ رفتہ اچھے دوست بن گئے۔ گھامڑ اکثر ایڈیٹر کو کافی ہاؤس میں ملتا۔ گھامڑ نے آخر اپنے انخطاطی رجحانات والے مقالے پر کام شروع کر دیا۔ اس نے اس پر بے حد محنت کی۔ پہلے تو اس نے خاص نمبر کے سب سے طویل مقالے میں سے

مشکل اور بار بار استعمال ہونے والے الفاظ چن کر ایک کاغذ پر لکھ لیے۔ مثلاً غیر طبقاتی شعور، سرمایہ دارانہ رجعت پسندی یا جدلیاتی قدریں، استحصالی نظام، سامراج، بورژوائی ذہنیت وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے ایسے فقرے بنانے کی کوشش کی جن میں ان لفظوں اور ترکیبوں میں سے کم از کم ایک آدھ ضرور استعمال ہو۔ گھامڑ کو خود اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ وہ کیا لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دس دن کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ اپنے مقالے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ مقالہ بیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا عنوان تھا ”ادب کے انخطاطی رجحانات۔ شعوری، نیم شعوری اور لاشعوری“ اس کے پہلے ابتدائی دو صفحے یہ ہیں۔

ادب کے انخطاطی رجحانات شعوری، نیم شعوری اور لاشعوری

از: گھامڑ

”اس موضوع پر مجرد بحث ممکن نہیں لیکن چونکہ مسئلہ کی اہمیت مسلمہ ہے اس لیے کم از کم یہ جاننے کی کوشش کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ عوامی ادب اور انخطاطی ادب میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ ہم اب اپنی ناعاقبت اندیشانہ روش کی وجہ سے اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں عوامی ادب اور انخطاطی ادب میں تمیز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے یہ افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس دور کے انخطاطی ادب کو رواج دینے والے بھی زیادہ تر ہمارے عوامی اور برخورد غلط ترقی پسند قلم کار ہی ہیں اور وہ ان قدروں کو اپنا رہے ہیں۔ بلکہ اپنا چکے ہیں جو ادب کی زندگی سے دور لے جاتی ہیں۔ چنانچہ شبلی، اقبال، جوش اور حالی کی روایات میں اب بہت کچھ بے سوچے سمجھے لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں کا یہ انخطاطی رجحان عوامی اور ترقی پسند ادب کے لیے جو خطرہ پیش کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ درآئحالیکہ ہر تاریخ کا طالب علم اس سے آگاہ ہے کہ تاریخ کے دھارے کو بدلائیں جا سکتا۔ ایک سمت چلنے والے تیز گام دریا کو الٹے رخ نہیں بہایا جا سکتا۔ چنانچہ شبلی، اقبال، جوش کی نظموں میں جو محنت و سرمایہ کا تضاد ملتا ہے وہ جدلیاتی ہے اور ان بزرگوں کا تاریخی شعور مجہول اور جھوٹا ہے اگرچہ ان کے حق میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کم از کم بورژوا طبقے کو مزدور طبقے سے آگاہ کیا، پھر بھی ان کے تاریخی ارتکا کے پس منظر میں سرمایہ و محنت کی جدلتاتی کے عدم وجوہ کی وجہ سے ان کی تخلیقات کو انخطاط دور کی پیداوار کہا جائے گا کیونکہ ہمیں ان کی نیت سے کچھ غرض نہیں وہ سیدھے سادے مسلمان تھے۔ جن میں سے ماسواغالباً اقبال کے باقی سب کی طویل سفید داڑھیاں ان کے گھٹنوں تک آتی تھیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کی شاعری سے کیا نتائج برآمد ہوئے اور آیا یہ کہ شاعری جاگیر دارانہ اور سرمایہ پرستانہ صورت اور معنی کی حامل ہے کون صحیح الفہم اور باہوش آدمی یہ کہے گا کہ دم کٹے کٹے اور شیر بہر میں کوئی فرق نہیں۔ اس مسئلے کی خاطر خواہ وضاحت کے بعد ہی عوامی ادب کی نئی اقدار کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے کیونکہ اس سائنٹیفک دور میں ادب کے صورت و معنی کو مادی

تغیرات سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اس کی ہیئت بدلنا لازمی ہے چنانچہ ہمارے ادیبوں اور قلم کاروں نے یہی غلطی کی ہے کہ وہ ابھی تک اپنے اذہان میں ”ادب برائے ادب“ کے انحطاط نظریہ کے قائل ہیں ورنہ عوامی اور جاندار ادب میں صورت پرستی اور استعارات اور لفظوں کے حسن کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی، جب کہ عوامی ادب کو عام بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے اور جذباتیت اور رومانی فراریت سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔

خیر اس کو فی الحال چھوڑیے ہمارے ادیب ابھی تک بورژوا کی طبقے کا دم چھلا بنے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے خیالات میں گنجشک اور بوکھلاہٹ کا عنصر نمایاں ہے۔

چنانچہ اقبال کو لیجئے۔ جسے ہم نے بوژروا آئیڈیالوجی کا شکار ہو کر بام فلک پر پہنچا دیا۔

در آں حالانکہ وہ ایک انحطاطی دور کے شاعر ہیں اور ان کے کلام کو عوامی جدوجہد سے کوئی ناٹھ نہیں رہا۔ ان کی شاعری ایک غیر سائنٹفک شعور کی پیداوار ہے۔ خیر اقبال کو چھوڑیے غالب کو لیجئے۔ غالب کی شاعری صورت پرستی کی شاعری ہے یہی حال سترھویں صدی کے انحطاطی دور کے انگریزی شعرا کیس، شیلے اور بائرن کا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کی عظمت اب ہمارے نزدیک محض ایک تاریخی رہ گئی ہے اکتائے نہیں۔ ہم جب تک تحقیق کی بنیاد اس سائنٹفک اور مادی نظریہ معیشت اور فہم اور شعور پر نہ رکھیں گے جو جبلت انسانی اور رجعت پسندانہ معیشت کے تقاضوں پر قابو پا کر انہیں کالعدم کر کے ایک نئی حیات کی تخلیق کرے جو فطرت اولیہ کا تضاد ہو۔ حیات ثانیہ کی نفی ہو تو معاف کیجئے صالح اور صحیح غیر طبقاتی ادب پیش نہیں کیا جاسکتا۔

سومرسٹ ماہام۔ جیمز جوائس، کہسلی، آندرے ژید اور پیر اوست کی تخلیقات کو اگر تاریخ اور سائنس کی ارتقائی قدروں پر جانچا جائے تو ان کی اتنی قدر و قیمت بھی نہیں رہتی جتنی بازار میں بکتی ہوئی ردی کی۔ ان لاشعور پر مبنی نظریات کا پرچار کرنے والے ادیبوں نے تاریخ کو پیچھے لے جانے کا ناقابل معافی گناہ کیا ہے اور ان کے گنجشک، غیر سائنٹفک اور رجعت پسندانہ اذہان کی مریضانہ جنسی خرافات نے موجودہ پود پر ایسا زہریلا اثر چھوڑا ہے کہ ہمیں اس کو زائل کرنے کے لیے شاید عظیم اور مسلسل جدوجہد کرنا پڑے۔ ان بوژروائی علمبرداروں کا طریق فکر سب مظاہر کو مختلف تسلیم کرنا ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک محبت محبت ہے۔ نفرت، نفرت ہے خود غرضی۔ خود غرضی ہے۔ کتا، کتا ہے اور گھوڑا گھوڑا۔ ان کا طبقاتی شعور اس قدر غیر پختہ اور انحطاط پذیر ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ ان مظاہر میں ایک گہرا رشتہ ہے اور ان کا ظاہر تضاد اصلاً تضاد نہیں بلکہ محبت، نفرت خود غرضی۔ کتا اور گھوڑا معیشت کے قوانین کے لازمہ مظاہر ہیں جو اس کے بدلتے ہی نیا قالب اختیار کر لیں گے۔ اسی منطق پر کار بند رہنے والا ہمارے ہاں منٹو ہے خیر اس مصنف کو فی الحال

چھوڑیے۔ مجھے ابھی اور ضروری باتیں کہنی ہیں وہ کہہ کر میں منٹو کی مریضانہ ذہنیت کا تجزیہ کروں گا۔“

اسی طرز میں اس مقالے کے پندرہ سولہ صفحات اور تھے۔ اسے کچھ کچھ شک ضرور تھا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے ناقابل فہم ہوگا اس ہے مگر جب اس نے اس مقالے کو اپنے دوست ایڈیٹر عاقل فریادی کو دکھائی تو وہ اس کے سائنٹیفک طریق تنقید سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے مضمون کو شاہکار کہا اور گھامڑ کو یقین دلایا کہ یہ مقالہ تنقید نگاری کی سب سے پچھلی روایات کو بدل ڈالے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ اردو میں پہلا مقالہ ہے جس میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے اختلاف کا اس گہرائی اور سائنٹیفک نقطہ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ گھامڑ یہ سب تعریف سن کر پھولانہ سما یا۔ عاقل فریادی بھی اپنی جگہ ایک ”نئی ادبی دریافت“ کرنے پر مغرور تھا۔

”قدریں“ کے اگلے شمارے میں اس مقالے کے ساتھ گھامڑ کی تصویر اور اس کا تعارف بھی چھپا۔ تصویر میں گھامڑ کو سگریٹ پیٹے ہوئے اور اس کے دھوئیں میں کھوئی کھوئی نظروں سے غور و فکر کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس مقالے کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں گھامڑ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اسے ادبی حلقوں کے کئی ایڈیٹروں کے خط آئے جن میں اس سے تنقیدی مقالوں کی فرمائش کی گئی تھیں۔ تین چار مہینے میں گھامڑ کا شمار ملک کے چوٹی کے نقادوں میں ہونے لگا۔ ایک صبح حجامت کرتے ہوئے گھامڑ کو خیال آیا کہ ادب کے ایک ہی شعبہ میں نام پیدا کرنا کافی نہیں۔ چنانچہ اس نے افسانہ لکھ کر اپنے مداحوں کو اپنی قابلیت سے اور زیادہ متحیر اور ششدر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان نے ”قدریں“ کے خاص نمبر کے افسانوں کو ایک بار پھر پڑھا اور پھر ایک مشہور افسانہ نگار کے افسانے کے نمونے کو سامنے رکھ کر ایک گھنٹے میں ایک افسانہ لکھ دیا۔ جس کا عنوان تھا ”لکڑی کا درخت“ اسے لکھنے کے بعد ہی خود اس دل نے اس سے کہا ”گھامڑ۔ کم بخت! تو نے تو شاہکار افسانہ لکھ دیا ہے اور پہلے ہی ہلے میں!“ وہ افسانہ یہ تھا:-

لکڑی کا درخت

از: ل۔ گھامڑ

شام کو مسافر روپ پور کے ننھے پہاڑی گاؤں میں پہنچا تو وہ سارا دن چلتے رہنے سے بے حد تھکا ہوا تھا۔ مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا اور شفق کے قرمزی لگ نیچے ست خرام ندی کے پانی میں گھل رہے تھے اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے پانی میں لالہ زار کھل رہا ہے۔

مسافر دن بھر چلتا رہا تھا۔ اپنے دیس سے وہ ریل پر پریم نگر کے اسٹیشن پر آیا تھا اسٹیشن سے چاند آباد تک بس میں اور وہاں سے وہ پیدل چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ وہ کہیں اور کیوں نہیں چلا گیا۔ وہ کونسی کشش

تھی۔ جو اسے روپ پور میں کھینچ لائی تھی۔ اس نے ایک ننھے بے باک چرواہے سے پوچھا جو بھیڑوں کو ہنکاتا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔

بچے میں یہاں کیوں آیا ہوں؟

چرواہے نے اسے معصوم اور تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔

مجھے کیا معلوم؟ اس نے کہا۔

کتنا ذہین بچہ ہے۔ مسافر سوچنے لگا۔ اور اسے کبھی نہ معلوم ہوگا کہ شعر کا حسن کیا ہے؟ دانٹے کی انفرنو میں کیا لکھا ہے۔ یہ ساری عمر بھیڑیں ہی چراتا رہے گا۔ اور اس کا بیٹا بھی اس کے بعد بھیڑیں ہی چرائے گا۔

ناگہاں مسافر نے دو چند دیہاتی دوشیزاؤں کو سر جھکائے، زلفیں بکھرائے انگلیوں کے پوروں سے لالہ گوں ندی کے پانی سے کھیلے دیکھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ یہ دوشیزائیں درحقیقت بید مجنوں کے اشجار تھے جن کی لابی مخرطی ڈالیاں نسائی انگلیوں سے اس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

وہ واپس لوٹا اور ننھے چرواہے کے پاس گیا۔

میں رات کو یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔

میرے ساتھ آؤ۔ چرواہے نے کہا۔ اور وہ اسے کچے مکان میں لے گیا جس کی چھت سرخ کچھریل کی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد وہاں کی بالیاں رنگین خوابوں کی طرح سرسرا رہی تھیں۔

بچے نے کہا، میری بہن اور میں یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ ہمارے ماں باپ دو سال ہوئے گزر گئے ہم بھیڑ بکریاں چرا کر اپنی گزران کرتے ہیں۔

مسافر نے سوچا لوگ کیوں مرتے ہیں۔ آنا فانا موت انہیں کیوں دبوچ لیتی ہے قدرت کتنی بے رحم اور سنگ دل ہے۔

میری بہن ابھی یہاں نہیں ہے۔ بچہ بولا۔ وہ اس وقت زمیندار کے ہاں چلی جاتی ہے۔ وہ سامنے تین منزلہ مکان ہے نا۔ وہ بڑا

اچھا آدمی ہے۔ میری بہن کو بڑی اچھی اچھی چیزیں دیتا ہے۔

دونوں مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مسافر چار پائی پر بیٹھ کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ بچہ اس کے لیے بکری کے تازہ

دودھ کا کٹورا بھر کر لے آیا۔ اسے پینے کے بعد مسافر کی ساری کسل دور ہو گئی۔

اتنے میں بچے کی بہن بھی آ گئی۔ وہ ایک سترہ سالہ دوشیزہ تھی۔ اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں اور اس کی آنکھیں وحشی ہرنی کی طرح بے باک تھیں۔

تم کون ہو؟ آخر مسافر نے پوچھا۔

لڑکی ہنسنے لگی۔ اس کے دانت سچے آبدار موتیوں کی لڑی کی طرح سفید اور چمکیلے تھے۔ مسافر کو ایسا معلوم ہوا جیسے یکا یک بادلوں میں سے مہتاب کا نور بہنے لگا۔ جھونپڑی میں جیسے اجالا ہو گیا۔

میرا نام موشا ہے۔ لڑکی نے کہا۔

مسافر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ موشا۔ لکڑی لا کر کچھ آگ جلاؤ۔ میں سردی سے جم رہا ہوں۔

موشا نے حسرت سے مسافر کو دیکھ کر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

مسافر یہاں لکڑی کی آگ نہیں جلائی جاسکتی۔ لکڑی زمیندار کی ہے۔

اور پھر مسافر کو پتا لگا کہ وادی کے سب درخت، پیل، دیو دار، بید مجنوں زمیندار کی ملکیت تھے اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر ان درختوں کی ایک ٹہنی تک نہ کاٹ سکتا تھا اس نے سوچا کہ یہ کتنا ظلم ہے۔ اس کے دل میں اس دیو صفت زمیندار کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔

موشا اس نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے کلہاڑی دو، میں لکڑی کاٹوں گا اور ہم اس کمرے میں لکڑی کی آگ جلائیں گے۔

چنچنی ہوئی، گاتی ہوئی آگ۔ اور تم اور تمہارا ننھا بھائی اور میں ساری رات اس آگ کے گرد بیٹھ کر کہانیاں کہیں گے۔

سچ... موشانے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ مسافر! مجھے کہانیاں بہت پسند ہیں۔

اس رات کلہاڑا نڈل سکے کی وجہ سے مسافر لکڑیاں کاٹ کے نہ لاسکا۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے گاؤں میں چلا گیا۔ اس نے

گاؤں والوں میں پرچار کیا کہ اس وادی کے درخت تمہارے ہیں اور تمہیں ان کو کاٹنا چاہیے۔ مگر گاؤں کے لوگ زمیندار کے ہرکاروں

سے خوف زدہ تھے۔ مسافر نے ان میں سے چند جیلے نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ وہ کلہاڑے لے کر اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔

ڈھول بجاتے، نعرے لگاتے اور کلہاڑیاں لہراتے وہ جنگل کی طرف چلے۔ اب انہیں زمیندار اور اس کے ہرکاروں کا کوئی ڈر نہ تھا۔

ان میں سویا انسان جاگ چکا تھا۔

زمیندار نے اپنے سہ منزلہ مکان چھت سے انہیں دیکھا۔ اسے نیچے آنے کی ہمت نہ ہوئی اس کا رنگ اس جھوم کو دیکھ کر زرد

ہو گیا۔

یہ درخت ہمارے ہیں۔ گاؤں والوں نے زمیندار کو دیکھ کر نعرے لگائے۔

وہ آگے بڑھتے گئے اور پہاڑ کے دامن میں جا کر انہوں نے درخت کاٹے۔ اب ان کے گھروں میں لکڑی کی آگ جلنے لگی اور اب رات کو دن کے کام کاج کے بعد معصوم بچے جیالے نوجوانوں اور ان کی سیاہ زلفوں اور پتلی کمروں والی محبوبائیں آگ کے گرد بیٹھ کر پہیلیاں بوجھتیں، ہستی اور ایک دوسرے سے چھڑیں کرتیں۔

لیکن زمیندار نے پریم نگر کے جاگیردار کو چھٹی لکھی اور اس نے وہاں سے فوج بھیج دی اور فوج نے آ کر گاؤں والوں پر ظلم ڈھائے۔ ان کی عورتوں اور بہنوں کو پکڑ کر لے گئے۔ اور پھر وادی پر اداسی چھا گئی۔

”یہ سارا قصور مسافر کا ہے“ گاؤں کے بڑے بوڑھے کہتے ”یہ ہمیں زمیندار کے خلاف نہ ابھارتا تو ہمارے گھر باریوں تباہ ہوتے۔ آخر اپلوں کی آگ تو ہم سینکتے ہی تھے۔“

دن گزر گئے۔ ہفتے گزر گئے۔ مہینے گزر گئے بارہ برس گزر گئے اور مسافر ابھی تک گاؤں میں تھا۔

اور اس عرصے میں زمیندار کا ظلم اور تشدد بڑھتا گیا۔ اب گاؤں والے اپنے جلاتے تھے۔ لکڑی کی بھڑکتی ہوئی آگ کیسی ہوتی ہے۔ شاعری کیا چیز ہے۔ زبان کی لطافت کیا شے ہے۔ پہاڑوں پر زرین ملائم کھال والے خوبصورت شیر کیسے چپکے سے دبے پنچوں چلتے ہیں۔ یہ سب باتیں گاؤں والے بھول گئے تھے۔ اب مسافر کے سوا جو ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا باقی سب کو پریم نگر کے جاگیردار نے اپنی فوج میں زبردستی بھرتی کر لیا تھا۔ کنواریاں اب بات بات پر ہنستی نہ تھیں۔ بچے مسکراتے اور کھیلتے نہ تھے۔ گاؤں پر اداسی گہری ہوتی گئی۔ چیلوں اور دیو داروں سے پتے جھڑ گئے۔ ملائم کھالوں والے شر اور سنہری جس پر رنگارنگ کی دھاریوں اور دھبوں کے کوٹ پہننے والے چیتے جنگل کے نہ رہنے سے وادی کو چھوڑ کر پربت کی ترائیوں میں اتر گئے۔ چکبری ریشمی کینچلیوں والے سانپ جو زریں وادی میں چاندنی راتوں میں ملہا ہوا لالہ پتے تھے خاموش ہو گئے۔ لوگ محبت کو بھول گئے اور بال بڑھا کر وہشیوں کی طرح پہاڑوں پر پھرنے لگے۔

مسافر کا دل یہ دیکھ کر خون کے آنسو روتا تھا مگر وہ جاگیردار اور زمیندار کی فوجوں اور توپوں کے سامنے بے بس تھا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ مسافر جانتا تھا کہ زمیندار بھی خوش نہیں تھا اس کے پاس دولت تھی۔ خوبصورت فرنیچر تھا، محل تھا، پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ اس کے پاس دو پالتو لگور تھے اور تین لگڑ بگڑ، پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ اس کے باپ نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے دادا نے بھی کوئی کام

نہیں کیا تھا۔ اس کے پردادانے بھی پہاڑوں پر نگل اگانے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا۔ پھر بھی زمیندار خوش نہ تھا۔

ایک دن سوچتے سوچتے مسافر کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا۔

تم گاؤں میں ایک پیپل کا درخت لگاؤ پھر اس پر زمیندار کا کوئی حق نہ ہوگا۔

مندر کے پاس پیپل کا ایک درخت لگایا گیا۔ پانچ سال دس سال پندرہ سال بیت گئے اور وہ درخت بہت بڑا ہو گیا۔ گرمیوں میں لوگ اسی کے گھنیرے چھتر دار سائے کے نیچے آرام کرتے اور سرما میں جب وادی میں بریلی ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ اس کی شاخوں کو کاٹ کر اپنے گھروں میں آگ جلاتے۔ زمیندار یہ دیکھتا تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لین وہ کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ پیپل اس کی ملکیت نہ تھا۔ اسے نہ اس کے باپ نے لگایا تھا نہ اس کے دادا نے اور نہ اس کے پردادانے۔

اب پھر وادی سے نحوست اٹھ گئی۔ چیل اور دیودار پھر اپنے پتے نکالنے لگے۔ حسین بادشاہوں کی طرح اکڑ کر چلنے والے شیر پھر سے اپنی وادی میں دبے پنجوں سے گھومنے لگے۔ ایک دن جب سردار پور کے جنگل میں شکار کھیلنے گیا ہوا تھا تو ایک شیر نے اس پر جست کی اور اسے بڑپ کر گیا۔ ریشمی کچلیوں والے سانپ پھولوں کے کنوں میں بدمست ہو کر لہرانے لگے۔ رات کو ان کی ملہار ساری وادی میں گونجتی۔ ایک دن ان میں سے ایک نے مسافر کو ڈس لیا۔ مسافر کا انگ انگ نیلا پڑتا گیا اور زندگی کی لودھی اور دھیمی ہوتی گئی۔ اور وہ مر گیا لیکن وہ مرا نہیں وہ زندہ ہے وہ اس نیلے خوابیدہ دھوئیں کی طرح زندہ ہے جو شام ہوتے ہی روپ پور کے پتھرے گھروں سے اوپر بل کھاتا ہوا اٹھتا ہے۔

یہ لکڑی کے درخت کی کہانی ہے۔ اب میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ میں آپ کو اچھے اور صاف کپڑے پہننے سے بھی نہیں روکتا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ صوفے سیٹ کی بجائے مونڈوں پر بیٹھا کریں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ چھتر دار پیپل کے حامی ہیں یا دیودار چیل کے؟ دیکھئے سوچ کر جواب دیجئے۔ آپ کے اس جواب پر اس ملک کے کروڑوں محنت کش عوام کے مستقبل کا دار و مدار ہے اور اردو ادب کا بھی۔

گھامڑ نے اس افسانہ کو ملک کے سب سے مشہور ادبی رسالہ کے افسانہ نمبر کے لیے بھیجا اس کی اشاعت پر گھامڑ نے فوراً پاک و ہند کے اردو افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ حاصل کر لی۔ ملک بھر میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس کے مداح اس کے اس کمال فن پر حیران اور خوش ہوئے۔ گھامڑ کئی ماہ تک اپنے نئے افسانوں سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کرتا رہا۔ پھر اس نے تنوع کی خاطر سوچا کہ اب غزل گوئی میں کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے تاکہ ادب کی یہ صنف بھی باقی نہ رہے۔ لیکن غزل کہنا ذرا میٹھی کھیر تھا۔ گھامڑ بے چارہ آزاد منش انسان۔ قافیہ اور ردیف کی بندشیں اس کے بس کا روگ نہ تھیں۔

اس نے غزل لکھنے کا خیال ترک کر دیا اور کئی ایک جدید نظمیں پڑھنے کے بعد پورے پانچ منٹ میں آزاد نظم ”نوید سحر“ لکھ ڈالی۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ نظم بھی ایک شاہکار تھی۔ وہ نظم یہ تھی۔

نوید سحر

از: گھامڑ

نوید سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم

مرے ندیم سرور ہو کہ اب بیت گئی رات

تاروں کے کہکشاں کی بہار تو دیکھ

پھیکے ہوئے جاتے ہیں ظلم کے یہ علمبردار

اور اب صبح ہونے کا فقط ہے انتظار

اور یہ سلاسل ٹوٹ جائیں گے سلاسل بے شمار

نوید سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم

کہ ظلم اور سامراج کا دور ختم ہونے کو ہے

ختم ہونے کو ہیں ملوک و اسقف و مخدوم

بڑھ رہے ہیں محکوموں کے ہجوم

چھیننے کے لیے اپنا حق۔ اپنی آزادی

یہ مدقوق کچلے ہوئے فریادی

بلند حوصلے سے پرچموں کی چھاؤں میں

ہر ایک کھیت میں۔ ہر ایک گاؤں میں

قدموں کی چاپ ہے

چپ چپ چپ چپ

نوید سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم

مسرور ہوئے ہم سفیر۔ سن یہ قرنائی آواز

دیکھ یہ مایوس، بجھے دلوں کی لاہوتی پرواز

اب اٹھ چھٹی جاتی ہے تاریکی

پہن قبا۔ نقرئی لئیں سنبھال

کہ سحر ہوگئی اے دوست

نوید سحر سنو!

ڈم!

یہ نظم چھپی تو ادبی دنیا میں کہرام مچ گیا اور جب اگلے سال کے منتخب ادب کا مجموعہ شائع ہوا تو گھامڑ کی تین تخلیقات اس کے صفحات کی زینت تھیں جو ادب کے تین مختلف شعبوں میں اس کی استادی کی آئینہ دار تھیں۔ مقالہ ”انخطاطی رجحانات شعوری نیم شعوری اور لاشعور“ افسانہ ”اورس کی نظم“ ”نوید سحر“ تینوں انتخاب کی زینت بنیں یہ ایک ایسا! ایسا تھا جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوا ہے اور جس سے کئی پرانے ادیبوں کو اس سے للہی بغض ہو گیا۔

ادبی شہرت کے زینہ پر چڑھنے کے بعد گھامڑ کی طبیعت یک لخت لکھنے لکھانے سے کھٹی ہو گئی اور اس نے لکھنا بالکل ترک کر دیا۔ ایڈیٹروں کی طرف سے ایک دو سال تک فرمائشیں آتی رہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ اس نے شادی کر لی تھی اور خانہ داری کے جنجال اور نمک تیل کے بکھروں نے گھامڑ کو سب چوکڑی بھلا دی تھی اور اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تین سال کے بعد تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے کبھی ادیب کی حیثیت سے اچھا خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کا نام اس کے مداحوں کے دماغوں سے بھی جلد ہی محو ہو گیا۔

ادبی شہرت کی عمر بھی کتنی مختصر ہے؟



ڈیپلو سے نوں کوٹ تک (ایک سفر نامہ)

”ڈیپلو سے نوں تک“ صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر (تھر) میں ایک گاؤں ڈیپلو اور ایک ریلوے اسٹیشن نوں کوٹ کے درمیان ایک سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۹۴۵ء میں کیا گیا تھا۔ لکھنے والے جذباتی ہم آہنگی کے مد نظر صیغہ واحد استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ جب میں ڈاکٹر کو الوداع کہنے کے بعد لوٹا تو دونوں ساربان اونٹوں کی مہاریں تھامے دروازے کے باہر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ سورج ابھی ریت کے ٹیلوں سے نیزہ بھرا اونچا تھا مگر ”ویرجی“ کا مشورہ تھا کہ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔ سوا ایک ساربان کو اونٹ پر ”پاکھڑا“ ڈالنے کے لیے کہا گیا۔ ویرجی نے (جو ایک پیدائشی شترسوار ہیں) میری کتابیں ایک چادر میں دو برابر گٹھڑیوں میں اس طرح باندھ رکھی تھیں کہ متوازن صورت میں اونٹ پر با آسانی دھری جاسکیں۔ انہوں نے شام کا کھانا جو روٹیوں اور گھی میں تلے ہوئے انڈوں پر مشتمل تھا، پہلے سے اخباروں میں لپیٹ رکھا تھا اور اس پر بندھے ہوئے رنگین فیتے تھے تو اسے اچھا خاصا نفیس بنڈل بنا دیا تھا۔ اس بنڈل کو نہایت محنت اور چابکدستی اور انگوٹھوں کے دباؤ سے حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی اور جب یہ کوشش ناکام ہوتی نظر آئی تو اسے نہایت بھونڈے طریق پر ٹھونس دیا گیا۔

انسان کے دماغ میں نفاست اور خباثت پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس لیے نفیس بنڈل کو حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کی بجائے ٹھونسنے پر مجھے مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حجامت کا تھیلا سچ عج عمر عیار کی زنبیل ہے۔ اس میں اتنی چیزیں سما سکتی ہیں کہ آپ ان کا تصور تک نہیں کر سکیں گے اور جب یہ بالکل بھر جائے اور ہمارے کرے کی سی صورت اختیار کر لی تب بھی اس میں کئی ایک چیزوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس تھیلے کو ہم نے پاکھڑے کی گھنڈی سے لٹکا دیا۔ ساربان اندر سے میرا ہولنڈال اٹھا لیا۔ ویرجی اور ساربان نے مل کر اسے پاکھڑے پر کچھ اس طرح بچھا دیا کہ میرے اور ساربان کے لیے دو نہایت ملائم اور آرام دہ نشستیں بن گئیں۔ یہ اطمینان کر کے کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ میں ویرجی کو آخری ہدایات دے کر اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ ویرجی کے لیے میرا رواں شکر گزار تھا۔ اچھا آدمی وہ میرے لیے اتنا ہی مددگار ثابت ہوا تھا جتنا مسٹر ووٹر کے لیے مسٹر جیوز میرے قیام کے دوران میں سوائے

اللہ دین کے چراغ کے وہ میرے لیے سب کچھ مہیا کرتا رہا تھا اور فی الواقع ڈیپلو میں وہ میرے لیے لازمی اور ناگزیر اور جانے کیا کیا ہو گیا تھا۔

ساربان اپنی نشست پر آیا تو اونٹ حسب معمول چند بے تکے زاویے بنا کر اٹھا۔ میں اب بہت بلند ہو چکا تھا۔ دیہاتی مکانوں کی منڈیروں کے برابر میں نے فلیٹ چھوڑ کر ویرجی کو اور ایک مبہم طریق پر ڈیپلو کو الوداع کہا اور تھوڑی ہی دیر میں ڈیپلو اور اس کے اچھے لوگ ہمارے عقب میں تھے اور ہمارے سامنے حواس باختہ سورج کی زردی اور لالی کا عجیب سا امتزاج جیسے آگ بھڑک رہی ہے۔ جیسے آگ بجھ رہی ہے۔

وہی مینگنوں اور گوبر سے پٹی ہوئی ریتی کی چراگاہ ٹیلوں پر جگالی کرتی ہوئی بکریاں کنوئیں میں سے پانی کھینچتی ہوئی تین عورتیں جو دور سے چڑیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ ہیڈ منشی (ہمارے ہاں اسے نائب تحصیل دار کہتے ہیں) ننگے سر اور ننگے پاؤں ہاتھ میں رسی لئے اپنی گائے کے پیچھے دوڑتا ہوا اور اپنی ”ہیڈ منشی شپ“ کے آداب اور مصلحتوں کی پروا نہ کرتا ہوا دور اسکول کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہوئے (فٹ بال کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر ہوا فولادی پمپ کے بجائے انسانی پھیپھڑوں کی مرہون منت ہے) مسٹر ویروانی ہیڈ ماسٹر وہی ٹھٹھنا گھبراہٹا ہوا بد حواس آدمی اپنے الگ تھلگ مکان کے سامنے والی گلی میں کھڑا مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتا ہوا یا شاید مجھے یاد دلاتا ہوا کہ میں پلٹتے ہوئے اس کے لیے نارنگیاں لانا نہ بھول جاؤں۔ یہ تھے ڈیپلو کے آخری نقوش۔

اس کے بعد میں تھا اور میرا ساربان۔ اور وہ جنگل کی بوٹیوں اور خود رو جھاڑیوں میں سے لہراتا ہوا ریتلا راستہ جو سامنے ریت کی ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر اور میں اس پہاڑی کی چوٹی تک کئی مرتبہ آئے تھے۔ اسی پہاڑی پر سے میں نے پہلی بار ڈیپلو کو نیچے نشیب میں ایک کھوئے ہوئے رومان کے شہر کی صورت میں دیکھا تھا۔ اب بھی ڈیپلو سنہری شام کے شامیانے تلے بالکل مطمئن اور بے پروا انداز میں پڑا تھا۔ ڈیپلو کو میری جدائی کا چنداں احساس نہ تھا۔ پھر اونٹ ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا اور ڈیپلو میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

منظر انتہائی دلکش تھا اور ایک انوکھے صحرائی حسن کا حامل۔ جنگل کی خود رو جھاڑیوں سے ڈھنی ہوئی ریتی وادیاں اور پہاڑیاں جو بالکل اصلی وادیوں اور پہاڑیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں عجیب سے ٹیڑھے ٹیڑھے اکیلے اکیلے درخت بھی تھے۔ کاش میں آپ کو سب بوٹیوں اور درختوں کے نام بتا سکتا۔ مگر میں علم الطبیعات کا ماہر نہیں ہوں۔

کبھی کبھی ہمیں موروں کی چھٹکاؤ سنائی دے جاتی۔ ایک مرتبہ تو ساربان نے اشارے سے مجھے مورد کھائے بھی جو قدرت کے

اس جنگلی باغ میں غرور سے اپنے رنگین پروں کی بھڑک دکھا رہے تھے اور موریوں ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ مسکور اور اداس اور شاید منتظر بھی۔ کیونکہ ناچتے ہوئے مور کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ہے جسے مورنی ”چگ“ لیتی ہے اور یہی آنسو مورنی کے پیٹ میں انڈے کی تعمیر کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ آنسو اور نسل کشی عجیب سی بات ہے۔ مگر کلنڈری قدرت جو انسانی ڈھانچے کی خاسترے سے پھول اگا سکتی ہے اگر آنسو میں سے انڈا پیدا کر لے تو حیرت بیکار ہے۔ پھر فاختہ کی آواز آئی جو اس گلابی جھپٹے میں نیم خوابیدہ پہاڑیوں اور درختوں اور جھاڑیوں کو اپنا ایک ہی ابدی پیغام سنائے جا رہی تھی..... کوکو کو۔ مترنم آوازوں کی لہریں تھیں۔ جو فضا میں آن کی آن میں لپک جاتی تھیں۔ کھلکناتی ہوئی صداؤں کے چھینٹے تھے۔ جو اندھیرے اجالے کی حدوں کو بھگوئے دے رہے تھے۔ کوکو کو۔ پنجاب میں جہاں ہم فاختہ کو گھگھاہی کہتے ہیں۔ ایک عجیب سی لیکن خوبصورت کہانی مشہور ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ گھگھاہی کہتی ہے۔ ”یوسف کھوہ، یوسف کھوہ“ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تو یہی گھگھاہی تھی جو ان کے بوڑھے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس یہ پیغام لے کر آئی تھی۔ ”یوسف کھوہ، یوسف کھوہ“ یوسف کنوئیں میں ہے، یوسف کنوئیں میں ہے۔ خدا جنت نصیب کرے ہمارے صدیوں کے پرانے افسانہ نگار کو جس کی متحیلہ نے گھگھاہی کو کاشف الاسرار بنادیا۔

اونٹ کی چال ریاضی کے ”سائن کیورڈ“ (Singn Curue) کے نچلے حصے سے کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے، پہلے آپ نیچے جاتے ہیں اور پھر اچانک نہیں بلکہ ایک متوازن گھماؤ کے ساتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں اور اوپر اٹھتے ہی پھر نیچے چلے آتے ہیں۔ جیسے سمندر کی لہروں پر۔ لیکن میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنا خوش نہیں تھا۔ ایک تو نشست تنگ تھی دوسرے وہ کتابوں کی گٹھڑیاں جنہیں ویرجی نے میرے آگے پا کھڑے پر رکھا تھا۔ بار بار میرے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔ شروع میں تو یہ کتابیں میرے گھٹنوں کو سہلاتی رہیں، پھر چٹکیاں لینے لگیں اور اب لوہے کی سلاخ کی طرح انہیں چھیدے جا رہی تھیں۔

ڈپلو سے نوں کوٹ تک کا راستہ انہی ریتلی پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ چڑھاؤ اور اتار اتار اور چڑھاؤ۔ بالکل اونٹ کی چال کی طرح۔ بالکل سمندر کی لہروں کی طرح۔ عین مین سلسلہ خیالات کی طرح۔ ان پہاڑوں کے درمیان ترائیوں میں کہیں کہیں باجرے کے کھیت عرف ”بنیاں“ ہیں جن میں ”چھائیاں“ بافراط ہوتی ہیں۔ تھر میں ہندوانہ یا تربوز کو چھائی کہتے ہیں۔ چھائی تھری بہشت کا اکلوتا پھل ہے اس لیے اسے نہایت شوق اور قدرے تعظیم اور احترام سے کھایا جاتا ہے، چھائیوں اور ایک دو اور سبزیوں کی پیدائش کا یہی موسم ہے۔ چھائیوں کے موسم سے چند مہینے پہلے لوگ ایک دوسرے سے ان حسین اور خوش آئند گھڑیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ جب پھیکی چھائیوں کی کثرت ہوگی، یہ احترام اور انتظار ایسے ملک میں فطری ہے جہاں سارے سال اور کوئی پھل یا

سبزی نہ لگتی ہو۔

اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈیپلو سے نوں کوٹ تک اونٹ پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رچنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہوگا۔ ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں اور مسافریوں محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفرت نہیں۔ یہ سفر ایک پرانے مریض کی زندگانی سے بھی زیادہ طولانی ہے۔

رفتہ رفتہ مغربی افق بچے کچے گلاب کی تلچھٹ پی گیا اور درختوں اور جھاڑیوں پر رات کی سیاہی یعنی ابدیت کی کہر چھانے لگی۔ فاختہ چپ ہو گئی۔ اس کے نغموں کی جگہ جھینگروں اور ”حشرات شبی“ کی مسلسل تیز اور زیروہم سے بے نیاز پکاریوں نے لے لی۔ البتہ کبھی کبھی کسی شب زندہ بیدار پرندے کی اداس ”تو ہو“ سنائی دے جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ ایک چاندنی رات تھی۔ تیرہویں کا بڑا اور برف جیسا سفید چاند صاف آسمان پر پوری شان سے چمک رہا تھا۔ ہر جھاڑی اور بوٹی دکنے اور ٹٹمانے لگی تھی اور گرد کی پہاڑیاں چاندنی میں سحر زدہ کھڑی تھیں۔ ہمارا راستہ جھاڑیوں میں سے سفید جھلکی مارتا ہوا رنگ رہا تھا۔ جنگل کی رات کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ہمیں کبھی کبھی نیچے کسی کوٹ میں موشیوں کی گھنٹیوں کی ٹٹناہٹ سنائی دے جاتی جو ہمیں بتاتی کہ ہم انسانی آبادی سے دور نہیں۔ بعض اوقات تو ہم لوگوں کے ہنسنے بولنے اور بھاگنے کی آوازیں بھی سن لیتے تھے۔

یہ طلسم جو چاندنی جنگل اور درختوں پر پھونکتی ہے صرف ایک بہت بڑے ساحر کا کام ہے، درخت عجیب خیالی صورتوں میں بدل جاتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ عظیم آسمانی کوچھوتے ہوئے دیو بن جاتے ہیں اور کئی مرتبہ دبک کر ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں۔ میں نے ایک درخت دیکھا جو اس وقت ایک بہت بڑا بادبانی جہاز بنا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تمام بادبان پھیلائے کسی جزیرے میں مدفون خزانے کی دھن میں روانہ ہونے کو تیار کھڑا ہو۔ ایک درخت جو ہوائی چکی کا روپ دھارے تھا، میرے غور سے دیکھنے سے فوراً اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔ اور وہ ایک بڑا اور مہیب ٹینک جو میرے نزدیک آنے پر کیکر میں بدل گیا۔

کئی دفعہ جھاڑیاں اور لہراتے ہوئے یہ ریتلے راستے مدھم روشنی اور سائے اور سکوت، سب مل کر ایک مبہم سا کھویا کھویا مگر بہت بڑا افسانوی شہر بن جاتا ہے، میناروں، گنبدوں اور محرابوں والا شہر۔ میں نے راستے میں ایسے ہی دو تین شہر دیکھے اور اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے ذہنی فریب تھے جو جنگل اور چاندنی اور سکوت کی باہم سازش کا نتیجہ تھے مگر میں اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اصلی شہر نہیں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے جنگل میں ایک تیز سیٹی کی آواز سنی۔ ریل کی سیٹی کی آواز۔ میں جانتا تھا کہ ریل یہاں سے تیس پینتیس میل دور ہے اور اگر یہ آواز ایک مرتبہ بلند ہو کر رک جاتی تو یہی کہہ کر اپنے اوسانوں کو بہلا لیتا کہ میرے کان گونجتے ہیں یا رات کے کسی پرندے نے چہل کی ہے۔ مگر میں نے سیٹی کے بعد گاڑی کی مدھم چھکا چھک چھک بھی سنی اور پہیوں کی ہلکی گرگڑاہٹ بھی جیسے کوئی گاڑی اچانک حرکت میں آگئی ہو۔ یقیناً یہ کوئی نظر نہ آنے والی آہنی گاڑی تھی جو ان جنگلوں میں سے گزر کر بھوتوں کے کسی شہر کو جارہی تھی۔ ذرا اس ریل گاڑی کا تصور کیجئے جس کے ڈرائیور سے لے کر گارڈ اور مسافروں تک سب بھتے ہوں۔ بھتے اور بھتیاں۔ جگنوؤں کے ذریعے اور خشک تربوزوں کے اٹیچی کیس اور کیلے کے پتوں کے بستر اور ہائے یہ چاندنی کا جادو اور یہ انسان کی قوت خیال جو الف لیلہ کی تصنیف کا باعث بنی۔

رات کے ساتھ چاند کی کرنوں کا سحر بھی بڑھتا گیا۔ چاند کے کھنڈرے ساتھی ستارے بھی جیسے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے اپنی سیٹی پناہ گاہوں سے باہر آگئے شروع شب میں ایک گھڑسوار اور ایک شترسوار راستہ میں ملے تھے مگر اب تین چار گھنٹوں کے طویل وقفے اور طویل تر مسافت کے دوران میں ہمیں راہ میں کوئی ذی روح نہ ملا۔ اگرچہ مویشیوں کی گھنٹیوں کی مٹنٹا ہمیں اپنے ہم جنسوں کی قربت کا احساس دلاتی رہیں۔ میں ساربان کی زبان اور ساربان میری زبان سے نا آشنا تھا اس لیے گفتگو کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوتی تھی اور ایک آدھ سندھی فقرے (مثلاً فلاں مانو سٹھو آ ہے) سے شروع ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ ساربان پوچھتا ”صوبہ دار سٹھو مانو ہے؟“ یعنی کیا صوبہ دار اچھا آدمی ہے؟ اور میں جواب دیتا ”صوبہ دار سٹھو مانو ہے“ ساربان کے لہجے سے میں اس کا مافی الضمیر کسی حد تک سمجھ لیتا تھا مگر یہ قوت تبادلہ خیالات میں مدد ثابت نہ ہو سکی۔ گفتگو کی تمام کوششوں کو بے بسی کے کمرے سے نیچے اجنبیت کی کھاڑیوں میں گرتے دیکھ کر ساربان شاید بالکل ناامید ہو گیا اور عجیب چینٹی ہوئی پھٹی پھٹی غیر قدرتی آواز میں گانا شروع کر دیا اور اپنی ناک کو انگوٹھے اور انگشت شہادت میں لے کر اس سے وہی کام لینے لگا جو گویے طنبورے سے لیتے ہیں اور سچ مچ اس کی ناک کی ”سنگ بھنگ“ کسے ہوئے تاروں والے سازی کی طرح مبہین اور تیز تھی۔

یہ کافی بے سراغت تھا۔ سفر سے اکتاہٹ اور آہنی سکوت کے شاید احساس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ اس گیت کو جاری رکھا جائے میں سوچتا رہا کہ آخر اس گیت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ کسی نو جوان دیہاتی کے عشق کا گیت ہے کیا یہ کوئی رزمیہ نغمہ ہے اور یہ ”مٹھو گھوڑا“ کون ہے اور بار بار اس سے کیا درخواست کی جارہی ہے۔ کاش اس وقت ویرجی ہوتے۔ وہ امرت دھارا قسم کے انسان جو شیکسپیر کا سن پیدائش اور شلغم کے کیماوی اجزا ایک سانس میں بتا سکتے تھے۔

شاید ”مٹھو گھوڑا“ بہت اڑیل ثابت ہوا اور ان تمام شاعرانہ درخواستوں کو پی گیا جو ساربان نے اس کے حضور گزاری تھیں۔ مٹھو گھوڑے کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر ساربان نے ایک اور گیت شروع کیا جو اگرچہ اسی تیز و تند ”تنغ تنغ“ کی دھن پر اور اسی ٹین کے کنسٹرکی سی آواز میں گایا گیا۔ میرے خیال میں مٹھو گھوڑے کے گیت سے زیادہ معقول اور بامعنی تھا۔

جلد ہی وہ گیت سے بھی تھک گیا اور پھر ایک وقفہ آیا جو بقا کی طرح لمبا اور کائنات کی طرح وسیع تھا اور جو چاندنی اور جنگل کی سائیں سائیں سے لبریز تھا۔ ہم چپ چاپ سفر کرتے رہے۔ ہم ایک مہتاب زدہ ٹیلے پر چڑھتے اور نیچے ایک ترائی کے انجام پر ایک اور مہتاب زدہ ٹیلا ہمارا منظر ہوتا۔ کتابوں کی گٹھڑیوں نے میرے گھٹنوں کا آپریشن کر ڈالا تھا۔ ایک بار ساربان نے مجھ سے پوچھا۔ ”آرام سے بیٹھے ہو سائیں؟“ میں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں کتابوں کی مسلسل نوازشوں کی شکایت کی جسے وہ شاید سمجھ نہ سکا یا میری شکایت کو اس نے اہمیت ہی نہ دی۔ وہ یہ کیسے محسوس کر سکتا تھا بیچارہ کہ کتابوں ایسی بے ضرر چیزیں بھی کبھی کبھی انسان کا جینا اجیرن کر سکتی ہیں۔

ہم ایک جوہڑ کے پاس سے گزرے جو پانی میں مدھم شیشے کی ٹکون معلوم ہو رہا تھا۔ ساربان نے جوہڑ کی طرف عجیب آرزو مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ اس کے کنارے بیٹھ کر کھانا اور کچھ دیر آرام کرنا نہایت موزوں رہے گا۔ اونٹ کی رفتار بھی مدھم ہو گئی مگر مجھے ابھی کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ کتابوں کی گٹھڑیوں کی مسلسل چاند ماری اور ٹانگوں کے اٹینھ جانے کے باوجود میں چاہتا تھا کہ منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کیا جائے۔ ساربان نے اپنی ست رفتاری کا جواب میری خاموشی میں پایا اور مہار تمام کرتیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بڑے گوٹھ کے قریب سے گزرے۔ ہمیں بہت سی گھنٹیوں باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھے گمان سا ہوا کہ سامنے ایک گوٹھ موجود ہے مگر وہ گوٹھ جو میں نے دیکھا سراب آسا تھا۔ چاندنی اور ریت کا ایک فریب جن کا ذکر پہلے کر آیا ہوں۔ یہاں ایک اونچے ریتلے ٹیلے پر جہاں دور اہی آسمان کی طرف رخ کئے مردوں کی طرح بے ہوش پڑے سو رہے تھے۔ میرے ساربان نے ”شو شو“ کر کے اونٹ کو بٹھا دیا۔ اب کے اس نے میری رضامندی ضروری نہیں سمجھی۔ میں مجبوراً اونٹ سے نیچے اتر آیا کیونکہ بیٹھے ہوئے اونٹ پر بیٹھے رہنا عجیب بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں ریت پر چہل قدمی کرتا رہا اور جب خون کی گردش اپنا معمول اختیار کر چکی تو ان خوابیدہ مسافروں کے پاس ریتلے فرش پر بیٹھ گیا۔ ساربان نے اونٹ کو دو چار ٹانڈے پیش کئے اور حجامت کے تھیلے میں سے کھانے کا بنڈل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے ویر جی یاد آ گئے انہوں نے

کافذوں اور فیتوں کی مدد سے اس پیکٹ کو ایک پیشہ ور مٹھائی فروش کی سی چابکدستی سے باندھا تھا۔ گھی میں تلی ہوئی روٹیاں اور انڈے۔ میں نے چھ روٹیاں اور نصف سالن ساربان کے حوالے کر دیا۔ اور اب میں اور میرا اونٹ والا دو پرانے ہجولیوں کی طرح اکٹھے بیٹھے کھانا کھانے لگے۔ اونٹ جواب مجھے بڑا نظر آ رہا تھا، راستے کے آ پار بیٹھا جگالی کر رہا تھا، اپنے دو انسان دوستوں کو مکمل بے اعتنائی سے دیکھ رہا تھا۔ ہم گھوڑوں کی طرح کھاتے رہے۔ کسی انسان کو کھانا اتنا لذیذ نہیں معلوم ہوا ہوگا جتنا یہ دنیا کے بدترین باورچی کا تیار کردہ سالن اور موٹی موٹی روٹیاں۔ مگر یہ کھانا ہم نے ڈائمنگ روم کے تکلفات میں گھر کر نہ کھایا تھا۔ خدا کے کھلے گھر کے کھلے آگن میں ازلی ریت کی چاندنی پر بیٹھ کر اور دور گھنٹیوں کی مٹنناہٹوں کو سنتے ہوئے ہم نے یہ دعوت اڑائی تھی۔

میں نے ساربان کو دو اور روٹیاں دیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب اسے کچھ اور دینے کی کوشش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ اب تین روٹیاں بچ رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر میں نے انہیں ساربان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”اٹ“ اور اونٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میری تجویز یہ تھی کہ اس دعوت میں اونٹ کو بھی حصہ دار بنانا چاہیے۔ ساربان نے جواب میں ”بس“ کہا۔ مجھ سے روٹیاں لے لیں اور میری یہ حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس نے ان کا ایک گولا سا بنایا اور انہیں خود ہی کھانے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں تینوں روٹیاں اس کے مبارک پیٹ میں تھیں۔

اب سوال پیدا ہوا پانی کا۔ میں بہت پیاسا تھا ٹوٹی پھوٹی سندھی میں میں نے کہا۔ ”پانی دٹھے“ یعنی چاہیے۔ اس نے جواب دیا۔ ”نہ پانی نہ دٹھے“ چھائیوں دٹھے“ اور مبہم طریقے پر نیچے اشارہ کیا۔ اس نے ایک لمبی تقریر کی جس میں بیوں اور چھائیوں کے الفاظ بار بار آتے تھے۔ میرا ساربان ایک خوبصورت گھبراٹا لڑکا تھا۔ اس کی آواز رسیلی اور راگوں سے لبریز تھی اور میں سوچنے لگا کہ وہ اپنی اصلی آواز میں گانے کی بجائے اس باریک غیر قدرتی آواز میں گانا کیوں پسند کرتا ہے۔ حسن کی طرح موسیقی کے بھی کتنے بے شمار معیار ہیں۔

اس نے کہا ”ہیلو سائیں“ کھانے کے بعد وہ زیادہ مودب اور ممنون نظر آ رہا تھا۔ ہم اونٹ پر سوار ہوئے اور نیچے ترائی میں اتر گئے۔ ہمارے بائیں طرف ایک بنی تھی ساربان اونٹ کو آہستہ آہستہ چلاتا، ایک طرف جھک کر پھیلی ہوئی بیلوں اور باجرے میں کسی چھائی کی تلاش میں تھا ایک جگہ اس نے اونٹ کو روک لیا۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ وہ بنی میں گھس گیا اور بازوؤں اور کہنیوں تلے پانچ چھ بنیاں دبائے کچھ دیر بعد واپس آ گیا۔ ہم دونوں وٹ (راستہ کے کنارے) پر بیٹھ گئے اسی طرح گاؤں کے دور فیتوں کی طرح۔ چھائیاں ہمارے سامنے تھیں وہ ان کو توڑ کر زمین پر رکھتا اور میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتا۔ ہم نے انہیں کھا کر اور ان کا میٹھا اور ٹھنڈا

رس چوس اور پی کر اپنی پیاس بجھائی۔

تھوڑی دور جا کر ہم نے تیس پینتیس اونٹوں کے ایک قافلے کو جالیا۔ مجھے اونٹوں کی وہ قطار کچھ عجیب سحر آمیز طریق پر علی بابا کی کہانی کے چالیس چوروں کی طرح معلوم ہوئی۔ اونٹ چڑے کے بڑے بڑے منکوں سے لدے ہوئے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان میں گھی ہے مگر مجھے یقین تھا کہ ان میں گھی ایسی عام اور غیر رومانی پلمبی چیز نہیں ہو سکتی۔ گھی سے تو زیتون کا تیل زیادہ رومانی ہے میرے نزدیک تو ان منکوں میں خود چالیس چور ہی چھپے بیٹھے تھے۔ اور ان کا سردار تیل کے ایک سوداگر کے بھیس میں ان کو علی بابا کے گھر انتقام لینے کی خاطر منکوں میں چھپا کر لیے جا رہا تھا۔ ڈاکو یا نظر بظاہر ساربان بڑے خوش باش قسم کے بے فکرے معلوم ہوتے تھے وہ اچھلتے ناچتے اور گاتے جا رہے تھے۔ میرا ساربان ان میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔ خاص کر ایک بکرے کی داڑھی والا پھرتیلا سا آدمی جو ایک چلاوے کی طرح فریب دہ تھا میرے ساربان کا کوئی گہرا لنگوٹیا نکلا۔ ساربان نے اس سے کئی باتیں کیں۔ پھر ہم قافلے سے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کسی کو اپنے سامنے ایک خرگوش کی طرح بھاگتے ایک بنی میں گھستے دیکھا۔ یہ وہی بکر داڑھی چھلاوہ تھا۔ وہ اب بنی میں جھکا چھائیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ میرے ساربان نے بھی اس موقع کو نفیس سمجھا اور پھر ہماری پیاس بھی تو ابھی پوری طرح نہیں بجھی تھی۔ وہ بہت سی چھائیاں اکٹھی کر لایا۔ اور پھر سے دعوت اڑائی گئی۔ اسی اثناء میں چالیس چور ہم سے آگے نکل گئے۔ فارغ ہو کر ہم نے پھر قافلے کو جالیا۔ اب کے ساربان نے شاید گیمیں ہانکنے کے شوق میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی اور مجھے چالیس چوروں کی قطار میں شامل کر کے ساربانوں سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے سختی سے حکم دیا کہ وہ آگے نکل جائے۔ قافلے کو تو وہ میرے کہنے پر پیچھے چھوڑ آیا مگر اب اس کے انداز میں وہ جتنی غائب تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف قافلے سے آگے نکلا ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد ہم نے اس عجیب سی داڑھی والے شخص کو (جس کا نام عمر تھا) صرف ایک لنگوٹا کے زمین پر چت مردے کی مانند پڑا ہوا پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھوت کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور عجیب چہلیں کرتا ہمارے آگے آگے بھاگنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ عمر ایک نہایت کامیاب درباری مسخرا یا سینما کامیڈین ہو سکتا ہے۔ آخر میرے ”جلدی جلدی“ کی رٹ لگانے پر میرے ساربان نے بڑی بے دلی سے اپنے دوست عمر سے مفارقت گوارا کی اور ہم قافلے سے بہت آگے نکل آئے۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساربان نے اونٹ کو تیز چلانے اور نوں کوٹ پہنچنے کے ارادہ کو فی الحال ملتوی کر رکھا ہے اور دوسرے معاملات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ ممنونیت جو کھانا کھا لینے کے کچھ دیر بعد تک اس کے بشرے اور اس کی حرکات میں نمایاں رہی غائب ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کئے جا رہا تھا۔ ایک گستاخانہ اطمینان سے (کم از کم مجھے یہ ایک گستاخی ہی

نظر آئی) وہ اونٹ کے ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا بیویوں کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بد معاش! کیا اب تک چھائیاں اس کے خیالوں میں بس رہی ہیں؟ کم از کم مجھے تو اب چھائیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، میں فوراً انوں کوٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ اونٹ کو باجرے کے ایک کھیت میں لے گیا۔ کھیت کے عین وسط میں اسے بٹھا کر کہیں سے درختی نکالی اور کندھے پر پڑی چادر کو ہاتھ میں لیتا کھیت کے گنجان حصے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹانڈوں کا ایک بہت بڑا گٹھا باندھ لایا، اور اونٹ کے سامنے ڈال دیا۔ اونٹ نے اس انبار میں سے ایک ٹانڈا منتخب کر کے اسے کاغذ کے فیتے کھانے والے مداری کی طرح نگلنا شروع کر دیا۔ ساربان ایک مرتبہ پھر کھیت میں گھسا اور پہلے سے بھی بڑا گٹھا باندھ لایا۔ میرے دل میں ساربان کے خلاف ایک خاموش غصے کی آگ سلگ رہی تھی۔ دیر کر رہا ہے۔ کم بخت مگر ساتھ ہی میرے دل میں اس شخص کے لیے تحسین کے جذبات بھی تھے، قطع نظر اس بات کے کہ باجرے کا کھیت اس کا نہیں تھا اور ٹانڈوں کے یہ دو گٹھے قانون کے دو جنازے تھے۔ یہ شخص اپنے کام اور پیشے میں مجھ سے زیادہ مستعد تھا اور پھر اس کو اپنے جانور کا کتنا خیال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اونٹ کو گالی بھی دیتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ چڑھائی پر جاتے جاتے اچانک رک کر اپنے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو پھڑ پھڑاتا یا وٹ سے ہٹ کر بیویں میں جانے کی کوشش کرتا۔ اس کی گالی کی لغت لفظ ”دلا“ تک محدود تھی، اگر اس لفظ کا سندھی میں وہی مطلب ہے جو ہماری پنجابی میں ہے تو اونٹ کے لیے یہ عجیب سی گالی ہے۔ لیکن اگر گالی میں مہذب ہونے کی گنجائش ہے تو یہ گالی پنجابی کی دوسری گالیوں کے مقابلے میں واقعی نرم اور مہذب تھی۔ اس گالی کے باوجود ساربان اپنے اونٹ کو اپنے بیٹے یا بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ عرب کی محبت اپنے گھوڑے سے ایک تھری یا بلوچ کی محبت اپنے اونٹ سے یہ میری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہم میں سے شاید کسی نے وہ مشہور انگریزی نظم

"An Arabs Farewel to His Horse"

نہیں پڑھی اور اس سے متاثر نہیں ہوا۔ میں نے خود ایک آدمی کو (مگر صرف پردہ سیمیں پر) کمال سنجیدگی سے اس بات کا اقرار کرتے سنا ہے کہ ”گھوڑا میرا بہترین دوست ہے۔“

مجھے اعتراف ہے کہ میں حیوانات سے رفاقت اور قربت کا اتنا بلند بانگ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جوانوں نے مجھ سے ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے اور تین حیوانوں نے (جن میں ایک بلا تھا اور دو گھوڑے) جن کی طرف میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا، میرے جذبات حیوان کے درمیان ایک Understanding پر مبنی ہے یا صرف رواج، فیشن اور خود نمائی کے جذبے پر!

اب کئی لوگ ہیں۔ اور ان میں شاید بوڑھا شیکسپیر بھی ہے جو آپ کو بتائیں گے کہ گھوڑا ایک شریف الطبع اور وفادار جانور ہے۔

گھوڑے کی عظمت کا یہ جہانگیر ہمہ دراصل انہی ادیب لوگوں کی عبارت آرائیوں کا نتیجہ ہے جو خود کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے۔ مجھے واللہ گھوڑے کی ذات سے کوئی پر خاش نہیں، مگر میں نے ان آنکھوں سے کئی گھوڑے دیکھے ہیں جن میں حلم اور وفا کا نام تک نہیں ہوتا۔ گھوڑوں سے میرے مراسم دیرینہ اور فرسٹ ہینڈ ہیں یعنی میں نے خود گھوڑے کی سواری کی ہے۔ گھوڑوں کی تعریف کرنے والوں میں سے ایک شیکسپیر ہی کو لیجئے، اس بے چارے کو تو کبھی گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ اس کی قسمت میں تو فقط گلوب تھیٹر کے باہر امراء کے گھوڑوں کی لگا میں تھا منا ہی لکھا تھا۔ ایسے شخص کو بھلا اس حیوان کی نفسیات اور خصائل کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ مسٹر ولیم شیکسپیر کے بعد ہمارے دوست مسٹر جان گلکسن سے پوچھئے، جو ایک مغرور اور کاروباری شخص تھا، اور جسے ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پلنگ پر جانا پڑا تھا۔

یہ مذاق نہیں میں کمال سنجیدگی سے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ یہ غلط خیال ہے کہ ایک کتا یا ایک گھوڑا یا ایک بندر انسان کا انسان سے بہتر منس و غنور ہو سکتا ہے۔ جو لوگ مویشیوں کی بریڈنگ اور سیوا کرتے ہیں یا وہ لوگ جو مرغیوں کی فارمنگ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں کچھ عرصے بعد صرف مویشیوں اور مرغیوں ہی کی سوسائٹی کے لائق رہ جاتے ہیں۔ خود ڈیپلو میں دو تین آدمی ایسے ہیں جن سے مجھے اور ڈاکٹر کو ایک مستقل شکایت ہے۔ ایک تو وہ ہیڈ ماسٹر منشی جن کا ذکر آچکا ہے اور دوسرا پوسٹ ماسٹر، دونوں مویشیوں کے سرگرم پالنہار ہیں۔ ڈاکٹر انہیں ہمیشہ مذاقا اور طنزاً Cattle Breeders کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ دونوں معقول انسانوں کی صحبت پر حیوانوں کی صحبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی گائے بھینس یا بکری کی صحبت میں ہوتے ہیں تو زیادہ خوش اور At Home محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ برہنہ سر برہنہ پا اپنی مجبوریوں کے پیچھے ”لکھی لکھی“ ”ساوی ساوی“ پکارتے ہوئے بھاگتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی روشنی آ جاتی ہے یہی وہ لمحے ہیں جب وہ صحیح زندگی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

پھر بھی جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں بلوچ کی اپنے اونٹ سے محبت کو سمجھ سکتا ہوں اور اتنی محبت کر بھی سکتا ہوں۔ صحراؤں میں بھی مسافتیں بے کنار تنہائیاں جن سے ساربانوں کو دو چار ہونا پڑتا ہے انسان اور حیوان میں ایک جذبہ رفاقت ایک Cowraderie پیدا کر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اونٹ غالباً اس بلوچ کی عزیز ترین متاع ہے وہ اپنے مالک کے لیے کماتا ہے۔ اس قسم کی محبت ایک قلندر کو اپنے بندر اور ایک مچھنڈر کو اپنے رچھ سے ہو جاتی ہے اور شاید بعض حیوانوں کی رو میں انسانوں سے زیادہ سچی اور بے داغ ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایک حیوان شکر گزار نہیں ہوتا تو ہم کسی صورت میں اسے ناشکرا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اور انسانوں کی اکثریت ناشکروں پر مشتمل ہے۔ ناشکر گزاری جو بوڑھے شیکسپیر کے الفاظ میں انسان کو سرما کی برفانی سانپوں کی طرح کاٹتی ہے اور

اسے انسانوں کو چھوڑ کر حیوانوں کی محبت تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ معترضہ جملہ ڈیلپو سے نوں کوٹ تک کی مسافت اتنا طویل ہو گیا ہے۔ ساربان نے گٹھوں کو اپنی نشست پر جمایا اور پھر ان پر چڑھ بیٹھا اور ہم نے اپنا سفر جاری کیا۔ گھنٹیوں اور انسانوں کی آواز نے ہمیں بتایا کہ اونٹوں کا قافلہ پھر ہم سے آگے نکل گیا ہے مگر اب ساربان اس قافلے کو جالینے اور اپنے لنگوٹے عمر سے گپیں ہانکنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب ہمیں وٹ پر پڑاؤ ڈال دینا چاہیے تاکہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ اس دوران میں اس کا اونٹ باجرہ چلے گا اور پھر ہم صبح ہونے سے پیشتر چل پڑیں گے۔

لیکن وٹ پر کون سونے! میں نے تو ڈیلپو ہی میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں وٹ پر قطعی نہیں سوؤں گا۔ میں سانپوں سے ڈرتا ہوں، ہر صحیح ان خیال انسان کو سانپوں سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میری صحیح ان خیالی ذرا شدید قسم کی ہے اور ڈاکٹر نے بوقت روانگی مجھے خاص ہدایت کی تھی کہ تھر کا یہ صحرا صحیح معنوں میں سانپوں کی نگری ہے۔ ان سانپوں میں سب سے زیادہ دہشت ناک ”ساہ پیوں“ (سانس پی جانے والا) ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ رات کو سونے والے کی چار پائی پر چڑھ جاتا ہے اور اس کی چھاتی پر ریٹنا شروع کر دیتا ہے اور اپنا منہ اس کے ہونٹوں پر اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے کوئی اپنے محبوب کا بوسہ لے لے اس بوسے میں موت ہے۔ سانپ سونے والے کی منہ میں زہر چکا دیتا ہے جس سے اس کے حلق کی رگیں کھج جاتی ہیں اور اس کی سانس گٹھے لگتی ہے۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ہاتھ پیر شل ہو جاتے ہیں اور زندگی گل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ سانپ دراصل فرضی اور خیالی ہے۔ اس کا وجود افسانوی ہو یا حقیقی اس کے طفیل تھر کے لوگ ایک مستقل دہشت اور خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر چار پانچ آدمیوں کے مجمع میں ایک مرتبہ ”ساہ پیوں“ کا ذکر چھڑ جائے تو بہت دیر تک گفتگو کا موضوع یہی سانپ رہے گا اور اس کے متعلق عجیب و غریب طوفانی اور انکل پچو کہانیاں سنائی جائیں گی۔

ڈاکٹر سے ملاقات سے قبل میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے ڈرنے والا انسان روئے زمین پر کوئی نہ ہوگا۔ میرے خوابوں کے بدترین کا بوس وہ ہوتے تھے جن میں سانپ کوڑیا لے دھبوں والے بھورے اور نیلے سانپ۔ میری طرف ریگتے ہوئے آتے تھے۔ صرف ریگتے ہوئے (مجھے اب تک کوئی ایسا خواب یاد نہیں جس میں سانپ نے مجھے کاٹا ہو) میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان بزدل آدمیوں میں سے ہوں جن کو خدا نے یہ کیڑا مارنے کی توفیق و دیعت نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر سے مل کر مجھے گونہ تسلی اور تسکین ہوئی کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی رات کے وقت (خواہ وہ چاندنی رات ہی کیوں نہ ہو) نارچ کے بغیر گھر

سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ اس نے مجھے اپنے پیشرو ڈاکٹر کے متعلق بتایا کہ اگر رات کو اسے کہیں باہر جانا ہوتا تو شام سے صبح تک اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا اور پانی پینے یا کسی اور ضرورت سے بھی نیچے اترنے سے ہچکچاتا بلکہ اونٹ کو بھی سانپوں کے ڈر کے مارے بیٹھنے تک نہ دیتا۔

ساربان اونٹ کو اونٹ کے ایک طرف لے گیا جہاں جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی ریتلی جگہ تھی۔ اونٹ کو بٹھایا گیا۔ ساربان نے میرے لیے اونٹ کی گلیم نیچے بچھادی مگر میں کچھ دیر سانپوں کے متعلق سوچتا ہوا کھڑا رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں لیٹ تو رہوں گا مگر سوؤں گا نہیں اور اس جھاڑی کی طرف رخ کر کے لیٹوں گا جو گلیم کے بالکل قریب ہے۔ نیند کے مارے میرا برا حال تھا۔ پر بستر بچھا کر میں پتلون اور بوٹوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تو کہنی پر سر رکھے میں چاندنی میں لسکتی ہوئی جھاڑی کو دیکھتا رہا پھر ننھے ننھے چھجھروں نے میری توجہ کلیتا اپنی طرف مبذول کر لی۔ باجرے کے کھیت سے ہم اپنے ساتھ چھجھروں کی ایک بڑی فوج لے آئے تھے۔ جو اب میرے سر کے گرد بال کے ایک ٹکڑے کی طرح منڈلا رہی تھی۔ یہ چھجھر سننا تے ہوئے میرے چہرے پر Land کرنے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے مجھے کاٹا بھی مگر ان کی کاٹ ننھی اور غیر محسوس تھی پھر بھی ان میں ٹنگ کرنے اور ستانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ جذبہ انتقام سے مجبور ہو کر میں نے چادر اوڑھ لی۔ چھوٹے چھجھر یقیناً جھنجھلائے ہوں گے۔ کچھ مایوس بھی ہوئے ہوں گے کہ ان کے شکار نے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے یوں ستیہ گرہ کی ٹھان لی۔ کچھ دیر میں اپنے اوپر ان کی غصیلی شنشناہٹ سننا رہا اور پھر وہ مجھے چھوڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں میں جا ملے جو اونٹ اور شتربان پر بلا روک ٹوک بغیر کسی نوع کی مزاحمت کے نہایت اچھا وقت گزار رہے تھے۔

میں نے سنا ہے کہ اونٹ ان ننھے صحرائی چھجھروں کا بہشت ہے۔ شاید اونٹ کے جسم کی مخصوص بو انہیں بھاتی ہے یا وہ اس کی بے بسی اور بیچارگی کو پہچان چکے ہیں۔ ادھر وہ اونٹ کو دیکھتے ہیں۔ ادھر ان کا ٹڈی دل حملہ آور ہوتا ہے اور اتنے بڑے ”رتاؤر“ کو بے حال کر دیتا ہے۔ میں نے کئی بار ڈیپلو میں گاؤں کے باہر چراگاہ میں ساربانوں کو دیکھا ہے جو اپنے اونٹوں کو ”دھواں“ دیتے ہیں۔ دھواں تو شاملات کے میدان پر شام کے وقت ایک کہر کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اول اول دھواں دینے کا عمل مجھے مضحکہ خیز معلوم ہوا تھا۔ میرے وہی دماغ نے تصور کیا کہ یہ دھواں اونٹوں کے لیے شاید اتنا ہی سکون بخش ہے جیسے تمباکو انسان کے اعصاب کے لیے مگر بعد میں ڈاکٹر سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ چھجھروں کو بھگانے کا حربہ ہے اور نہایت کامیاب حربہ ہے۔ ”باوجود اس کے اگر آپ پہلی مرتبہ اونٹ کو دھواں دیا جاتا“ ہوا دیکھیں تو اس رسم کا انوکھا پن آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لائے بغیر نہیں رہے گا۔

مجھے یاد نہیں کہ کس وقت سویا۔ نیند ایک چور کی طرح آئی اور میں اس ٹھنڈی سپید چاندنی اور دور سے آتی ہوئی مدہم ٹنٹناہٹوں کی دنیا سے چپ چاپ ایک خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ مگر اس دنیا میں بھی چاندنی کی لو اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دیتی رہی البتہ وہاں سانپ نہیں تھے۔ ایک مرتبہ میری آنکھ کھلی۔ شتر بان اپنے اونٹ کو باجرے کے ٹانڈے کھلا رہا تھا۔ اونٹ کا منہ چارہ کاٹنے والی مشین کے مشابہ تھا جس میں لمبے لمبے ٹانڈے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میرے ذہن پر سانپ ریگنے لگے۔ میں بستر میں دبک کر سسکتی ہوئی جھاڑی کو ٹکلی باندھے دیکھتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب میں اٹھا تو پو پھٹ رہی تھی چاند کی سفید ٹکیہ اسی طرح چمک رہی تھی۔ ستارے بھی اسی طرح چمکیلے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ان کی لو میں پھیکے پن کا گمان سا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے طبعاً محسوس کیا کہ میں نے آخر کار رات کو صبح کے ڈر سے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ عناصر کی تمام کروٹوں میں سے یہی ایک کروٹ مجھے سب سے زیادہ دل آویز اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لمحے کی شیرینی صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو گھروں کی چار دیواریوں کے باہر کھلی فضاؤں میں راتیں بسر کرنے کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ کیا کنجوس کروڑ پتی کا سارا سونا اس ایک پل کا بدل ہو سکتا ہے۔ جب اشجار اور جھاڑیاں ایک نئی سانس لیتی ہیں اور کائنات ایک انگڑائی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لمحے کی تاثر آفرینی کو صرف شاعروں اور مصوروں، عاشقوں اور سیاحوں نے محسوس کیا ہے اور ہمارے ہندوستان میں جوش نے محسوس کیا ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے

اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھے

میں نے دور کسی گاؤں سے مرنے کی بانگ سنی۔ پھر موسیٰ یوں کی گھنٹیوں کی آوازیں پھر مدہم، بہت مدہم کسی دہقان موذن کی اذان میرے کانوں میں آئی۔ جیسے کوئی آواز دے رہا ہو۔ اس کائنات کے رکھوالے کو اور کہہ رہا ہو کہ اس لمحے کو ابدی بنا دے۔ اس طلسم کو قائم رکھ اے خدا اے خدا۔

مگر یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ دھند پر اجالا غائب ہونے لگا۔ خدا کب سے سنے گا انسان کی فریادیں، مستجاب الدعوات کے دربار میں یہ ننھی منی معصوم دعائیں کب بار پاسکیں گی؟

رات بھر کا تھکا ہارا ساربان لٹھ کی طرح سو رہا تھا اور اس کا اونٹ ابوالہول کی طرح ماورائے فہم ادراک، ایک عجیب مخفی اور ڈھکے چھپے انداز میں بیٹھا جگلی کر رہا تھا۔ اگر کوئی حیوان مشین کی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے اس سے زیادہ مطمئن، بے

اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں! اسے غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا تاہم یہ ایک ناقابل تصور مقدار نگل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر دیر تک بیٹھے رہنا اس کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں) ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہنا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت برداشت اور لاابالیانہ پن نہیں جتنا اونٹ میں۔ اور اگر اسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی کبھی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!

میں اب بہت جلد روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ساربان کو کچھ دیر سونے دیا۔ جب سورج کی خون آلود آنکھ جھاڑیوں کے اوپر مشرقی افق پر سے جھانکنے لگی تو میں نے اسے جگایا۔ اٹھتے ہی فوراً اونٹ پر پا کھڑا رکھا اور چند ہی منٹ میں تیار ہو کر ہم روانہ ہو پڑے۔ ہماری رفتار خاصی تھی، میں ساربان کی طرح ایک طرف ناگلیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ میرے خیال میں اونٹ پر بیٹھنے کا یہ سب سے آرام دہ طریقہ ہے۔

اب ہم خدا کی جاگی ہوئی گلابی دنیا سے گزر رہے تھے۔ پرندے ہوا میں کلاکاریاں مارتے اور چہچہاتے، ہمارے سرد دیکھتے ہوئے درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے چھو جاتے۔ ایک درخت کے نیچے سے گزرتے وقت ایک شیریشاخ نے میری سبز فلٹ کر میرے سر پر سے اچک لیا۔ شاید پتوں میں چھپا ہوا اور انسانی آنکھوں سے پوشیدہ کوئی ایریل (Ariel) یا پک (Puck) مسافروں کو ستانے کے لیے بیٹھا تھا اور یہ اسی کی کارستانی تھی۔ میری سبز فلٹ کانٹے دار شاخ میں الجھی ہوئی تھی۔ ساربان اونٹ کو واپس درخت تلے لایا اور میں نے بڑی مشکل سے اسے پک کی انگلیوں سے چھڑایا۔ اب میں نے ننگے سر بیٹھنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ درخت شہر اتوں اور چھپڑوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ کچھ دیر تک اسی طرح جاری رہا مگر تقریباً دو گھنٹوں کے بعد پہاڑیاں پست اور کم ڈھلائی ہونے لگیں! اب ہم ان تھری پہاڑیوں کی دم پر پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل مختلف اور نئی زمین تھی۔ یہاں سے وہاں تک W کی شکل کی تھوہر کی جھاڑیوں سے ڈھنی ہوئی تھوہر کی اکا دکا جھاڑیاں ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھیں مگر اس جگہ ان کی راجدھانی تھی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تھوہر کی جھاڑی کوئی خوبصورت چیز نہیں مگر یہاں اس انبوہ تھوہر حسین اور پر شکوہ معلوم ہونے لگی تھی۔

اب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے، یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گزرے، جس کے حاشے پر شاندار درخت ایک

زمر دیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً پہلا منظر تھا جس نے پہاڑوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے باغ ارم کی طرح مہک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔

ہم ایک چھوٹی نہر کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر سے گزرے جہاں صحرائی سروٹوں کی ایک رجنٹ کی رجنٹ ہماری سلامی کے لیے قطار باندھے کھڑی تھی۔ لمبے صحرائی سروٹ جن کی نرم ریشمیں جھالریں ہوا کی تھکیوں سے جھکی پڑتی تھیں، کتنے خوبصورت لگ رہے تھے وہ سروٹ۔ اور وہ پہلے پھولوں والا اکیلا کیکر نازنین سروٹوں کے درمیان۔ ایستادہ پتوں میں صبح کا سونا لیے۔ کیا آپ نے بھی اس سے حسین چیز دیکھی ہے؟

مجھے ہر چیز حسین اور انوکھی معلوم ہو رہی تھی شاید اس لیے کہ میں ایک تھکا دینے والے تسلسل کے بعد ایک خوشگوار تغیر سے دوچار ہو رہا تھا یا شاید اس لیے کہ یہ صبح گلابی اور سنہری تھی اور پرندے ہوا میں ناچ اور گارہے تھے یا شاید اس لیے کہ میں اب اس ابدی سفر کے خاتمے پر تھا۔

وہاں سے ہم ایک ”نابالغ نہر“ کے کنارے کنارے ہو لیے۔ میں نے یہاں سے پہلی بار نوں کوٹ کے قصبہ اور اس سے پرے ریلوے اسٹیشن کا نظارہ کیا۔ اسٹیشن تنہا اور خاموش قصبے سے دور پڑا تھا، ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح۔ یہی ننھا سا اسٹیشن Eldorado تھا۔ وہ منزل جس تک پہنچنے کے لیے لوگ کئی برسوں کے جاں جو کھم سفر کرتے ہیں۔ یہ میرا جادو کا قالین تھا اور میں ابھی سے اس سبز انجن والی چھوٹی ریل گاڑی کے متعلق سوچنے لگا جو دو گھنٹے کے بعد چٹھاتی ہوئی مجھے اٹھالے جانے کے لیے اس اسٹیشن پر ٹھہرے گی۔

نووں کوٹ تک پہنچنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ نہر کا پل دور تھا اور اس کو عبور کرنے کے بعد ہمیں اٹنے پاؤں پلٹنا پڑا۔ نوں کوٹ کا قصبہ بالکل ایک مربیع کی صورت میں تھا۔ اور بیسویں صدی کے ایک جدید شہر کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا کسی ناقابل فہم عمل سے اصل شہر سے علیحدہ ہو گیا اور علیحدگی کے اس سلسلے میں پرانا، شکستہ اور بوسیدہ ہو گیا ہو۔ یہ ان بد نصیب قصبوں میں سے ہے جسے اسٹیشن سے دور رہنے والے لوگ شہر سمجھتے ہیں۔ مگر جنہیں اپنی کم مائیگی کا پورا علم اور احساس ہوتا ہے اور جو اپنا سر شرم کے مارے ہمیشہ جھکائے رکھتے ہیں۔ نوں کوٹ کے پاس تھکے ماندے مسافر کے لیے کوئی مسکراہٹ نہیں، کوئی تبسم نہیں۔ محض ایک جذبات سے عاری نظر ہے

اچنتی ہوئی اور پھینکی پھینکی۔ گھر تھوڑے بد صورت اور بے لطف ہیں اور وہ خانہ بدوش بھی (میں خانہ بدوش سے محبت کرتا ہوں) جو اپنے خیموں اور عجیب وضع کی نیل گاڑیوں اور اپنے پیشے کے رنگ آلود اوزاروں کے ساتھ شہر کے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں گدھوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں جو شہر کی لگتی سڑتی لاش کے پنجر پر دعوت اڑانے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔

ہم دو تین ہوٹلوں کے پاس سے گزرے جن میں سے ایک پنجابی بوآ رہی تھی۔ وہ ان غلیظ شوریدہ اور کھلے ہوٹلوں میں سے تھے جن میں کھانے کے علاوہ مسافروں کو چار پائیاں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور جن کے تمام مشروبات و ماکولات کا ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے اور جن میں بڑے بڑے ترموں والے گراموفون دن رات گلا پھاڑ پھاڑ کر ریگلتے رہتے ہیں۔ سننے اور سنانے والوں کے لیے یہ امر کسی طرح قابل لحاظ نہیں ہوتا کہ کون سا ریکارڈ بجایا جا رہا ہے خواہ نیچ ملک گائے یا کالوقوال (مع پارٹی) سننے والے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ وہ صرف پاگل کر دینے والا شور سنے گا۔ پنجابیوں کو ایسے خوفناک ہوٹل کھولنے کا سلیقہ ہے جس ہوٹل کا گراموفون یا لاؤڈ سپیکر جتنا ہی زیادہ اونچا اور شوریدہ ہوگا اتنے ہی زیادہ گاہک ادھر کھپے چلے آئیں گے۔

ہم ہوٹلوں کے پاس سے گزرے خانہ بدوشوں کے خیموں کے پاس سے گزرے جنوں کوٹ اتنے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ حکومت کے مسافر خانے کے پاس سے گزرتے ریلوے اسٹیشن کے سامنے جا کر ہم اترے۔ اسٹیشن کے مسافر خانے میں صرف ایک شخص کھڑا تھا اور وہ شخص ٹکٹ کلکٹر کے پھانگ پر سے مجھے کچھ مثبت اور محتاط متجسس آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی موچھیں لمبی اور بالکل سیدھی اور کیلی تھیں اور ایک دوسرے سے 180 ڈگری کا زاویہ بنا رہی تھیں۔ خط مستقیم سمجھے لیکن ”خط“ سے موچھوں کے پھیلاؤ پر حرف آتا ہے۔

اب جب سے میں نے ہردوار میں ”لہری سوار“ یا اس قسم کی کسی فلم میں (جسے فضل بکڈ پو کے کسی جاسوسی سنسنی خیز ناول کا فلم ورژن کہا جاسکتا ہے) ایک سیدھی اور کیلی موچھوں والے ”لن“ کو دیکھا ہے مجھے سیدھی اور نوکدار موچھوں والوں کے متعلق ایک بدگمانی سی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل بے ضرر اور شریف آدمی ہوں اور اتنے سادے جتنی ان کی موچھیں مگر مجھے تو وہ چور اور جیب کترے اور ٹھگ اور خونخوئی معلوم ہوتے ہیں میں ایک سیدھی اور نوکدار موچھوں والے آدمی کے ساتھ کسی اندھیری رات کو اپنے گھر سے دس قدم زیادہ دور جانے سے ہچکچاؤں گا اور پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ اس قسم کی موچھوں والوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے وہی لال آنکھیں اور موٹی ناک اور ہونٹوں کے گوشوں میں چمٹی ہوئی گالیاں۔ مسافر خانے کا تن تنہا ”باشندہ“ مجھے عین مین لہری سوار کا شاندار اور پراسرار ولن لگ رہا تھا۔

ساربان نے میرا بستر اور کتابوں کی گٹھڑیاں اٹھا کر مسافر خانے میں پہنچا دیں۔ وہ نیچے فرش پر رکھنے لگا تھا۔ مگر لہری سوار کے ولن نے ایک میزبانہ خوش خلقی سے سامان کو پتھر کے بیچ پر رکھنے کے لیے کہا۔ ایک پر اسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں دبکی ہوئی تھی۔

میں نے ساربان کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ گٹھڑی کھول کر کتابیں نکال لیں اور ان کو بستر میں باندھ دیا۔ وہ شخص مجھ میں اور میرے سامان میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔ شاید میں اس کے لیے ایک معمہ تھا۔ آخر جب بستر باندھ کر میں نے اس سے وقت پوچھا تو وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بھاگا۔ ”ٹھہریے میں دیکھ کر آتا ہوں“ واپس آ کر بولا ”ابھی گاڑی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے گی۔ آپ شہر میں کچھ کھاپی آئیے۔ میں آپ کے سامان کا خیال رکھوں گا۔“

مگر میں بچہ نہیں تھا اور لہری سوار فلم میں اس کی چالبازیاں اور کرتوت دیکھ چکا تھا۔ میں ایک برتری کے انداز میں مسکرایا جس طرح ایسے موقعوں پر مسٹر شرلاک ہومز مسکراتا ہوگا۔

شہر جانے کے ارادے کو فی الحال ملتوی کر کے میں پتھر کے بیچ پر بیٹھ کر کیٹس کی سوانح حیات پڑھنے لگا۔

Our Adonais has Drunk Poison, Oh!



معلوماتی کتابچہ (بچوں کے لیے)

پیارے بچو! مدت سے ہمارا قومی ترانہ نہیں تھا۔ اس کمی کی وجہ سے دل ملول رہتے تھے۔ ہم سر اٹھا کر چل سکنے کے لائق نہ تھے۔ افغانستان کا قومی ترانہ تھا، تبت کا قومی ترانہ اور تو اور بوڈالینڈ کے مردم خوروں کا قومی ترانہ تھا۔ ایک قومی ترانہ نہیں تھا تو ہمارا۔ یہ تو تم کو غالباً معلوم ہی ہوگا کہ باعزت ملک اور خوراک کپڑے کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر قومی ترانے کے بغیر ہرگز نہیں۔

الحمد للہ۔ اب ہماری حکومت نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اب اس نے ہمیں پانچ ہزار روپے کی لاگت سے ایک قومی ترانہ تیار کرا دیا ہے۔ بچو اسے اونچے سر میں پھینچھڑوں کے زور سے گاؤ اور خدا کا شکر بجالاؤ۔ جانتے ہو یہ کس زبان میں ہے؟ یہ ہماری مادری زبان عربی میں ہے۔ اس میں اردو کے چار الفاظ بھی ہیں۔ (ان الفاظ کی فہرست بناؤ)

قومی ترانے کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تم بڑے ہو کر منشی فاضل کی سند لو گے تو یہ ترانہ خود بخود تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ ابھی تمہارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ اس ترانے کا ایک ایک بول سونے میں تولنے کے لائق ہے اور اسے ایک بار پڑھنے کے بعد ہی خدائے ذوالجلال کی شان آشکار ہو جاتی ہے۔

جمہوریت

بچو! آج کل جمہوریت کا زمانہ ہے۔ جس کو دیکھو دیوبی کے نظارہ حسن میں مست ہے۔ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ جمہوریت کس کو کہتے ہیں؟ ایک دانائے فرنگ نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ جمہوریت بعض آدمیوں کی حکومت ہوتی ہے جسے بعض آدمیوں کے فائدے کے لیے چلاتے ہیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے ملک میں بھی جمہوری نظام رائج ہے۔ ہمارے حاکم منتخب شدہ ہیں یعنی انہوں نے ایک دوسرے کا انتخاب کیا ہے وہ سب بڑے مزے میں ہیں۔ ان سے پوچھو تو وہ جمہوریت کے فوائد بتاتے نہیں ٹھکیں گے۔

بچو! جمہوریت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بڑا پرانا نظام ہے۔ پرانے زمانے کے رومیوں اور یونانیوں میں بھی یہ نظام بے حد مقبول تھا۔

اس زمانہ کی اور آج کل کی جمہوریت کا مقابلہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دو ہزار سال کے عرصے میں دنیا نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ مسیحی دور سے کچھ مدت پہلے روم میں ایک شہنشاہ کولیگولا نامی حکومت کرتے تھے۔ یہ بری خوبیوں کے بزرگ تھے۔ آپ اپنے آپ کو آئینی شہنشاہ سمجھتے تھے اور کہا کرتے کہ میں تو برائے نام شہنشاہ ہوں۔ سینٹ چاہے تو مجھے ہٹا سکتی ہے۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ان دنوں میں بھی سینٹ یعنی پارلیمانی ہوا کرتی تھی۔ جس کے ممبر بعینہ اسی طریقے سے چنے جاتے تھے جس طرح ہمارے اپنے ملک میں۔ کالیگولا صاحب کے دماغ میں کیا آئی کہ انہوں نے اپنے گھوڑے سبب انس نامی کو سینٹ کا ممبر منتخب کر لیا۔ کالیگولا کے ڈر کی وجہ سے کسی نے سبب انس کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی ہمت نہ کی اور سبب انس بلا مقابلہ سینیٹر (Senator) بن گیا۔ سبب انس پھولوں کا تاج پہنے گھنے پائے اور ہاروں سے لدا پھندا سینٹ کے اجلاس میں کالیگولا کے ہمراہ آتا۔ عام ممبروں کا ایک ووٹ ہوتا تھا مگر سینٹ نے باتفاق رائے یہ پاس کیا کہ سبب انس کے دو ووٹ ہوں گے۔ بعد میں کالیگولا نے سبب انس کو رومی سلطنت کے ایک ایشیائی صوبے کا پیریر یا گورنر مقرر کر دیا۔ جب سبب انس کا انتقال ہوا تو اس کی نعش کو روم پہنچایا گیا۔ کالیگولا نے پورے فوجی اعزاز سے اپنے محبوب سینیٹر کی تجہیز و تکفین کی۔ بیس دن سبب انس کا سوگ منایا گیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت ظل سبحانی کالیگولا کے وقت میں بھی سینٹ میں ایک مخالف پارٹی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ملک میں تو یہ پارٹی الیکشن سے کچھ عرصہ پہلے ہی جیلوں میں ٹھونس دی جاتی ہے۔ کالیگولا صاحب مخالف پارٹی کے ممبروں کی شیروں سے کشتی کرایا کرتے تھے۔ آج کل جمہوریتوں میں یہ ممکن نہیں۔ زندہ شیر بہ مشکل دستیاب ہوتے ہیں۔

بچو! دیکھا تم نے جمہوریت کتنی اچھی چیز ہے۔ اسی کی بدولت ایک معمولی گھوڑا ترقی کرتا رومی سینٹ کا ممبر جابنا۔ گو کہ سبب انس کا دماغ تمہارا نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی کوشش کرو تو تم بھی سبب انس کا سا بلند مرتبہ حاصل کر سکتے ہو۔

مسٹر جان فاسٹر ڈلز

بچو! تم نے اخباروں میں مسٹر جان فاسٹر ڈلز کا نام بار بار پڑھا ہوگا۔ آؤ تمہیں ڈلز صاحب کے متعلق کچھ بتائیں۔ مسٹر ڈلز ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وزیر خارجہ ہیں۔ یہ کئی اور ملکوں کے وزیر داخلہ بھی ہیں۔ لیکن یہ بات ذرا چپکے سے کہنے کی ہے۔ یہ چچا سام کے دست راست ہیں۔ اور کندھے پر چار پانچ بچے لٹکائے چھوٹے ملکوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ آؤ قریب سے دیکھیں کہ ان کے بچوں پر کیا لکھا ہے ایک پر انگریزی میں ”نیو“ لکھا ہے۔ دوسرے پر ”میڈو“ تیسرے پر ”سیٹو“ یہ چھوٹے ملکوں کو ایک زہر خند سے چک کر ایک ایک کر کے ان بچوں میں ڈالتے جاتے ہیں۔ کئی ملک ایسے ہیں جن کا سر نیٹو میں ہے

دھڑ میڈ و میں اور ٹانگیں سیٹو میں۔

چھوٹے ملکوں کو بھلانے اور کھلانے کے لیے ان کے پاس طرح طرح کی منٹھائیاں اور اچھی چیزیں ہیں۔ ایک جیب میں چیونگ گم ہے تو دوسری میں کوکا کولا کی بوتلیں۔ تیسری میں لائف سیور کی کینڈی ہے۔ چوتھی میں ہوائی جہازوں، ٹینکوں وغیرہ کے کھلونے ہائیڈروجن بم ان کی اندر کی جیب میں ہے۔

مسٹر ڈلز بڑے متین اور قابل سیاست دان ہیں۔ ان کے ماتھے پر ہمیشہ بل پڑے رہتے ہیں۔ ان کو بے ہدسو چنا پڑتا ہے۔ ابھی دو لپچے کچھ کچھ خالی ہیں۔ بہت کم لوگوں نے انہیں مسکراتے دیکھا ہے۔ ان کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں۔ ان کے دوست بھی تو انہیں وقت بے وقت غچے دے جاتے ہیں۔ ان کے ایک دوست انتھونی ایڈن ہیں ان سے ڈلز صاحب کو بڑی امیدیں تھیں لیکن انہوں نے ہندو چینی میں فرانس اور ویٹ من کا معاہدہ کرا کے ان کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔

جناب ڈلز ہمیشہ ایسے کمزور ملکوں کی اعانت کے لیے تیار رہتے ہیں جو اپنے تحفظ کے لیے فوجی امداد کے لیے طالب ہوں۔ یہ امداد اعانت ان کی امن دوستی اور جمہوریت نوازی کی واضح دلیل ہے۔

آؤ بچو! مسٹر جان فاسٹر سے درخواست کریں کہ جب وہ اس عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہوں تو وہ ہمارے یہاں تشریف لے آئیں تاکہ ان کے تدبر اور سوجھ بوجھ سے اس آزاد ملک کے لیڈر اور عوام فیض یاب ہو سکیں۔

ریڈیو

بچو! تم نے ریڈیو ضرور سنا اور دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے تمہارے گھر میں بھی ایک ریڈیو ہو۔ ریڈیو بیسویں صدی کی ایک حیرت ناک ایجاد ہے۔ دیکھو تو ایک معمولی لکڑی کا بکس ہے۔ چابی گھماؤ تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں گی۔ کسی لہر پر قوالی ہو رہی ہے۔ کسی طردار کسی پر شدھ کلیان۔ خدا جانے ہمارے آباء واجداد ریڈیو کے بغیر کیسے زندگی بسر کرتے ہوں گے؟

دنیا کے کسی حصہ میں زلزلہ، سیلاب یا طوفان تباہی لائیں اس کی خبر فوراً ریڈیو پر آتی ہے۔ اکثر تو طوفان کی گھن گرج بھی خبر کے ساتھ ہی سنائی پڑتی ہے۔ چچا سام کے ملک میں تو تم طوفان یا زلزلے کو ٹیلی ویژن کے پردے پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ اس نعمت سے ہمارے آباء واجداد محروم تھے۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ گھوڑے بچ کر سویا کرتے تھے۔ بچو ہم کو بھلا نیند کیسے آ سکتی ہے جب کہ ہم سے صرف آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ایک باد گرد یلغار کرتا ہوا گزر رہا ہے۔

ریڈیو کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس پر آنکھوں دیکھا حال بھی سنا جاسکتا ہے۔ پانچ سو میل کے فاصلہ پر اگر کوئی میچ ہو رہا ہے یا کہیں

گھوڑے بھاگ رہے ہیں یا کوئی رسم افتتاح ہے تو تم گھر بیٹھے ہی اس کا آنکھوں دیکھا حال سن سکتے ہو۔ مثلاً پرسوں ہو رہی ہے آئربیل چھ میاں وزیر مرہ جات نے شکر دلی میں ایک بسکٹ کی فیکٹری کی رسم افتتاح کی۔ میں نے ریڈیو پر اس کی پوری روئیداد سنی۔ ”آٹھ سو آدمی پنڈال میں بیٹھے ہیں۔ وہ دیکھنے دروازہ پر کچھ شور سا ہو رہا ہے۔ میں اچھی طرح تو نہیں دیکھ سکتا۔ میرا خیال ہے۔ نہیں نہیں مجھے یقین ہے۔ آئربیل وزیر مرہ جات تشریف لا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اٹھ کر ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ معاف کیجئے اب پتا چلا ہے کہ یہ وزیر صاحب نہیں تھے۔ ایک بکرا اندر گھس آیا۔ سیکرٹری عبدالشکور صاحب اسے باہر نکل رہے ہیں۔ اچھا بڑے سینگوں والا بکرا ہے۔ غالباً غستانی ہے۔ اتنی دور سے وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا پلیٹ فارم پر سے سیٹھ حاجی۔ معاف کیجئے گانام بھول گیا۔ بہر حال حاجی صاحب آئربیل چھ میاں زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ کئی لوگ اچھل اچھل کر وزیر صاحب پر بسکٹ پھینک رہے تھے۔ ایک بسکٹ میرے پاس بھی آ کر گر رہا ہے۔ اچھا لذیذ اور کرارا ہے۔“ وغیرہ وغیرہ

بچو! اب تمہیں ریڈیو کے فوائد معلوم ہوئے۔ ریڈیو پر نہ صرف خبریں اور آنکھوں دیکھا ہال ہی سنا جاتا ہے۔ بلکہ پر مغز تقریریں بھی سنی جاسکتی ہیں۔ شام کو دو مشہور غیر ممالک کے اسٹیشنوں سے ”نوک جھونک“ کی قسم کا نہایت دلچسپ پروگرام نشر ہوتا ہے۔ درمیانی وقفوں میں گراموفون پر فرمائشی ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے محب وطن ان پروگراموں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

مختصر اُچھا! ریڈیو بڑی اچھی ایجاد ہے۔ اس میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں ایک چابی ایسی بھی ہوتی ہے جس کے گھمانے سے یہ بند ہو جاتا ہے۔ اگر یہ چابی نہ ہوتی تو روزانہ کئی ریڈیو پھینک کر توڑ دیئے جاتے۔

آزاد سرمایہ

ہمارا ملک آزاد سرمائے میں یقین رکھتا ہے۔ یہاں ہر طریقہ سے روپیہ کمانے اور خرچ کرنے کی آزادی ہے۔ بچو تم چاہو تو دس ہزار روپیہ روزانہ کما سکتے ہو۔ حکومت کی طرف سے تم پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ تم کروڑ پتی بن سکتے ہو۔ فولاد اور شیشے کی محلوں میں رہ سکتے ہو۔ لمبی قیمتی موٹر کاروں میں گھوم سکتے ہو۔ حکومت کی طرف سے تمہیں ان سب باتوں کی کھلی اجازت ہے۔ دنیا میں کئی ایک ایسے ملک ہیں جہاں آزاد سرمایہ کا نظام رائج ہے۔ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے جاگیردار کروڑ پتی اور نواب ہیں یہ نہ ہوں تو زندگی کیسی پھسکی اور بے مزہ ہو کر رہ جائے۔

سوالات

- ۱۔ ہمارا قومی ترانہ کون سی زبان میں ہے اس کے ایک مصرعے میں ”عوام“ کا ذکر ہے۔ یہ غلطی شاعر سے کیسے ہو گئی؟
- ۲۔ گھوڑے سجانس کے مرتبہ کے دوسرے سینئرز کے نام گناؤ۔
- ۳۔ جان فاسٹر ڈلز کو چھوٹے ملکوں سے اس درجہ محبت کیوں ہے؟
- ۴۔ ریڈیو کے فوائد تفصیل سے بتاؤ۔
- ۵۔ آزاد ممالک کی تعریف کرو۔
- ۶۔ کروڑ پتی، جاگیرداروں، نوابوں کے بغیر آزاد ملکوں کی حالت کیا ہوگی؟ تفصیل سے بیان کرو۔



مقیاس المحبت

آپ نے چند روز پہلے اخباروں میں ڈاکٹر نجیب غریب محمد کے افسانہ کی انجام کی خبر پڑھی ہوگی۔ غالباً اسی سرسری انداز میں جس طرح آپ روزانہ خود کشیوں، ڈاکوؤں یا اغواء کی خبریں پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے فوراً بعد ہی اس کے متعلق بالکل بھول گئے ہوں گے۔ آپ یقیناً ایک حزیں اور عجیب حالات کے سلسلے سے بھی ناواقف ہوں گے۔ جو بالآخر اس دردناک اور خوفناک ٹریجڈی کا باعث ہوئے۔ بھلا کتنوں کو خبر پڑھتے وقت یہ احساس ہوا ہوگا کہ چاکیواڑہ کا یہ ڈاکٹر جس کی ڈاکٹری اکیڈمک ڈگریوں کی مرہون منت نہ تھی۔ پاکستان کا پہلا اور بچل سائنسٹ تھا جو اگر کچھ دیر اور زندہ رہتا تو اپنے ملک کے لیے فخر کا موجب ہوتا۔ اس کی بے وقت موت سے حقیقتاً یہ نوزائیدہ سلطنت ایک ایسے سائنسٹ اور موجد کی خدمات سے محروم ہوگئی ہے جس کا ہم پلہ اس زمانے میں شاید ہی پیدا ہو سکے۔

میں اس کا دوست تھا۔ ایسا واحد دوست جو مڈل تک سکول میں تعلیم پانے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اردو کے ایسے مکمل فقرے لکھ سکے جن میں فاعل، فعل اور مفعول تینوں موجود ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں پہلے چاکیواڑہ کے مقیموں پر اور پھر پاکستان پر اور اس کے بعد دنیا پر واضح کروں کہ میرے دوست کی وفات سے سائنس کو کتنا نقصان پہنچا ہے اور کیسے اس کی اپنی حیرت انگیز ایجاد مقیاس المحبت ہی اس کے دریائے لیاری کے طغیانی زدہ پانیوں میں چھلانگ لگا کر ڈوبنے کا سبب ہوئی۔

ہر وہ شخص جو چاکیواڑہ میں رہتا ہے، کارپوریشن اسٹریٹ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ چاکیواڑہ کی سب سے فیشن ایبل گلی ہے اور اس شہر میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو صدر میں انٹرنیشنل اسٹریٹ کو حاصل ہے۔ کارپوریشن اسٹریٹ کیا ہے؟ گارے کے کچے میڑھے سے گھر۔ چھوٹی شرمائی ہوئی سی دکانیں جو سڑک کی بجائے کسی اور سمت رخ کئے ہیں۔ کارپوریشن اسٹریٹ کے وسط میں پپ ہے جہاں پھولدار جیوں میں لگاؤں جیسی عورتیں سارا دن پانی بھرتی رہتی ہیں۔ اسٹریٹ کی چوڑائی ہر دس قدم پر بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ بعض جگہ دروازے سے لگی ہوئی میونسپلٹی کی لائین ایک تے ہوئے بازو کی طرح آنکھوں کے سامنے ناگہانی طور پر نمودار ہو جاتی ہے۔ مختصراً کارپوریشن اسٹریٹ خود رومانس کا دوسرا نام ہے۔ میرا ایک دوست منظر کمالی جو ایک ترقی پسند ادیب بھی ہے۔ اس کو گھلتی ہوئی حسیناؤں کی گلی کہا کرتا ہے۔ جس سے بہتر اور زیادہ مناسب نام شاید اور کوئی نہیں سوچا جاسکتا۔ کارپوریشن اسٹریٹ میں

تقریباً دو فرلانگ آگے جا کر فضل محمد ٹی شاپ کے سامنے ڈاکٹر غریب محمد کی دکان تھی وہ ایک معتبک۔ نوکدار داڑھی والا۔ فراخ گنبد نما پیشانی والا آدمی تھا اور اسے پہلی نظر دیکھتے ہی یہ یقین ہو جاتا تھا کہ اگر کسی شخص پر لفظ جینس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ چاکیواڑہ کا یہ ڈاکٹر ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر یہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے وہ ان ہزاروں ڈاکٹروں میں سے تھا جو مریض کو دیکھ کر بہت پر حسرت انداز میں اپنا سر ہلاتے ہیں اور لواحقین کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کو ایک دو مہینے بلوا کر مریض دکھایا جاتا تو اس کے بچنے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی۔

چاکیواڑہ کے کئی شریک دوست ڈاکٹر پر بہتان باندھتے تھے کہ لیاری کو ارٹر کے قبرستان کو آباد کرنے میں اس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ یہ دراصل ایک ذلیل بہتان تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر غریب محمد کو بلوایا ہی اس وقت جاتا تھا جب کہ مریض کے بچنے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اپنی خودکشی سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈاکٹر غریب محمد میں ایک عجیب تبدیلی نظر آنے لگی۔ وہ خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا اور جب میں ایک دو بار اس کی دکان پر گیا تو اس کے چہرے کی وحشت اور اس پر آسمانی سا جلال دیکھ کر مجھے اظہارِ مدعا کی جرات نہ ہوئی۔ اس نے اپنی وزٹس کم کر دیں۔ صرف ایک دفعہ اس نے مجھے اتنا اشارہ دیا کہ اس کا دماغ بہت بڑی باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ”اسپ“ میں دن رات اپنا سارا وقت ایک ایسی ایجاد کے بارے میں صرف کر رہا ہوں جو دنیا میں تھلکہ مچاوے گی۔ اس کے مقابلے میں پہلی سب ایجادیں ریڈیو، اینیم بم وغیرہ بچے کا کھیل معلوم ہوں گے۔ جس کے منظر عام پر آنے کے بعد جرمنی کے ماہرین نفسیات کی تمام تھیوریاں بیہودہ ہو کر رہ جائیں گی۔ اور آنے والی نسلیں ڈاکٹر غریب محمد سے پہلے زمانے کو انسانیت کا تاریک دور کہا کریں گی۔

مجھے یقین ہے انہی دنوں ڈاکٹر غریب محمد کو پہلے پہل یہ خیال سوچھا کہ ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جس سے محبت ناپی جاسکے۔ دراصل یہ صرف اکیلے اس کے دماغ ہی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کو تکمیل تک پہنچانے میں کچھ حصہ حکیم اللہ لوک سنیا ہی کا بھی تھا۔ انہوں نے اس ایجاد کی ضرورت پر چاکیواڑہ کے مخیر اور رحمدل راسٹورانوں میں (جواب تک اس مہنگائی کے زمانے میں بھی اپنی پرانی غریب پروری اور مہمان نوازی کی روایات برقرار رکھتے ہوئے اپنے گاہکوں کو گڑ کی بنی ہوئی چائے کی پیالی اور غالباً بڑا بنا ہوا بن صرف دو آنے میں مہیا کرتے ہیں) پہروں اور گھنٹوں سر جوڑ جوڑ کر بخشش کی گئیں۔ عموماً جس وقت ہم ان پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو جاتے ہیں تو وہ دائیں بائیں یوں دیکھنے لگتے جیسے اپنا جوتا تلاش کر رہے ہیں۔ بات کا رخ فوراً بدل دیتے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ

چاکیواڑہ کورات رات میں بارود سے اڑانے کی قسم کی کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں۔ مگر ان کے پچھلے کئی برسوں کے حب الوطنی اور جانفروشی کے ریکارڈ کے پیش نظر ہمیں اپنا خیال ترک کرنا پڑا اور ہم نے سوچا کہ یہ سقراط بقراطیہ دو عظیم گنبد نما دماغ یقیناً اپنے امتزاج سے کوئی ایسا اچھوتا فارمولا ایسا مفید آلہ دریافت کریں گے جو چاکیواڑہ کے مکینوں کی زندگی قابل رشک بنادے گا۔ ایک دفعہ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو ”مقیاس المحبت کا پارہ“ کہتے سنا۔

پچھلی جولائی کو ایک صبح جب میں یعقوب مکرانی سے پانچ روپے ادھار مانگنے کے ارادے سے جا رہا تھا تو کارپوریشن اسٹریٹ میں ڈاکٹر غریب محمد کی دکان کے سامنے ٹھہر گیا کیوں نہ ڈاکٹر غریب محمد ہی کو پانچ روپے اگلنے کے لیے کہا جائے۔ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔

ڈاکٹر گلی کی طرف پیٹھ کئے کرسی پر پاؤں رکھ کر سامنے میز پر ایک گھڑی نما چیز سے کھیل رہا تھا۔ میز پر چند ایسے اوزار رکھے تھے جو جہاں تک مجھے معلوم ہے ڈاکٹر استعمال نہیں کرتے۔ ایک ہتھوڑا آدھ درجن کیلیں اور گرا ریاں دو پیچ کش۔ میں نے گمان کیا کہ شاید ڈاکٹر خود اپنی گھڑی کی مرمت کر رہا ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر کئی گنوں کا مالک تھا۔ میں دکان کے اندر چلا گیا اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھے مڑ کر دیکھتا یا اپنی گھڑی نما چیز کو چھپانے کی کوشش کرتا میں اس کے سر پر موجود تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کی سپاٹ چاند تھپتھپا رہا تھا۔

اس نے بڑے بھدے طریقے سے گھڑی نما آلے کو الٹ پلٹ کیا جیسے وہ ایسے ہی اس سے کھیل رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسے لڑکے کی طرمانہ جھلک تھی جو چوری کرتا پکڑا گیا ہو۔

میں نے قیاس دوڑا دیا۔ کیا یہی تو مقیاس المحبت نہیں؟

ڈاکٹر حیران اور خوفزدہ ہو کر اپنی کرسی پر اچھل پڑا، تمہیں کیسے معلوم ہوا، تمہیں کس نے بتایا؟ اس عالم میں صرف دو آدمیوں کو اس آلے کا علم ہے۔ ایک تو اس کم فہم کو دوسرے حکیم اللہ لوک سنیا سی کو!

مجھے؟ میں نے ایک سرسری انداز سے اس کو مرعوب کرنے کے لیے جھوٹ بولا۔ ”مجھے کیسے معلوم نہ ہو، میں خود ایک عرصے سے مقیاس المحبت پر ریسرچ کرتا رہا ہوں مگر میرے فارمولے میں کوئی غلطی رہ گئی ہے۔ دراصل پہاڑی چوگاڈ کا دل جو اس آلے کے اجزائے کیمیائی کے لیے اشد ضروری ہے، پاکستان میں نایاب ہے۔“

سچ؟ ڈاکٹر نے اب ایک مربیانہ انداز سے کہا۔ ایک ایسے انداز سے جو ایک سینئر کامیاب سائنسٹ اپنے مبتدی ہم پیشہ بھائی

کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ”تو تم بھی ایک فیلو سائنسٹ ہو؟ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے۔“ پھر اس نے ایک ترحم آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنا بڑا مہیب سرنفی میں ہلایا۔ ”مگر تم غلط راستے پر چلے گئے۔ پہاڑی چگاڈ کا قلب مقیاس المحبت میں ابا، بابا، بابا میں جانتا ہوں کہ تم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے صحیح سائنٹیفک اپروچ کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ ایسی ایجاد کے لیے صحیح سائنٹیفک اپروچ کا ہونا پہلی شرط ہے۔ مثلاً تھرمامیٹر کو لو۔ اس کے صحیح سائنٹیفک اپروچ کی خاص بلکہ مطلقاً ضرورت نہیں۔ ہر الو اس کو ایجاد کر سکتا تھا۔ یہ ایک بالکل معمولی اور سیدھا سادا آلہ ہے جو جسم کی حرارت ماپتا ہے۔ مگر مقیاس المحبت! محبت کو صحیح ڈگریوں میں ناپنا اس قدر سہل نہیں جتنا جسم کی حرارت ناپنا۔ اس کے موجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدرت کے فزیکل قوانین کے علاوہ روحانی قوانین پر بھی عبور رکھتا ہو۔ اور روحانی قوانین کو صحیح سائنٹیفک اپروچ سے قابو میں لانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اگر حکیم اللہ لوک سنیا سی جیسے عامل روحانیت کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو میں خود تمہاری طرح تاریکی میں بھٹکتا رہتا۔ یہی جگہ ہے جہاں تم لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہو۔ تم لوگ مقیاس المحبت کا بالکل انہی فزیکل قوانین کے مطابق ایجاد کرنا چاہتے ہو جن پر تھرمامیٹر۔ صرف اس قانون پر کہ پارہ حرارت سے پھیلتا ہے، مگر محبت صرف فزیکل قوانین کے تابع نہیں۔ بابا بابا ہی ہی ہی۔“ وہ برترانہ طریق پر ہنسا۔ یہ مجھے سخت ناگوار گزرا۔

میں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا یہ محبت ناپنے کا آلہ یہ مقیاس المحبت پورے طور پر مکمل ہو چکا ہے؟“
 ”بالکل مکمل! تم نے کیا سوچ رکھا تھا۔ بھلا میں اتنے روز سے اور کیا کر رہا تھا؟“ ڈاکٹر غریب محمد نے مصالحانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”دوا اور دو چار کی سی صحت اور خوبصورتی سے کام کرتا ہے۔ میرا مقیاس المحبت۔“ پھر دفعتاً چونک کر اور قدرے ہراس زدہ ہو کر ”اسپ یار (میرا نام اصل میں کچھ اور ہے دوست احباب پیار سے اسپ کہتے ہیں۔ غزل میں میرا تخلص بھی یہی ہے) یہ ایجادیں پیٹنٹ بھی تو کرانا پڑتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے۔ یہ پیٹنٹ کرانے کا معاملہ کہاں اور کس طرح ہوتا ہے۔“

”یہ مجھ پر چھوڑ دو۔“ میں نے اپنے دوست کے لیے مضبوط سہارا بننے ہوئے کہا۔ میں اس کام میں اسپیشلسٹ ہوں۔ ڈبل روٹیاں بنانے کا ایک بالکل نیا طریقہ ابھی حال ہی میں پیٹنٹ کر چکا ہوں۔ مگر مقیاس المحبت کو پیٹنٹ کرنے کے لیے تم اس قدر بے چین کیوں ہو۔“

”کیوں نہ ہوں! فرض کرو کوئی اور مجھ سے پہلے مارکیٹ میں یہ ایجاد لے آتا ہے۔“

”تمہارے سوا اور کون یہ آلہ ایجاد کر سکتا ہے؟“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ”میرا مکان تھا کہ سائنٹیفک اپروچ کے فقدان کی وجہ سے میرا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر تمہارا بہترین دوست ہوں۔ تم کیسے اپنے بہترین دوست سے ایسی ناشائستہ حرکت کی توقع

کر سکتے ہو؟“

”نہیں“ اس نے کہا۔ ”مجھے تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ ہے تو صرف ایک شخص سے جو اس ایجاد کے کئی خفیہ رازوں میں میرا شریک کار رہا ہے۔ بھی نیت بد لیتے دیر نہیں لگتی۔“ وہ راز دارانہ طریق پر اپنا منہ میرے اس قدر قریب لے آیا کہ اس کی نوکیلی داڑھی کے چند بال میرے کھلے ہوئے منہ میں گھس کر میری زبان پر کھجلی کرنے لگے۔ ”تم سے کیا چھپاؤں! تم تو ہوئے لنگوٹے اسپ یار۔ میں تمہاری وہ چار دن کی مسلسل تنگ و دو نہیں بھولا جو معجون حب کے لیے تم نے بلبلیں فراہم کرنے کے سلسلے میں کی تھی۔ مجھے حکیم اللہ لوک کا ڈر ہے۔ اسے مقیاس المحبت کے پرزوں اور اس کی مشینری کے راز کا علم ہے اور اس میں چند عمل اور تعویذ اسی عامل کامل کے ہیں۔“

”تعویذ!“ میں چلایا۔ ”تمہارا مطلب ہے یہ مقیاس المحبت تعویذوں سے چلتا اور کام کرتا ہے۔“

”صرف تعویذ نہیں“ تعویذ بعد میں آتے ہیں۔ پہلے اس میں پرزوں، گراریوں اور سپرنگوں کا ایک بے حد الجھا ہوا میکزم ہے۔ ایک جیسی گھڑی کے میکیزم ملتا جلتا مگر اس سے کہیں زیادہ پیچ دار۔ یہ گھڑی بند جو تم دیکھتے ہو ایک خاص دھات کا ہے جو اندر سے کھوکھلی ہے اور جس کی ماہیت اور خصوصیات سے انگریز، جرمن اور امریکن ہیٹ دان تک نا آشنا ہیں۔“ وہ مجھے اس سے زیادہ بتانے پر تیار معلوم نہ ہوتا تھا۔

”تم جانتے ہو۔ ڈاکٹر“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا بہترین دوست ہوں۔ وہ واقعہ یاد کرو جب میں بلبلیں پکڑنے کے لیے چار پانچ روز بغیر کھائے پیئے صحراؤں اور گلستانوں کی خاک چھانتا پھرا تھا اور جب میں ان کو ٹوکڑے میں رکھ کر تمہارے پاس لایا تو میرے بعض حاسدوں نے تم کو بھڑکایا تھا کہ یہ بلبلیں نہیں بلکہ جنگلی مو لے ہیں۔ تم بھی ان کی بات مان گئے تھے اور مجھے اس شہادت کے لیے کہ واقعی یہ بلبلیں ہیں، شیخ فضل علی ناولٹ کو آدھی رات کے وقت اس کے بستر سے اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ وہ وقت یاد کرو اور مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ آلہ کیسے کام کرتا ہے۔“

ڈاکٹر نے کچھ تامل کے بعد مجھے تفصیل سے بتایا کہ آلہ کس طرح کام کرتا ہے۔ گھڑی کے ساتھ ایک گھڑی بند یا کنگن ملحق تھا جو کلائی پر فٹ کیا جاسکتا تھا۔ اس کنگن کے دوسرے سرے پر گھڑی کے متقابل ایک بلوریں ٹکڑا جزا ہوا تھا جو دراصل بلور کا نہ تھا بلکہ ایک عجیب و غریب نامعلوم دھات کا تھا جس کی دریافت مغرب کے مادیت پرست ہیٹ دان شاید اس وقت تک نہ کر سکیں گے جب تک ان کے درمیان کوئی ایسا ہیٹ دان نہ پیدا ہوا جو بیک وقت ہیٹ دان بھی ہو اور ایک ولی کامل بھی۔ اس بلور کے ٹکڑے کی خاصیت یہ

تھی کہ عام فریڈیکل حرارت اس پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ مگر محبت کی لہریں جو فضا میں ریڈیو کی لہروں کی طرح سفر کرتی ہیں اس کے ساتھ ٹکرا کر ایک متوافق قوت کی روکنگن کے حلقے اور گھڑی کے اسپرنگوں میں سے دوڑا دیتی تھیں۔ اسپرنگ مقناطیسیت زدہ ہو کر گھڑی کے پوائنٹر (سوئی) کو کلاک وائز یا انٹی کلاک وائز اطراف میں حرکت میں لاتے تھے۔ گھڑی کے چہرے پر +1 سے +6 ڈگری تک ایک طرف اور -6 ڈگری تک دوسری طرف ہند سے لکھے تھے جن میں سے ہر ہندسہ محبت یا نفرت (منفی ہندسے نفرت کے تھے) کی ڈگری ظاہر کرتا تھا۔

ڈاکٹر نے اتنا سمجھانے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”میں تم کو اس کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہوں۔ فرض کیا تم سامنے سے ایک خوبصورت عورت آتی دیکھتے ہو اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اس کو تم سے اس وقت کتنی ڈگری کی محبت ہے یا وہ کتنی شدت سے تمہاری طرف کھینچ رہی ہے تم اس وقت اس گھڑی کو اپنی کلائی پر پہن لیتے ہو۔ بلور کے ٹکڑے کو تم اپنے منہ کے سامنے اس طرح لے آؤ گے کہ وہ آنے والی کی تیرمڑگاں نظروں کے راستے میں حائل ہونے لگے۔ محبت کی لہروں کے اس بلور پر کھیلنے ہی گھڑی کا پوائنٹر اپنی زیری کی پوزیشن سے ہٹ کر دائیں یا بائیں حرکت کرے گا۔ فرض کیا کہ سوئی +1 پر آ کر رکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کو تم سے محبت ضرور ہے مگر واجبی قسم کی۔ +1 سے +3 یا +5 پر آ کر ٹھہرے تو اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کی محبت تمہارے لیے اس شدت کی ہے کہ اگر تم کوشش کرو تو وہ تمہارے بھاگ نکلنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ +6 پر شادی ہو سکتی ہے بشرطیکہ لڑکی کا باپ رضا مند ہو۔

”اور 1- اور 2- یہ کیا ظاہر کرتے ہیں؟“

”تم تو محض بچے ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے۔ 1 ڈگری محبت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ یہی کہ 1 ڈگری نفرت۔ اگر سوئی انٹی کلاک وائز حرکت کرے اور 1-

پر کے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت کو تم سے نفرت ہے اور اس نفرت کی شدید اور آخری ڈگری 6- ہے۔ ایسی نفرت جو تم کو اس عورت کے بھائیوں سے جوتیاں پڑوا سکتی ہے۔“

جوتیاں پڑنے کے ذکر پر آنکھیں جھپکائے بغیر میں نے ایک بالکل غیر ضروری سوال کیا۔ ”ایک اور بات! اے مشہور ہیئت دان! کیا یہ گھڑی اور مقیاس المحبت صرف چاکیزہ کے خوش نصیب باشندوں ہی کے لیے وقف ہوگا؟“

”نہیں“ ڈاکٹر غریب محمد ایک عظیم سائنس دان کے لب و لہجے میں کہنے لگا۔ میں ایک سچا سائنس دان ہوں اور ایک سچا سائنس

دان، قوموں، ملکوں اور حد بند یوں کی Terms میں نہیں سوچتا۔ اس ایجاد کا فیض ساری بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ سکھوں کے لیے بھی۔“

”اتنا فراخ دل! سکھوں کے لیے بھی“ میں تعریفی نگاہوں سے اسے پیتا ہوا چلایا۔ ”اس ایجاد کے فیض سے تم سکھوں کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتے مگر فیض! میں سچ کہتا ہوں اس مقیاس الحبّت میں کوئی فیض نہیں۔ تم نے ایک حیرت انگیز آلہ ایجاد کیا ہے۔ مگر اس میں فیض کوئی نہیں۔ اس سے کئی گھروں کی خوشی تباہ ہو جائے گی اور ان کئی عاشقوں کے دل جواب تک اپنی محبوباؤں کی عفت اور محبت کے یقین میں فریب زدہ اور مست ہیں، ٹوٹ جائیں گے۔“

”پھر بھی یہ ایک عظیم ایجاد ہے۔“ ڈاکٹر غریب محمد بولا۔ ”ہر چیز کے فوائد بھی ہوتے ہیں اور نقصانات بھی۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ اس ایجاد سے اس کے عاملوں کی زندگیاں اجیرن ہونے کا احتمال ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ جواب اپنے محبوبوں کی محبت کا یقین رکھتے ہو مقیاس الحبّت کے چہرے پر سچائی پڑھ کر اتنے مایوس ہوں کہ خودکشی کر لیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس ایجاد سے زیادہ تر خلق کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس سے نوجوانوں کو شادی کے لیے صحیح انتخاب کرنے میں بے حد سہولت ہو جائے گی۔“

”خیر کم از کم یہ ایجاد میرے لیے بیکار اور بے ضرر ہے۔ مجھے دیکھ کر خدا جانے کیا بات ہے، عورتوں کی وہ ریڈیائی لہریں جن کی طرف ابھی ابھی تم نے نہایت خوبصورتی سے اشارہ کیا وہیں رک جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں مقیاس الحبّت کو اپنی کلائی پر باندھوں تو یہ پوائنٹر صفر پر ٹھہرا رہے گا۔ عورتیں مجھ سے محبت کرتی ہیں نہ نفرت۔“

انجام کار میں نے ڈاکٹر سے وعدہ کیا کہ میں اس ایجاد کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا اور کسی سے ذکر تک نہ کروں گا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر کی اجازت سے مقیاس الحبّت کو اپنی کلائی پر باندھ کر مختلف اشیاء کے درجہ محبت کو جو انہیں اس ناچیز سے تھی، ناپا۔ نتیجہ مندرجہ ذیل ہے۔

گھڑاٹھائے ہوئے ایک عورت جو آ رہی تھی۔ (پوائنٹر صفر ڈگری پر کھڑا رہا)

بغیر گھڑے کے ایک عورت۔ (پوائنٹر صفر ڈگری پر رہا)

ایک اونٹ جو کارپوریشن اس اسٹریٹ کی ٹکڑ پر کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ (+4)

دو گدھے جو سامنے سے آ رہے تھے۔ (+6) (غالباً +3 فی گدھا)

یعقوب مکرانی، چاکیواڑہ کالال داڑھی والا یہودی جس کا میں ایک سو روپے کا مقروض تھا اور جس کے پاس میری پانچ ٹائیاں رہن

تھیں۔ (6)۔

یعقوب مکرانی کی 6۔ محبت کو دیکھتے ہی میں فوراً ڈاکٹر غریب محمد کی ڈسپنری میں اندر ایک چھوٹی سی کال کوٹھڑی تھی جس کو اس نام سے پکارا جاتا تھا، جا چھپا اور اس وقت تک چھپا رہا جب تک ڈاکٹر نے آل کلیر کا سگنل دے کر مجھے یقین نہ دلایا کہ یعقوب مکرانی اب فی الواقع آگے گزر گیا ہے۔

”واقعی ڈاکٹر“ میں نے ڈسپنری سے نکلتے ہوئے اور مکڑی کے جالوں کو جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”آج مقیاس المحبت نے جو مقیاس الثمرت بھی ہے میری جان بچالی اور عزت رکھ لی۔ اس نے فوراً مجھے اطلاع دے دی کہ آج تمہارا قرض خواہ تمہارے سر پر جو تیاں توڑنے کے ارادے سے نکلا ہے۔ کم بخت آج بوٹ بھی نئے اور نوکدار کیلوں والے پہنے تھا۔“

”بس اب یہ مقیاس اتار کر مجھے دے دو۔ مجھے ابھی دو تین پیچ کسنے ہیں اور ایک اور تعویذ گھڑی کے پیچھے ڈالنا ہے۔ کل تک میں اس کو پینٹ کرادوں گا۔ لیکن حکیم اللہ لوک سنیا سی.....“

”پینٹ کرانے میں تمہاری مدد کروں گا۔“ میں نے آڑے وقت میں اپنے دوست کے کام آتے ہوئے جواب دیا۔ ”پرواہ نہ کرو۔ ایڈمنسٹریٹر کے دفتر کا ہیڈ چپڑا سی میرا دوست ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ یک لخت مجھے خیال آیا اور مڑا۔ ”ڈاکٹر غریب محمد کیا تم مجھ کو آج شام تک پانچ روپے ساڑھے تین آنے ادھا دے سکتے ہو؟“

وہ کچھ تامل سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بتایا کہ میں اس کا بہترین دوست ہوں۔ بلبلوں کا لطیف طریقے سے ذکر کیا۔ آخر ڈاکٹر نے اپنے تھیلے سے پورے پانچ روپے ساڑھے تین آنے گن کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

”پانچ روپے کیا چیز ہیں۔“ ڈاکٹر روپے دے چکنے کے بعد اب حاتم طائی کا پارٹ کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا تھا۔ ”پانچ روپے اپنے بہترین دوست کے لیے۔ میں آخراں اس ایجاد سے لاکھوں کمانے والا ہوں۔“ وہ اپنے آپ کو ڈھارس دے رہا تھا۔

کوئی تین روز کے بعد بارش سے پناہ لینے کے لیے میں جب ڈاکٹر غریب محمد کے مطب میں داخل ہوا تو اس سنجیدہ اور ہونہار جیمس کو ایک ایسے دلفریب مشغلے میں کچھ ایسا منہمک پایا کہ اسے میرے آنے کا پتا تک نہ چلا۔ وہ زمین پر اکڑوں پنجنوں کے بل بیٹھا ایک سفید زنانہ ٹانگ کا بغور ٹوہ ٹوہ کر ایک مبصر کے سے انداز میں معائنہ کر رہا تھا۔ اس ٹانگ کی مالکہ کرسی پر بیٹھی تھی اور دلفریبانہ طور پر جھکی ہوئی تھی جیسے پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنی آپنی آپ گرنے کو آئے۔ ایک ہاتھ سے اپنے پھولدار فرغل کے گھیرے کو اوپر گھٹنوں تک اٹھائے تھی۔ راقبہ اگر آپ چاکیواڑہ کے باشندے ہیں تو آپ نے ضرور اس کو کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا۔ اس فتنہ ساماں کا نام ہے۔

راقبہ! چاکیوارہ کے کئی جدید نو جوان ترقی پسند شعراء نے اس کو خطاب کر کے بھیجی جیسی گرم تپتی ہوئی نظمیں کہی ہیں اور دو تین ناکام محبت نو جوانوں کی خود کشی بھی اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ یقیناً کارپوریشن اسٹریٹ کی گھلتی ہوئی حسیناؤں میں نمبر ون ہے۔ وہ اتنی حسین نہیں اس کا شمار اس قسم کی لڑکیوں میں کیا جاسکتا ہے جو بیس سال کے بعد مرجھائی ہوئی دھل اندازی کرنے والی طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک والی عورتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور جن کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے بھی چاہنے والے تھے۔

ان سطور کے ناچیز لکھنے والے نے بھی یہ ایک سال پہلے کا واقعہ ہے جب وہ انجمن کنواران چاکیوارہ کا آفیشل ممبر نہیں بنا تھا ایک دفعہ گلی میں اس کی بالکنی کے نیچے کھڑے ہو کر اس کو محبت اور پیار کے الفاظ سے مخاطب کرنے کی جرات کی تھی۔ مگر اوپر سے سرد پانی کی دو بالٹیاں پڑنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس عشق کی ابتدا حوصلہ افزا نہیں ہے۔ حقیر راقم الحروف مستقل مزاج عاشق کبھی نہ رہا۔ اگر ابتدا ہی میں اس کی حوصلہ شکنی کر دی جائے تو وہ محبوب سے مایوس ہو کر عشق کے اور امتحانوں میں اپنی قسمت آزمانے کو چل پڑتا ہے۔ واہ کیا دن تھے!

میں اس محبت کے سین میں نخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایسی بارش جو کراچی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ آخرا چانک راقبہ نے اوپر آنکھیں اٹھالیں اور مجھے دیکھتے ہی اس کے فرغل کا دامن نیچے ٹخنوں تک آگیا۔ راقبہ کی نظروں میں میرے لیے اس وقت زہر بھرا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری کلائی پر اس وقت مقیاس المحبت ہوتا تو اس پر ریڈنگ 5- اور 6- کے درمیان ہوتی۔ ڈاکٹر غریب محمد نے بھی مجھے قاتلانہ نظر سے دیکھا۔ گویا مجھے کچا چبانا چاہتا تھا۔ وہ میرے السلام علیکم کا جواب دیئے بغیر اپنی مریضہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کتے جو ہوئے آخر کاٹ ہی لیتے ہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتے کے پاگل ہونے کا وہم بھی نہ کیجئے۔ میں اس کتے کو عرصہ تین سال سے جانتا ہوں۔ وہ فقیر لوگ ہیں۔ زخم بھی معمولی ہے روز یہاں مجھے ایک دفعہ آکر ٹانگ دکھا دیا کیجئے۔“

راقبہ ایک مرہم کی ڈبیا اٹھائے جو اسے ڈاکٹر غریب محمد نے دی تھی پھولوں کے سے ہلکے قدم رکھتی دکان سے اتر گئی اور میں نے اپنے دل کو اس عہد سے مضبوط کیا جو حال ہی میں انجمن کنواران کے سالانہ جلسے میں کئی ایک متکبر ہستیوں کے سامنے میں نے کیا تھا۔ ”پھوہ“ ڈاکٹر غریب محمد نے پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”پھوہ! میں کہتا ہوں کتنی خوبصورت ٹانگ کیسی سفید پنڈلی۔“

”یہی میں کہتا ہوں کتنی خوبصورت پنڈلی۔ کیسی سفید ٹانگ۔ کتا جو ہر شے معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا بکواس ہے؟“ ڈاکٹر بولا ”اسپ“ تمہارے مذاقوں میں اصلی مزاح نہیں ہوتا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے آج تک صرف ایک اور ایسی عورت دیکھی ہے جس کی ٹانگیں راقبہ کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہ تھی مارلین ڈی ٹریچ، فلم ایکٹرس۔ اس ہوشربا نے صرف اپنی ٹانگیں ہی کئی ہزار ڈالر میں انشورنس کر رکھی تھیں۔“

”تم اس سے کہاں ملے ہو؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے تم ہالی وڈ تو ہالی وڈ کوٹ رادھا کشن نہیں گئے۔“

”آہ! میں نے اس کو اس کی ٹانگوں کو پردہ سیمیں پر دیکھا ہے۔ ایک زنانہ خوبصورت ٹانگ دیکھنا نادرات زمانہ ہے اور اہل نظر کے لیے ایک وجدانی تجربہ۔ کیٹس نے ایک ایسی ٹانگ دیکھ کر وہ مشہور بند لکھا تھا جو یوں شروع ہوتا ہے۔“

”حسین چیز ایک دائمی مسرت ہوتی ہے۔“

”کیٹس کون تھا؟“

پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر غریب محمد مجھے کیٹس اور انگریزی ادب پر پر مغز لیکچر دیتا، پشاور کی لنگی میں ایک ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں اور مطلقاً نہ داڑھی والا ادھیڑ عمر کا آدمی ہاتھ میں سوٹی لیے آیا۔ یہ راقبہ کا اچھا اور سر پرست حاجی بھٹے ڈینو تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً دوڑ کر اس کے قدم لیے۔ اس کے دائیں گال پر بوسہ دیا۔ گدے دار کرسی ڈسپنری سے لا کر اس کے لیے رکھی۔ میں اب جانے کی سوچ رہا تھا۔ مگر جب ڈاکٹر نے سامنے فضل محمد ”ٹی“ والے کو آواز دی کہ فوراً اپیشل چائے لے کر آئے تو میں نے سوچا کہ اس وقت میرے سامنے کوئی اور ایسا اہم معاملہ نہیں جو چائے جیسا اہم ہو۔ چنانچہ میں رک گیا۔

”آج کل اسپ صاحب آپ کو کام پر صبح سویرے جانا پڑتا ہے۔“ ڈاکٹر غریب محمد نے شریفانہ طریقے سے مجھے اشارتاً کہا کہ میں تشریف لے جاؤں۔

”نہیں“ میں نے نہایت خوش مزاجی سے جواب دیا۔ ”میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے اور اب جس کام پر جاتا ہوں اس کا کوئی معین وقت نہیں۔“

مطلقاً نہ داڑھی نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔ ”راقبہ یہاں آئی تھی؟“

”ہاں آئی تھیں۔“ ڈاکٹر نے اپنے دل کی ملکہ کے لیے ادب کے طور پر صیغہ غائب استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان کی تسلی کر دی ہے۔ زخم معمولی ہے۔ صرف چند روز مجھے ٹانگ دکھانے کے لیے آنا پڑے گا۔“

”ہوں“ حاجی بھلے ڈینو نے چائے سرکتے ہوئے ایک ڈکاری۔ ”آج کل افیم پھر مہنگی ہو رہی ہے اور ٹھیکے والے بلیک کر رہے ہیں۔“

”بندے کو کہا ہوتا۔“ ڈاکٹر نے جھٹ اپنی سعادت مندی اور خدمت گزاری کا ثبوت دیا۔ ”آخر بندہ یہاں کس لیے بیٹھا ہے؟“

”اچھا ہوں! آج شام تک چھ تولہ افیم کا انتظام کر رکھنا۔ دام میں عراق سے بر خورداروڈے ڈینو کے منی آرڈر آنے پر چکاؤں گا۔ ڈاکٹر غریب محمد تم چاکیواڑہ کے نیک ترین آدمیوں میں سے ہو۔ کئی بیوائیں اور یتیم بچے تمہیں دعائیں دیتے ہیں۔ میں مکرانی زبان میں چاکیواڑہ کی تمام روشن اور مقتدر ہستیوں کے حالات زندگی با تصویر مرتب کر رہا ہوں۔ یہ چاکیواڑہ کا ”کون ہے؟“ ”ہواز ہو“ ہوگا۔ مقتدر ہستیوں میں تمہارا نام دوسرے نمبر پر رکھوں گا۔ پہلا نام خود میرا ہوگا۔ مجھے اپنے حالات زندگی تصویر کا بلاک اور اپنے کلام کا انتخاب جلد مہیا کر کے دو۔“ ہواز ہو“ میں نام چھپانے کا ہدیہ صرف چالیس روپے ہے۔ افیم بڑی مہنگی ہو رہی اور راقبہ بھی اب انیس سال کی ہو چکی ہے۔“

میں اتنے عرصے میں ربڑ کا ایک بن کھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آخر مجھے اس کو نگلنا پڑا جس کی وجہ سے اچھو آ گیا اور باہر بھاگنا پڑا۔

شام کو لوٹتے وقت میں نے ایک لڑکی کو جو راقبہ تھی دیکھا۔ وہ میونسپلٹی کی لائین کے نیچے ڈاکٹر کی دکان کے سامنے ایک انداز سے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہٹ گئی۔ میں عورتوں کے لیے سم قاتل سمجھا جاتا ہوں۔ ڈاکٹر دکان میں تھا اور اپنی داڑھی کے پیچھے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”آج تم بڑے خوش معلوم ہوتے ہو۔“

”خوش ہونے کی بات ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بوڑھا لنگور رضا مند ہو گیا ہے۔“

”بوڑھا لنگور کون؟ کس بات پر رضا مند ہو گیا ہے؟“

”بچے کی طرح تمہیں ایک ایک بات بتانا پڑتی ہے۔ بوڑھا لنگور حاجی بھلے ڈینو اور کون؟ جو صبح یہاں میرے پاس بیٹھا تھا۔ تمہارے دفع ہونے کے بعد وہ تین گھنٹے اور یہاں بیٹھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا۔ میں اس کو اوڑھے پر لے آیا ہوں۔ راقبہ کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔“

”ہوش کر دو“ میں چلایا۔ ”تم چاکیواڑہ کے کنواروں کی انجمن کے سیکرٹری ہو۔ اپنے وعدے یاد کرو۔ اپنے عہد اپنی قسمیں۔“

”میں سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ اگر راقبہ میری زندگی میں نہ آتی تو بھی اس پریقین کرو میں اپنے بہترین لنگوٹیوں کو اس طرح نہ چھوڑتا۔ پھر بھی میری ہمدردیاں ہمیشہ تمہارے اور دوسرے کنواروں کے ساتھ رہیں گی۔ روحانی طور پر میں تمہارے شانہ بشانہ چلوں گا۔“

”راقبہ“ میں نے حسد میں جلتے ہوئے کہا۔ ”ایک عورت کی خاطر تم اپنے حلف وفاداری اور دوستوں کو چھوڑنے پر تہل گئے ہو اور ایک ایسا خطرناک اور احمقانہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے جس کا انجام میں سوچتا ہوں تو دل دہل جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ ڈاکٹر غریب محمد پلٹ جاؤ باز آ جاؤ۔“

”نانگ“ ڈاکٹر وجدانی کیفیت میں سرشار تھا۔ ”اتنی خوبصورت نانگ“

”مگر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ اسے راقبہ کو تم سے محبت ہے۔ تم جانتے ہو تم اب چھتیس سینتیس اور اتنے یوسف بھی نہیں کہ عورتیں تمہارے پیچھے مریں۔“

”لیکن راقبہ ضرور مجھ پر مرتی ہے۔ اس کی آنکھیں مجھے محبت کا صاف پیغام دیتی ہیں۔ اس کے ہونٹ مجھے چومنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی ہر ادا میں ہر اشارے ہر کنائے میں میرے لیے محبت ہی محبت ہے۔ محبت اور دعوت“

”دعوت کا لفظ سن کر میں نے کہا۔“ میں کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ چائے کے متعلق کیا خیال ہے؟“ میں نے پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور محبت کے بارے..... کہ اس کو تم سے محبت ہے یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس کی اداؤں اور ریلی آنکھوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ عورت نہایت ہی پراسرار مخلوق ہے۔“ میں ایک ایسے انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے میں نے ساری عمر عورت کی نفسیات کے مطالعے میں گزاری ہے۔ اب وہ پرسوں جو اونٹ یہاں سے بلبلاتا ہوا گزرا تھا ظاہراً اس کا مجھ سے کسی قسم کی شیفتگی رکھنا قرین قیاس نہ تھا۔ لیکن مقیاس المحبت کو لگانے سے مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ اس اونٹ کو مجھ سے 4 + ڈگری محبت ہے۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم کل مقیاس المحبت سے یقین کر لو کہ اس کا درجہ محبت کیا ہے۔ پھر کوئی اور چیز سوچنا۔“

مجھے اب افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہ مشورہ دیا۔ ایک طرح یہی مشورہ چار روز کے بعد اس کے خوفناک انجام کا سبب بنا۔ آپ کہیں گے مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن میرے خیال میں حقیقت بہر حال اس پر کھلتی تھی۔ آج نہیں تو کل کل نہیں تو پرسوں۔ میں جانے لگا۔ یک لخت ایک خیال آن پر میں مڑا۔ ”ڈاکٹر غریب محمد کیا تم مجھے کل دوپہر تک دس روپے ساڑھے آٹھ آنے ادھار دے سکتے ہو۔ ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی جنرل ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہے اور یہ حقیر صدارت کے فرائض انجام دے رہا

ہے۔ صدر کے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سب ممبروں کی چائے سگریٹ سے تواضع کرے۔ صرف کل دوپہر تک! تم جانتے ہو میں تمہارا بہترین دوست ہوں۔ وہ بلبلیں یاد کرو۔ چاکیواڑہ میں ایک بہترین دوست کا ہونا جو دکھ سکھ میں ساتھ دے سکے اور مشورے دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ قدرت کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔“

لیکن آج اتنی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر غریب محمد پر حاتم طائی مکمل طور پر سوار ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے تھیلے میں سے دس روپے ساڑھے آٹھ آنے نکال کر دے دیئے جو دکان کے باہر آتے ہوئے یعقوب مکرانی نے جو میری گھات میں کھڑا تھا اپنے سود کی ادائیگی میں دھروا لئے۔ پہلے کی طرح حسین طور پر مفلس اور قلاش۔ میں دو پہلی شام میں سیٹیاں بجاتا چلا گیا۔

میرے استاد نے مجھے کہا تھا۔ ”جی ہلکا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔“

کراچی میں اس جولائی میں بارشوں نے جو یورشیں کیں اور جو گل کھلائے ان کا تذکرہ ہمیشہ شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان بارشوں کے فوراً بعد ایک مہیب باد گرد آنے کی پیش گوئی حکومت کے ”موسم کے خداؤں“ کی طرف سے کی گئی۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر جو صرف باد گرد ہی کو معلوم ہیں وہ کراچی کی طرف آتا آتا لوٹ گیا۔ حکومت کے جلد باز ”موسم کے خدا“ کھسیا نے ہو کر منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعض دوسرے حضرات کو بھی جو اس سائیکلوں کے لیے بے تابانی سے منتظر تھے سخت مایوسی ہوئی۔ پھر بھی بارشوں نے جو کچھ کر دیا تھا سائیکلون (Cyclone) کے لیے اس میں اصلاح کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے غالباً اس نے نازل ہونے کی ضرورت نہ سمجھی۔

چاکیواڑہ میں حالات بالکل ہی ”سبحان اللہ“ تھے جہاں پانی کے گڑھے تھے وہاں تالاب بن گئے۔ جہاں تالاب تھے وہاں جھیلیں۔ اس شہر کی دو تین گلیوں میں لوگ تیر کر گزر رہے تھے۔ لیاری ندی جو اپنے اندر ایک معمولی نالے کی بھی سکت رکھتی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اب چڑھ کر ایک تیز و تند دریا بن گئی تھی اور کنارے کی بستیوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ۔

یہ بارشیں ختم ہونے کے بعد دوسرا دن تھا۔ میں کوئی دو بجے غریب النواز ہوٹل میں ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی انجمن کی غیر معمولی میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا۔ ہمارے علاوہ غریب النواز ہوٹل میں اس وقت کئی اور مشہور اور سربراہان ہستیاں موجود تھیں اور چائے نوشی میں اپنے غموں اور اپنی ناکامیوں کا مداوا ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسٹر ایم اے چکوری، گنجابا پرندہ نما معطل شدہ فلم ایکٹر۔ اب گننام فراموش کردہ اور کچھ بوسیدہ سا۔ وہ دنیا سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ عرصے سے اس نے اپنے مذاقوں پر خود بھی ہنسنا چھوڑ دیا

تھا۔ اس کی زندگی کا اب ایک اصول تھا۔ غریب النواز ہوٹل میں بیشتر آنے والوں کا یہی اصول تھا کہ چائے کے دام کبھی اپنی جیب سے نہ دیئے جائیں۔

شیخ فضل علی ڈنگوی منشی فاضل۔ وہ جو کئی جاسوسی سنسنی خیز راتوں کی نیندیں حرام کرنے والے ناولوں کا مصنف جس کے ناولوں نے کئی سکولوں کے لڑکوں کو جاسوس اور دلیر عاشق بنانے میں اہم حصہ لیا تھا، وہ اصلی زندگی میں نہایت دھیمہ چوزہ دل شخص تھا۔ ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کا عادی۔ اس کے قرض خواہ چاکیواڑہ میں جگہ جگہ موجود تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ اس وجہ سے اس کی زندگی از خود ایک جاسوسی ناول بن گئی تھی۔

حکیم شاہسو ارخاں عامل کامل طبیب اور امراض روحانی و جسمانی بھی وہاں بیٹھا تھا۔ حکیم اللہ لوک سنیا سی کے اس ہونہار شاگرد کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ دو سال کے اندر اندر پاکستان پر فقیروں اور قبطیوں کی حکومت ہو جائے گی جس کے فوراً بعد بعض عملوں کے زور سے ہندوستان والے خود بخود جھک جائیں گے اور جو اہر لال نہروان فقیروں اور قبطیوں سے درخواست کریں گے کہ وہ بھارت پر راج کریں۔ اس کے تین سال بعد سارا بھارت مسلمان ہو جائے گا اور کفر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سیاسی تبصرہ آرائی کے بعد حکیم شاہسو ارخاں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ دو مہینے کے اندر سب سنگدل مجبویوں کو مجبور عاشقوں کے پاؤں میں ڈالنے کی ایک سکیم بنا رہا ہے جس کے بعد اس کے خیال میں چاکیواڑہ میں صرف ایک حل طلب معمر رہ جائے گا کہ کس طرح ان جنات کو جو یہاں کے طبقہ اناٹ پر شیفٹ ہو چکے ہیں۔ اس بات کے لیے اکسایا جائے کہ وہ انہیں چھوڑ کر دریائے لیاری کے پار ہجرت کر جائیں۔

ان کے علاوہ چاکیواڑہ کی ”ہوا زہو“ کا ہونے والا مولف حاجی بھلے ڈینو بھی وہاں تھا۔ وہ دور ایک کونے میں بیٹھا شرپ پی رہا تھا اور اس کی داڑھی اس قدر تلطفانہ نظر آ رہی تھی کہ کوئی بھی اس کے پاس بے دھڑک جا کر اس کی لڑکی کا رشتہ مانگ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس وقت اس کے پاس جا کر راقبہ کا رشتہ مانگتا تو وہ نہایت پدرانہ طریق پر مسکراتا۔ اس کی داڑھی مسکراتی، وہ اپنی ”ہوا زہو“ کی اسکیم اور چالیس روپے ہدیہ کا ذکر لاتا اور جب رشتہ مانگنے والا اس کی چائے اور کیکوں کے دام دے چکتا تو وہ اٹھ کر سونے کے لیے چلا جاتا۔ دوسری صبح وہ اس کو بھول چکا ہوتا۔ یہ حاجی بھلے ڈینو تھا۔ بزعم خود چاکیواڑہ کا نمبر ون شہری۔

یک لخت میں نے سامنے کھلے دروازہ میں سے دیکھا کہ کوئی شخص سڑک کے عین وسط میں سیاہ گون پہنے چشمہ لگائے اٹھتا ہو سکوپ گلے میں ڈالے اپنے دونوں بازو اوپر ہوا میں اٹھائے بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔

شیخ فضل الہی ڈنگوی ناولسٹ نے کہا۔ ”ڈاکٹر غریب محمد معلوم ہوتا ہے۔“

یقیناً ڈاکٹر غریب محمد ہی تھا۔ اس قدر تیز بھاگے جانا اور ایسی بہت کدائی میں! آخربات کیا تھی؟

حکیم شاہسواری ایک جلالی لے میں بولے۔ ”اس پر جن سوار ہو گیا ہے۔“

”میرے خیال میں دماغ چل گیا ہے۔“ میرے ڈبل روٹیاں بنانے والے ایک ساتھی نے رائے ظاہر کی۔ جو خود چند مہینے پہلے اس حد تک پاگل ہو گیا تھا کہ سٹی پوسٹ آفس کے پاس ایک درخت کی ٹہنیوں پر چڑھ گیا تھا اور ہر گزرنے والے کو بتاتا تھا کہ وہ اپنے آشیانے میں آرام کر رہا ہے۔“

شیخ فضل علی بولا ”ڈاکٹر اس سے زیادہ پاگل نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ ہے۔“

ہم سب نے اس فقرے کی گہرائی اور اس کے مزاح کو بے حد سراہا۔ ایک ٹرایم اے چکوڑی نے محسوس کیا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیے۔

”معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر غریب محمد کسی مریض کو دیکھنے جا رہا ہے۔ جلدی میں اس لیے کہ کہیں عزرائیل کا شکار اس سے پہلے ہی نہ چھین لیا جائے۔“

یہ مذاق ہمیں کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کیونکہ ایم اے چکوڑی کو ابھی چاکیواڑہ کے حقوق شہریت نہیں دیئے گئے تھے۔ وہ ایک بیرونی آدمی فارز تھا اور بیرونی آدمیوں کو اصلی شہریوں کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کا یہ فقرہ ہمارے بہترین سائنسٹ پر ایک اچھا حملہ تھا۔

حلقہ فائدہ دار ڈی حاجی بھلے ڈینو میرے پاس آیا اس نے پوچھا۔ ”یہ آدمی کون دوڑ رہا ہے؟“

”ڈاکٹر غریب محمد اپنے ہونے والے داماد کو نہیں پہچانتے؟“

”ڈاکٹر غریب محمد! کون؟ میرا حافظہ کمزور ہے۔ آج مجھے افیم نہیں ملی۔ تمہارے پاس ایک روپے ساڑھے چار آنے ہوں گے؟“ اور پھر یک لخت اس نے میری گردن کے گرد اپنی بانہیں حائل کر دیں اور چلانے لگا۔ ”اس شخص نے میرے ایک روپیہ ساڑھے چار آنے چرا لیے تھے میں دو مہینے سے اس کی تلاش میں ہوں۔“

میں نے حالات کو قابو سے نکلنے دیکھ کر بھلے ڈینو کو جھکادیا اور گردن چھڑا بچوں کو پھلانگتا سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں سے جو اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر میں نے فرانا بھرا تو کئی خواجہ والوں کو لتاڑتا ایک گدھا گاڑی پر صاف ہائی جمپ لگاتا اپنے تعاقب کرنے والوں کو دور پیچھے چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر غریب محمد میرے آگے آگے بے تحاشا اس طرح بھاگ رہا تھا جس طرح کہ اس کے سب پچھلے مریضوں کی روحیں اس

کے تعاقب میں ہیں۔

میں چلایا۔ ”ڈاکٹر ڈاکٹر“

اس نے بھاگتے بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر مجھے آواز دی۔ ”اسپ‘ میری دکان پر جا کر میز کے کپڑے کے نیچے جا کر دیکھو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ وحشت اور دیوانگی نے اس کے چہرے کو اس قدر مسخ کر رکھا تھا کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے کوئی خطرناک ارادہ ہے۔ اب ڈاکٹر پرامینڈ پر تھا۔ پرامینڈ دریائے لیاری کے کنارے پر ایک پختہ بند ہے۔ یہاں سے لیاری میں نیچے اگلے تھاپتی ہوئی عورتیں اور کچڑ میں لیٹی ہوئی بھینسیں ایک دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ سنہری کچڑ اور بھینسوں کے پیچھے غروب آفتاب بے حد حسین ہوتا ہے۔ چاکو واڑہ کے باشندے اکثر پرامینڈ پر غروب آفتاب کا حسین منظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ لیکن اس وقت لیاری واقعی ایک دریا تھا۔ میرے سامنے پانی ہی پانی تھا۔ متلاطم پتھروں کے اوپر دوڑتا ہوا کف آلود بھرا ہوا پانی۔ ڈاکٹر غریب محمد پرامینڈ کی منڈیر پر چڑھ گیا۔ شام کے مٹتے ہی گلاب جیسے پس منظر پر ایک اکیلی عجیب و غریب تصویر۔ ڈاکٹر نے بازو اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ اس نے ایک بار زور سے یا علی کا نعرہ لگایا اور میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر غریب محمد نے دریائے لیاری میں چھلانگ لگا دی تھی۔ یہ اس عظیم سائنٹسٹ کا انجام تھا۔ لیکن اس انجام کا ذمہ دار کون تھا۔ اس کا آلہ مقیاس الحبث‘ راقبہ اس کی اپنی بڑھتی ہوئی دیوانگی۔

بہر حال میں جانتا تھا کہ پاکستان میں ایک ایسے موجد کی قابلیتوں اور ریسرچ سے محروم ہو گیا ہے جس کی نظیر یہ صدی شاید ہی پیش کر سکے۔

ڈاکٹر کی دکان کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ اندر کوئی نہ تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ڈپنری میں کسی کام سے گیا ہے اور ایک منٹ میں آجائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ آئے گا۔ کبھی نہیں۔ میں نے میز پر سے کپڑا سر کا یا۔ ایک میرے نام کا بند اور سر بمہر لفافہ تھا جس کے اوپر مقیاس الحبث رکھا تھا۔ مقیاس الحبث کی سوئی 6- پر تھی۔ میں نے لفافہ کھولا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

”میں ڈاکٹر غریب محمد‘ مقیاس الحبث کا اصلی موجد (صرف وہ تعویذ جو اس آلے میں بند ہیں‘ حکیم اللہ لوک سنیا سی کے ہیں) اب اپنی عمر کے ۷۳ سال میں اپنی بے کار زندگی کو ختم کرنے کے لیے جارہا ہوں۔ دریائے لیاری کا پانی بارشوں کی وجہ سے چڑھا ہوا

ہے اور خود کشی کرنے کا ایسا نادر موقع چا کیواڑہ کے باشندوں کی زندگی میں روز بروز نہیں آیا کرتا۔

آپ پوچھیں گے کہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر، کئی عجیب و غریب ایجادوں کا موجد، مقیاس المحبت جیسی حیران کن چیز کا دریافت کرنے والا، کیوں عزت اور دنیاوی شہرت کو ٹھکرا کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ نا کامی محبت ہے۔ آج وہ عورت جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے مجھ سے بے انداز محبت ہے میرے پاس آئی۔ میں نے اس وقت جب وہ اپنے مدھر ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھنے کے لیے بڑھا رہی تھی، مقیاس المحبت سے اس کے درجہ محبت کو ناپا۔ افسوس اس کی محبت جھوٹی تھی۔ اس کے عہد و پیمان جھوٹے۔ اس کی مدھر آنکھوں کا نشہ جھوٹا تھا۔ مقیاس المحبت پر سوئی کی ریڈنگ 6- ڈگری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی محبت ظاہری تھی اور حقیقت میں اسے مجھ سے نفرت تھی۔“

”آپ اتفاق کریں گے کہ اب میرے لیے اس دنیا میں رہنا بے سود ہے۔“

”میں اپنی یہ دکان جو چا کیواڑہ کا بہترین پرائیویٹ مطب ہے، اپنے دوست اسپ کے حوالے کرتا ہوں۔ میری اولاد زینہ کوئی نہیں (میں نے شادی نہیں کی اور یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) نہ میرے کوئی ایسے رشتہ دار ہیں جو میری زندگی میں اپنے آپ کو میرے رشتہ دار کہتے ہوں۔ اسپ میرا بہترین دوست ہے۔ اس مطب کے کئی تیر بہدف نسخوں کی تیاری کے لیے اس نے اپنی جان تک لڑا دی تھی اور عرصے تک مثلاً بلبلوں کی تلاش میں مجنوں کی طرح دشت و صحرا میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اسپ ڈاکٹری کے پیشے کو ڈبل روٹیاں بنانے کے پیشے سے زیادہ منفعت بخش اور سہل پائے گا۔“

”اپنی ایجاد مقیاس المحبت بھی اس کو دیتا ہوں اور ساتھ یہ نبیہ کرتا ہوں کہ اس کو ہرگز استعمال نہ کرے اور نہ اس کو عام کرے۔ اس کے استعمال کے نتائج انتہائی طور پر خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جس طرح خود میرے کیس میں۔ یقیناً اس سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر میں زندہ رہتا تو میرا ارادہ تھا کہ اس آلے میں ایسی اصلاح کی جائے کہ بعض عملوں سے نفرت کو محبت میں تبدیل کیا جاسکے۔ مگر یہ خداوند تعالیٰ حق شانہ کو منظور نہیں تھا۔ اب میں دریائے لیاری کی طرف روانہ ہوتا ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بارش ختم جانے کی وجہ سے پانی اتر جائے گا۔“

مقیاس المحبت میرے پاس ہے اور ڈاکٹر کی وصیت بھی۔ اگرچہ اس کی دکان کو حکومت نے مرحوم کی خواہش کے خلاف میرے نام الاٹ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن میں مرحوم ڈاکٹر کی وصیت پر عمل کروں گا۔ مقیاس المحبت کبھی مارکیٹ میں نہیں آئے گا۔ میں چا کیواڑہ میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً مایوسی اور غم نہیں پھیلاتا چاہتا۔ اگر نو جوان عاشق چند سال ایک رنگین دھوکے اور فریب

میں کاٹ دینا چاہتے ہیں تو میں ان کی زندگیوں میں شک و شبہ کیوں پیدا کروں۔ ان کو اپنی خود فریبی کی دنیا میں مست ہی رہنے دینا چاہیے۔

میرے پاس مقیاس المحبت ہے لیکن میں ایک نہایت ناخوش انسان ہوں۔ آج پھر میں نے اس کو کلائی پر باندھا اور مختلف اشیاء کا درجہ محبت ناپا۔ نتیجہ پہلے کی طرح مایوس کن تھا۔

اونٹ (+4)

گھڑا سر پر رکھے ایک (-3)

بغیر گھڑے کے ایک عورت (-3)

نتیجہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔ عورتوں کا صفر اب 3- ہو گیا ہے۔ اونٹ کی محبت اسی طرح بدستور پائیدار ہے۔ آئندہ سال کی بارشوں میں شاید میں بھی.....



تنقید نگاری سے توبہ

مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اور میں انہیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے جس طرح بعض لوگ شاعریا پیدا کشتی مختصر افسانہ نویس ہوتے ہیں۔ غالباً میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔

پچھلے دو تین سال کے عرصہ میں میں نے ادیب سازی کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ میرا ریویو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

”خیال نو“ کا ایڈیٹر جو میرا دوست ہے مجھے کتابیں ریویو کرنے کے لیے بھیجتا ہے۔ میں ان کو ادھر ادھر سے الٹ کر کسی صفحہ کو کھول کر دو تین سطریں پڑھتا ہوں۔ مثلاً

اس نے کہا ”چائے کی پیالی پیو“

بھورے خان نے کہا۔ ”شکر یہ میں ابھی ابھی لیمن پی کر آیا ہوں۔“

اور پھر کتاب کو بند کر کے اس پر تین چار صفحے کا ریویو گھسیٹ دیتا ہوں۔ اگر کتاب ذرا اہم ہوئی تو میں اسے اپنے بھانجے کو (جو آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا ہے) پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت اس سے کہتا ہوں کہ مجھے اس کا پلاٹ سنائے۔ اگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا تو سمجھ لیتا ہوں کہ کتاب فی الواقع ہائی برو ہے اور اپنے ریویو میں سے وقیع اور عالمانہ بتاتا ہوں۔ اب تک یہ طریقہ بہت کامیاب رہا تھا۔ کتنا کامیاب آپ کو اس شہرت سے اندازہ ہو سکتا ہے جو اس سلسلے میں مجھے حاصل ہے۔ خود میرے ریویووں پر ریویو لکھے جا چکے ہیں۔ اور مجھے ادب کا ہونہار ترین نوجوان نقاد تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ”خیال نو“ جو اس وقت اردو ادب کی آواز ہے۔ اپنے ہر شمارے میں میری تصویر کے نیچے یہ چھاپتا ہے۔ ”مسٹر شداد پشی اردو کے ہونہار ترین نوجوان نقاد“ وغیرہ وغیرہ

لیکن چند دنوں سے اسی تنقید نگاری کی بدولت میں ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ریویوننگ اتنی پر خطر بھی ہو سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب گلابوں کی بیج ہے۔ اب اس کے خطرات مجھ پر کھلے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مصیبت کی وجہ سے حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر چکے ہیں کہ کتابیں ریویو کرنا تو رہا ایک طرف میں نے گھر سے باہر نکلنا بھی ترک کر دیا

ہے اور اب کراچی چھوڑ کر کسی اور جگہ کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ وہ جگہ ہے نا جہاں وہ کیا مصرعہ ہے؟ ہمزباں کوئی نہ ہو۔ اور میزباں کوئی نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ٹھیک اسی جگہ میں جانا چاہتا ہوں۔ صرف وہ جگہ اب مجھے راس آ سکتی ہے۔ کیا کوئی صاحب مجھے اس کا اتہ پتہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔

مصیبت کا آغاز یوں ہوا کہ ”خیال نو“ کے ایڈیٹر نے مجھے ایک ناول ریویو کرنے کے لیے دیا۔ میرا بھانجا کہیں باہر گیا ہوا تھا اور پھر میں سمجھا کہ ناول اتنا اہم بھی نہیں ہے۔ (اس کا مصنف کوئی غیر معروف شخص تھا) میں نے درمیان سے ایک صفحہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ ”میں پاگل ہوں۔ میں پاگل ہوں۔“ عبدالشکور نے اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دوست حکیم عبدالعلی نے اس کو اس سے باز رکھنے کے لیے کشمکش کی۔

”کپڑے مت پھاڑو میاں عبدالشکور“ میاں عبدالعلی نے کہا۔ ”یہ قمیض جو تم پہنے ہوئے ہو میری ہے۔“

میں نے کتاب کو ایک اور جگہ سے الٹا۔ یہاں اس قسم کے نادر جواہرات جڑے تھے۔ اگر عبدالشکور اپنے تحت الشعور کو کسی طرح اپنے الشعور میں مدغم کر سکتا تو اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کو خود بخود ملازمت مل جاتی اور اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ خود بنفس نفیس ملازمت کو طشت پر رکھے اس کے پاس حاضر ہوتا۔ اس کے مکان کا پچھلے دو ماہ کا کرایہ خود بخود ادا ہو جاتا اور اس کے قرض خواہ اس کی خوش طبعی سے متاثر ہو کر اپنے پچھلے قرضے مانگنے کی بجائے اسے اور قرضہ دینے پر اصرار کرتے۔ مگر افسوس کہ عبدالشکور محض دس جماعتوں تک پڑھا تھا۔ افسوس اس نے ڈاکٹر سگمنڈ فرامڈ کی کتاب سائیکالوجی آف نیوراس نہیں پڑھی تھی۔ افسوس اس نے آندرے ژید نہیں پڑھا تھا۔ افسوس وہ بصد کوشش جیمز جاکس کی اولسیس کو ایک صفحے سے آگے پڑھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا اگر وہ کم از کم اولسیس ہی آدھی تک مطالعہ کر لیتا تو اس وقت اس کی نفسیاتی اور جسمانی حالت اس قدر قابل رحم نہ ہوتی اور چائنار اس سے یوں بیوفائی نہ کرتی۔ اب وہ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو جائے گا جیسے اس کے لیے پاگل ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

یہ کافی تھا اور میں کتاب کو بند کر کے اس پر ریویو لکھنے بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ میں میں نے ریویو لکھ ڈالا۔ چھ صفحے کا ریویو۔ اس میں میں نے لکھا کہ اس ناول میں مصنف محترم ذوالفقار خان نے ایک بے کار تعلیم یافتہ نوجوان کے جذبات کی فرامڈین نقطہ نظر سے تجزیہ نفسی کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اس میں زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ پھر بھی ان کی اس کوشش کو نا کامیاب بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں مگر ان کی

رومانیت پرستی سب کئے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ان کی کردار نگاری کی تکنیک خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔ یعنی وہ اپنے کرداروں کے چھپے چھدرے تحت الشعور میں گھس کر ان کی زبان سے بولتے ہیں اور جب اس شاندار اور بے حد رقت انگیز سین میں عبدالشکور جو اس ناول کا ہیرو ہے اپنے کپڑے پھاڑ کر چلاتا ہے۔ میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں۔ تو ہمیں صاف طور پر اس میں مصنف خود بولتا نظر آتا ہے۔ محترم ذوالفقار خان میں ایک عیب یہ ہے کہ وہ کرداروں کو باہر سے ٹٹولتے ہیں اور ان کے بارے میں گہرائی سے نہیں لکھتے۔ لیکن امید ہے کہ اپنی اگلی کتاب میں وہ اس کے بالکل برعکس تکنیک استعمال کریں گے۔ ان کی پہلی ہی کتاب سے سب کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ سب نے محسوس کیا ہے کہ ایک نیا ادیب منصف شہود پر جلوہ گر ہو چکا ہے جس کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب کو چار چاند لگنے کی توقع ہے۔ مگر ذوالفقار خان کو سنبھل سنبھل کر بڑھنا ہوگا۔ ابھی نہیں فعل نگارش کے متعلق بہت کچھ سیکھنا ہے اور نفسیات کی سب کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ ان کے ناول سے گمان ہوتا ہے کہ عبدالشکور نے (جو غالباً مصنف خود ہی ہے) ابھی تک ”سائیکالوجی آف نیوراس“ نہیں پڑھی۔ آندرے ژید نہیں پڑھا۔ میں محترم ذوالفقار خان سے پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ اگر انہوں نے خود اپنے اقرار کے مطابق نہ فراڈ کو پڑھا ہے نہ آندرے ژید کو اور نہ جاس کو تو پھر انہوں نے پڑھا کیا ہے کیا ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر وہ ہمیں کیسے کوئی ٹھوس یا جامد تخلیق دے سکتے ہیں۔ راقم الحروف نے خود ان تینوں مصنفوں کو ہائی سکول ہی میں پڑھ ڈالا تھا۔ اس زمانے میں شاید ذوالفقار خان پتنگ اڑاتے ہوں گے یا بہرام ڈاکو عرف بے وفا مجاہد کی قسم کے ناولوں سے اپنی راتوں کی نیند حرام کرتے ہوں گے۔ محترم ذوالفقار خان چینی کلاسیکل مصنف جنگ پھنگ پھوں سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں (یہ نام میں نے اسی وقت فرضی گھڑ لیا تھا) اور انہوں نے اپنے ناول کے پلاٹ کا سلسلہ میں مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول ”چیکو! چیکو!“ سے کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔

کچھ اس قسم کے الفاظ تھے میرے ریویو کے۔ لفظوں کے کچھ ہیر پھیر کے ساتھ میں اس موضوع کے متعدد ریویو پہلے کر چکا تھا اور ایڈیٹر ”خیال نو“ کو یہ ریویو حوالہ کر دینے کے بعد میں اس کے اور محترم ذوالفقار خان کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔ جب یہ ریویو ”خیال نو“ میں چھپا تو اس سے تین روز بعد مجھے محترم ذوالفقار خان کا خط موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے میرے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ انہوں نے چنگ پھنگ پھوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اور اگر ان کے ناول کی مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے ناول سے کچھ مشابہت ہے تو اسے محض اتفاق پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ آیا میں ان کو مسٹر چنگ پھنگ پھوں کے پتے سے آگاہ کر سکتا ہوں جس سے عظیم چینی مصنف کے ناول ”چیکو!“

کا انگریزی زبان کا ایڈیشن دستیاب ہو سکے۔

میں نے جواباً لکھ بھیجا۔ ”چیکو چیکو تو میں نے اصل چینی زبان میں پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ابھی ناول کا انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔“

میرا خیال تھا معاملہ یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے دن میں ابھی بستر سے نکل کر شیوہی کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا شاید دودھ والا ہوگا۔ منہ صابن کے جھاگ میں لتھڑا ہوا ہاتھ میں برش اس حلیہ میں میں نے دروازے کو تھوڑا سا کھول کر محتاط انداز میں باہر سر نکالا۔

”کیا آپ ہی شدا دیشمی ہیں۔“ ایک کچھ دار مونچھوں والا خطرناک شکل کا انسان دروازے کے پاس کھڑا تھا۔

”ہاں مجھے یہی کہا جاتا ہے۔ دوست احباب صرف دیشمی کہتے ہیں۔“ میں نے مسکرانے اور خراٹے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی تعریف؟ کیسے آنا ہوا؟“

”میں ذوالفقار خان ہوں اور آپ کے حوصلہ افزا ریویو کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔“

میں اس کو اچھے اخلاق میں شمار نہیں کرتا کہ مصنف لوگ بالکل ہی تبصرہ نگار کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائیں اور خط و کتابت پر اکتفا نہ کر کے اس کے گھر کا کھوج جائیں۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ صبح ہی صبح ذوالفقار خان کی قسم کے مصنف کو اپنے دروازے کے باہر کھڑا دیکھنا کسی تبصرہ نگار کے دلی سکون میں اضافہ کا موجب نہیں بن سکتا۔ میں نے صابن کی جھاگ میں سے اپنے جبرے چیر کر اس پر یہ ظاہر کیا کہ میں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔

میں نے کہا ”آخا ذوالفقار صاحب آئیے آئیے اندر تشریف لائیے۔ آپ کی کتاب کئی حیثیت سے غیر معمولی تھی۔“

وہ اندر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور میں ہاتھ میں برش پکڑے اس کے سامنے والے صوفے پر۔

”ہاں تو وہ آپ کی کتاب خوب تھی۔“

”آپ شیو تو کر لیجئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس شخص کی موجودگی میں میرے لیے شیو کرنا ممکنات میں سے ہے۔ شیو کرنے کے لیے دلی سکون اور روحانی اطمینان ضروری ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح شاید مجھے اس سے جلد چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

”شیو کروں گا۔ آپ فرمائیے۔ اتنے سویرے سویرے۔“

”ہاں وہ چینی کتاب ”چیکو چیکو“ آپ کے پاس ضرور ہوگی۔ آپ نے اپنے ریویو میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ وہ نہیں تو چنگ پھنگ پھوں کا کوئی دوسرا شاہکار۔“

”وہ کتاب چیکو چیکو! ہاں مجھے یاد آیا میں کل ہی تو اسے پڑھ رہا تھا۔ مسٹر چنگ پھنگ پھوں یہی نام ہے نا۔ اس وقت چین کے کلاسیکی روایت میں لکھنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ وہ جو میں نے آپ کی کتاب پر اپنے ریویو میں لکھا تھا کہ اس کی چنگ پھنگ پھوں کی کتاب سے مشابہت ہے۔ تو....“

”آپ نے چینی زبان کب سیکھی تھی؟“ مسٹر ذوالفقار نے بات کاٹنے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”غالباً اس وقت جب میں لکڑی کے گھوڑے پر سیر کیا کرتا ہوں گا۔“

میں نے اس سوال میں نیش زنی کو نظر انداز کر کے اتنی ہی سنجیدگی سے دور ایک مفکرانہ طور پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”غالباً ۱۹۲۸ء میں“ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔“

مسٹر ذوالفقار نے قطع کلامی کر کے مجھے مزید دروغ گوئی سے بچاتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ نے لن یونانگ کی کتابیں پڑھی ہیں؟ وہ سب تو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ہاں اچھا لکھتا ہے“ مگر خارجی سکول کا مصنف ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں داخلیت نہیں۔ پھر بھی برا نہیں۔ میں نے تو اس کی کتابیں اصلی چینی زبان میں پڑھی ہیں۔ ترجمہ میں دراصل وہ بات نہیں رہتی۔“

”اور پنگ پانگ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ ذوالفقار خان نے پوچھا۔

”اچھا لکھتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اگرچہ میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ چین کی عوامی زندگی کا اس وقت وہ واحد عکاس ہے۔ مگر رومانیت کا رنگ لے آتی ہے۔ وہ میری رائے میں اس کی اصلی خوبیوں میں سے بہت کچھ منفی کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ اس وقت چینی ادب کا آندرے ژید ہے۔“

”معاف کیجئے۔“ مسٹر ذوالفقار خان نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔

”آٹھ بجے مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ پنگ پانگ کے متعلق آپ کے ان ارشادات کو میں یہاں کے ہر ادیب تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ خاطر جمع رکھئے اور ویسے جاتے جاتے یہ عرض کر دوں کہ پنگ پانگ ایک کھیل کا نام ہے جو گیند سے میز پر کھیلا جاتا ہے۔“

”میرا مطلب طریقہ فکر کی مشابہت سے تھا۔ آپ سمجھتے ہیں نا۔ Subjective طریقہ نہ کہ Objective آپ سمجھتے ہیں نا۔“ میں نے بازو ہلا کر اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں برش سے اپنی ناک پر سفیدی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

”وہ کتاب تو آپ کے پاس ہوگی ہی! بات یہ ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو چینی ہی فنکاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں۔ پیپر روڈ پر ایک چینی دندان ساز آہ فنگ میرا دوست ہے۔ میں اس سے اگلے ہی روز دو ڈاڑھیں نکوا چکا ہوں۔“ مسٹر ذوالفقار خان نے حلق کھول کر اور انگل ڈال کر مجھے نکلی ہوئی ڈاڑھوں کی جائے وقوع دکھانے کی کوشش کی۔ ”میرا ارادہ ہے کہ آہ فنگ کی مدد سے میں ”چیکو چیکو“ کا اردو ترجمہ کروں۔ ورنہ آپ تو ہیں ہی“

”ہاں ضرور کیجئے۔ ہمیں اردو دان طبقے کو چینی ادب سے روشناس کرانا چاہیے۔ ضرور کیجئے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا تو مجھے وہ کتاب ایک دو دن کے لیے عنایت کر دیجئے۔“

”کون سی کتاب۔“ میں اس کتاب کے متعلق بھول گیا تھا۔

”وی چیکو! چیکو!..... چنگ مہنگ پھوں کا شاہکار۔“

”وہ کتاب ہاں! میں نے خدا جانے اس کو کہاں رکھ دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پرسوں بھی تو وہ میرے پاس ہی تھی۔ دراصل یہ میرا بھانجا ہے نا۔ عجیب نام معقول لڑکا ہے۔ میری کتابیں یہاں سے اٹھا کر لے جاتا ہے اور بھینس کے آگے ڈال دیتا ہے۔“

”بھینس کے آگے؟“ مسٹر ذوالفقار نے کرسی پر سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے احتجاج کیا۔

”ہاں، بھینس کے آگے! یہ اس کی ہابیوں میں سے ایک ہے۔“

”مگر پنگ پانگ ایک چینی مصنف بھی تو ہے۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔“

”ذوالفقار صاحب ٹھہریئے چائے تو پیتے جائیئے۔“ مگر میرا ملاقاتی دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔

صابن میرے گالوں پر سوکھ چکا تھا اور ذوالفقار خان کے چلے جانے کے بعد مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا کہ ریویور کی حیثیت سے میرا کیریئر اب ختم ہو گیا تھا۔

مسٹر ذوالفقار خان اپنے وعدے کا پکا ثابت ہوا۔ قابل سے قابل ترین ڈھنڈورچی بھی اس خوبی سے اس کام کو سرانجام نہ دے سکتا تھا جس خوبی سے اسے ذوالفقار خان نے کہا۔ ”ایک ہفتے کے اندر اندر شہر کا ہر ادنیٰ آدمی کافی ہاؤس کا ہر جرنلسٹ اس قصہ کو جانتا

تھا اور ”پنگ پانگ“ کے متعلق میری رائے کو قہقہوں کے درمیان ادبی محفلوں میں دہرایا جاتا تھا۔ کم از کم دو ماہناموں ”صبح“ اور ”سکرین“ کے تنقید نگاروں نے طویل مقالوں میں میری خوب خبر لی۔ (تنقید نگاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کاش ہم لوگوں میں یونین اپرٹ ہوتا) مہینے کے اندر اندر ساری ادبی دنیا اس مذاق سے واقف ہو گئی تھی اور اب جب کہ تین ماہ بعد بھی لوگ مجھے دیکھتے ہیں تو ان کی باچھیں چرنے لگتی ہیں۔ اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ”پنگ پانگ“ کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟“ میرے لیے گھر سے باہر نکلنا دو بھر ہو گیا ہے۔

میرا دوست ”خیال نو“ کا ایڈیٹر اب مجھے اپنے رسالے کے لیے ریویو لکھنے کی دعوت نہیں دیتا۔ میں اب اس جگہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اس جگہ جہاں ہم زبان کوئی نہ ہو۔ اور مہمان کوئی نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ اور وہاں ذوالفقار خان بھی نہ ہو۔



زیر اسکیم

زیروں کی درآمد کرنے کا انوکھا خیال چچا عبدالباقی کے ذہن میں پہلے پہل غالباً اس اتوار کو آیا جب ہم چچا عبدالباقی اس کا سات سالہ لڑکا عبد الرحمن اور میں چڑیا گھر میں جانوروں کا معائنہ کرنے گئے۔ معائنہ کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ جس طریق سے چچا جانوروں کو غور اور سنجیدگی سے دیکھتا ہے۔ اس کے لیے معائنہ کا لفظ ہی مناسب ہے۔

میں نے غالباً پہلے بھی کہیں عبد الرحمن کا ذکر کیا ہے۔ وہ نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے۔ جسے اپنے بڑوں کا ذرا بھر بھی پاس ادب نہیں۔ ایسے بچوں کی ہی وجہ سے بزرگ حضرات کو قیامت کے قرب کا احساس ہو چلا ہے۔ ان دنوں میں کچھ روز کے لیے چچا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک طریق سے اس عبد الرحمن کی اتالیقی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اپنے اس شاگرد کی مستقل صحبت چند دنوں سے میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ عبد الرحمن میرا حد درجہ مشتاق ہو رہا تھا۔ پل بھر کے لیے مجھے تنہا نہ چھوڑتا اور میں سر آہیں بھر کر اکثر اس بات پر تعجب کرتا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر مشتاق کیونکر ہو جاتے ہیں۔ چچا کے مکان پر ابھی مجھے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور اس عرصے میں عبد الرحمن مجھ سے میرا مظلور اور سگریٹ لائٹر بطور خود مانگے ہوئے تحفوں کے قبول کر چکا تھا۔ ایک دو روز سے وہ مجھے اس بات پر اکسانے میں لگا ہوا تھا کہ میں اپنی کلائی کی گھڑی بھی اسے نذر کر دوں۔ اس کا سکول کا کام بھی میں اسے کر کے دے رہا تھا۔ چچا عبدالباقی اپنے منہ بولے بھتیجے اور نوخیز ہونہار بیٹے کے درمیان اس قدر محبت اور دوستی کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا اور اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت اور دوستی ایک طرف ہے پھر بھی وہ یہی ظاہر کرتا ہے جیسے میں عبد الرحمن پر جان چھڑکتا ہوں اور اس سے گہری وابستگی اور انس رکھتا ہوں۔

انہی دنوں ایک چمکیلی سنہری اتوار کو چڑیا گھر کے جانور ہمیں دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ چچا عبدالباقی کے ہمراہ چڑیا گھر جانا ایک سعادت ہے۔ ہمارا جانوروں کے معائنہ کا طریق کار یہ تھا کہ ہم ایک جانور کے پنجرے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ چچا ہم سے ایک قدم آتے بالکل پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پہنچ کر رک جاتا ہے اور عبد الرحمن اور میں اس کے پیچھے صف آراء ہو جاتے چچا عبدالباقی چشمہ ناک پر ڈھلکاتے ہاتھ میں بید کی سوئی لئے اور مجسم متانت اور وقار کی تصویر بنے جانور کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے اور عبد الرحمن کو اس جانور کی عادات و خصائل، طریق بود و باش، فلسفہ زندگی وغیرہ پر ایک مبسوط لیکچر دیتا۔ مجھے مختلف

جانوروں کے متعلق اس روز کئی قسم کی معلومات حاصل ہوئیں جو بہت عجیب و غریب تھیں۔ ایک جگہ چچا کا یہ معائنہ پورا کامیاب نہ رہا۔ بد قسمتی سے جانور نے موقع کی سنجیدگی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ ہوا یہ کہ چچا عبدالباقی برازیلی جانوروں کے ایک جوڑے کے پنجرے کے ساتھ کھڑے ہوئے میرے اور عبدالرحمن کے استفادہ کی خاطر برازیلی بندروں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈال رہے تھے اور چچا کی تقریر سننے کے لیے کئی تماشائی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ خود برازیلی بندروں کا جوڑا چچا کی باتوں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تقریر کے دوران میں چچا نے کسی مسئلہ پر زور دینے کے لیے اپنی سوٹی اٹھا کر بندروں کی طرف اشارہ کیا جس پر برازیلیوں میں سے ایک نہایت پھرتی اور صفائی سے سلاخوں سے پنچہ نکال کر سوٹی کو جھپٹ لیا۔ چچا کی تقریر لوگوں کے قہقہوں میں ختم ہو گئی۔ چچا نے ہمیں مڑ کر یقین دلایا کہ برازیلیوں نے یہ محض دل لگی کی ہے اور ان کا سوٹی چھین لینے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ وہ اس سے تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اسے لوٹا دیں گے۔ برازیلیوں کو کئی طریقوں سے سوٹی واپس کرنے پر اکسایا۔ عبدالرحمن نے انہیں دو تین مونگ پھلی کے پیکٹ پیش کئے مگر برازیلی اپنی مزاح کی حس کو بہت دور لے جانے پر تلے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چچا عبدالباقی نے برازیلیوں میں اپنا اعتماد کھودیا۔ ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی اور ان کو دھمکی دی کہ وہ چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر چڑیا گھر کے بعض جانوروں کے برے اخلاق کی شکایت کرے گا اور اس سے اپنے نقصان کے ہر جانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی نوبت نہ آئی اور چڑیا گھر کے ایک ملازم نے آخر خود پنجرے کے اندر جا کر چچا کی سوٹی کر برازیلیوں سے رہائی دلوائی۔

چچا کے سکون طبع کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ہم شیر ببر کے پنجرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ شیر ببر ایک معمر حیوان تھا اور سلاخوں کے پاس لیٹا ہوا ہمیں ایک بیزاری کے عالم میں تک رہا تھا۔ چچا سلاخوں سے آدھ فٹ کے فاصلے پر اپنی سوٹی کو زمین پر ٹیکے شیر ببر کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ ہمیں شیر ببر کی جرات اس کی وسعت قلبی اور اس کی خودی پر ایک تقریر کر رہا تھا اور ہم پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح ایک شیر ببر ایک عام شیر سے یعنی اس شیر سے جو ببر نہیں ہوتا ہر لحاظ سے ممتاز ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ شیر دریا میں سیدھا تیرتا ہے اور اگر وہ تیرتے ہوئے بہاؤ میں مڑ جائے تو پھر واپس کنارے پر آ کر دوبارہ تیرتا ہے شیر ببر نے احتجاج کے طور پر اٹھ کر اپنے بڑے ایال دار سر کو جھنجھوڑا اور خوفناک طریق سے دھاڑا۔ چچا عبدالباقی اور ہم فوراً وہاں سے بھاگے اور زیبروں کے احاطہ کے پاس آ کر دم لیا۔

احاطے میں دوزیرے زمر دیں گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ وہ چاق و چوبند دھاری دار زہرے بھوری خاکستری کھال پر چوڑی

سیاہ دھاریاں خوشنما معلوم ہو رہی ہیں اور چوپایوں کے خلاف اپنی جبلی مخالفت کے باوجود میں انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ چچا عبدالباقی احاطے کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک لکڑی کے بورڈ کی طرف چلا گیا جسے چڑیا گھر کے منتظمین نے ان لوگوں کی خاطر لگوا یا تھا۔ جو زیروں میں کسی قسم کی دلچسپی لیتے تھے۔ اس پر انگریزی میں زیروں کے متعلق ہر نوع کی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ بورڈ کو بغور پڑھنے کے بعد چچا عبدالباقی ہماری طرف آیا اور اس نے عبد الرحمن اور مجھے فخر سے یہ اطلاع دی کہ احاطے میں وہ جو دو خچر نما جانور ہیں حقیقتاً زبیرے ہیں۔

اس نے ہمیں احاطے والے زیروں کے گزشتہ سوانح کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ چچا عبدالباقی ان حیوانوں کے احاطے کے اگلے کونوں اور چست انداز سے بے حد متاثر معلوم ہوتا تھا اور اس کی رہنمائی میں ہم نے احاطے کی جالی دار چار دیواری کے گرد چار پانچ چکر لگائے۔ چچا ان چوپایوں کو ہر ممکن زاویے سے دیکھنا چاہتا تھا۔ عبد الرحمن بھی زیروں کے متعلق کچھ جانتا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ جانتا ہے۔ اس نے اپنی اردو کی کتاب میں زیروں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے درمیان جو مجھے علم الحیوانات کے متعلق مکمل معلومات دینے پر مصر تھے میں نے اپنے آپ کو بے حد جاہل محسوس کیا۔ میں نے تہیہ کیا کہ چڑیا گھر سے جاتے ہی زیروں پر ایک مکمل کتاب پڑھوں گا۔ اور اپنی معلومات عامہ کو وسیع کرنے کی کوشش کروں گا۔ چوپایوں کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ میں ان کے بارے میں جانتا ہوں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ بھینس گوشت نہیں کھاتی اور اونٹ درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ دریائی گھوڑے کے تفریح مشاغل کیا ہوتے ہیں یا شیر کی معاشرتی اور پرائیویٹ زندگی کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ تو میں بالکل کورا ثابت ہوں گا اور بجائے کوئی جواب دینے کے بغلیں جھانکنے لگوں گا۔

چچا عبدالباقی نے اپنا بازو میرے بازو میں دیتے ہوئے کہا۔ ”بھئی بختیار! یہ زبیرے اچھے خوبصورت جانور ہیں۔ اگر ان کی یہ دھاریاں نہ ہوں تو یہ خچروں اور گھوڑوں کی طرح مٹیا لے اور غیر دلچسپ نظر آنے لگیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان زیروں کو وکٹوریہ یا تانگے کے آگے گھوڑوں کی بجائے جوتا جائے تو کیسا رہے۔ ذرا تصور کرو کہ کراچی کی وکٹوریوں کے آگے مریل بھورے گھوڑوں کی بجائے چست دھاری دار زبیرے جتے ہوئے ہیں۔ سنو بھئی بختیار کیوں نہ ایک زبیر اور آدھ کھنٹی کھولی جائے اور نا بختیر یا سے زبیرے در آدھ کیے جائیں اور وکٹوریہ والوں کو مہیا کئے جائیں۔ بڑا اچھا بزنس ہو سکتا ہے۔“

”زیروں کو گاڑی کے لیے غالباً سدھایا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ میں نے زیروں کے متعلق یہ بات کہیں پڑھی تھی یا کسی

سے سی تھی۔

”تم کو کس نے بتایا؟“ چچا عبدالباقی نے روک کر احتجاج کیا۔ ”لوگوں نے شیروں وغیرہ کو سدھا کر چھوٹے چھکڑوں میں جوت رکھا ہے۔ زیرے تو پھر زیرے ہیں۔ آؤ ہم زیرے درآد کریں گے اور بیچیں گے۔ میں خود ان کو سدھانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب وکٹوریہ والوں کو پتا لگے گا کہ انہیں معقول داموں پر خوبصورت چنگبرے زیرے دستیاب ہو سکتے ہیں تو وہ زیروں پر ٹوٹ پڑیں گے۔“

”مگر چچا! فائدہ کیا؟ گھوڑے کیا کریں گے؟ گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔“

”وقت آ رہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔ بھتیجے بختیار خلی! واللہ مجھے گھوڑوں کے خلاف کوئی بغض نہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔“

چڑیا گھر کے ایک ملازم کے بتانے پر کہ اب چڑیا گھر بند ہو رہا ہے اور پھر چار بجے شام کو کھلے گا، ہم نے زیروں کو خیر باد کہا اور پھانک کی طرف بھاگے زیروں کی درآد کی تجویز پر بحث پھانک تک ہوتی رہی اور جب وہاں سے گھر کے لیے دوہری چھت والی بس میں سوار ہوئے تو چھت کے اوپر بھی یہ بحث جاری رہی۔ چچا عبدالباقی کی واضح دلیلوں کے باوجود کہ زیروں کی درآد بے حد منافع بخش رہے گی، میں ابھی پوری طرح مطمئن نہ ہوا اور میرے شکوک کلی طور پر رفع نہ ہوئے تھے۔

چچا کے ڈرائنگ روم میں شکر کی چائے پیتے ہوئے ہماری گفتگو کا موضوع زیرے تھے۔

”دیکھو بھئی! بختیار! میری بات سنو۔“ چچا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”فرض کرو ہم پہلے پہل سوزیرے درآد کریں اور ان کی پہلی افزائش نسل کا انتظام کریں۔ سال کے اخیر تک اگر ہمارے پاس پانچ سوزیرے بھی ہوں، ممکن ہے ہزار ہوں یا دو ہزار۔ میں کم سے کم تخمینہ لگا رہا ہوں۔ ہاں اگر پانچ سوزیرے بھی ہوں اور ہم ان کو پانچ سو روپیہ فی زیرہ کے حساب سے بھی فروخت کریں تو پانچ سو روپیہ ضرب پانچ سو کتنے ہوئے؟ عبد الرحمن بھئی پانچ سو کو ذرا پانچ سو سے ضرب تو دو۔“

عبد الرحمن نے اپنی کاپی پر ضرب دے کر جواب بتایا۔ ”پانچ سو پچاس“

”پانچ سو پچاس روپے ہوئے۔ ہاں بھئی بختیار پانچ سو پچاس۔ مگر بھئی عبد الرحمن پانچ سو پچاس کیسے ہوئے؟“

”دو لاکھ پچاس ہزار بنتے ہیں۔“ میں نے زبانی ضرب دے کر بتایا۔ میری ریاضی عبد الرحمن سے قدرے بہتر ہے۔

”دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ چلو پچاس ہزار روپیہ چھوڑو۔ دو لاکھ ہمیں پھر بھی بچتے ہیں اور کتنی مدت میں صرف ایک سال کی

مدت میں اور پھر ہمیں مزید زبیرے در آمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے اپنے زبیرے بڑھتے رہیں گے۔“

”لیکن چچا وہ تو تم نے سال کے اخیر میں سب کے سب بیچ دیئے تھے۔“

”نہیں بھئی، سارے کہاں بیچے تھے اور پھر جن کو ہم زبیرے فروخت کریں گے ان کو اس شرط پر فروخت کریں گے کہ ان میں

سے جو زبیرے پیدا ہوں گے وہ ہماری ملکیت ہوں گے۔ ہم ان لوگوں سے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کرائیں گے۔“

مجھے ابھی تک اس سکیم کی کامیابی کے بارے میں شکوک تھے۔ میں نے ماہنامہ ”الو“ کے اجراء اور دوسری کئی سکیموں کے حسرت ناک انجام کے متعلق سوچا۔ ہم نے ان کو کس طمع طراق کس خود اعتمادی سے شروع کیا تھا اور آخر ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ تو پھر بھی کسی حد تک معقول سکیمیں تھیں۔ یہ زبیروں کی در آمد کی سکیم تو ایک بالکل بے معنی سکیم تھی۔

”دیکھو میرے بھتیجے بختیار“ چچا نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا۔ ”جب کوئی باہمت شخص نئی اور انوکھی چیز شروع کرتا ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہمیں بے وقت لوگوں کے قہقہوں سے نہ ڈرنا چاہیے۔ جب میں نے مرغیوں کی فارمنگ کا آغاز کیا تو کئی میرے اپنے احباب مجھ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے۔ ”عبدالباقی شرط رہی کہ مہینے کے اندر اندر تم ان مرغیوں کو خود کھا جاؤ گے۔“

”اور چچا، تم واقعی کھا گئے؟“

”تمہیں کیسے پتا ہے؟“

”تم نے خود ہی ایک دفعہ بتایا تھا۔“

”بھئی بختیار! وہ اور بات ہو گئی تھی۔ ہم نے آغاز ایک سو مرغیوں سے کیا۔ انہی دنوں مجھے در و گردہ کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے خوراک یہ تجویز کی کہ ہر روز مرغ بخنی پیا کروں۔ پھر گھر میں روز چار مہمان آ کر رہنے لگے۔ وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مشورے کرنا چاہتے تھے۔ مرغیوں کی فارمنگ شروع کرتے ہی میں احباب میں بے حد مقبول ہو گیا تھا اور وہ اکثر شام کو میرے غریب خانہ پر آ موجود ہوتے تھے۔ جب مرغیاں ختم ہو گئیں، میری مقبولیت فوراً گھٹ گئی۔ ہاں تو بھئی، بختیار، وہ مرغیاں زیادہ تر احباب کھا گئے۔ جو کچھ تھوڑی بہت بچ گئی تھیں انہیں بالاقساط پڑوسیوں کا ایک بلا پکڑ پکڑ کر کھاتا رہا۔ خیر یہ تو دوسرے قصے شروع ہو گئے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زبیروں کا معاملہ دوسرا ہے۔ تم بھی اس پر سوچو اور میں بھی اس پر غور و فکر کرتا ہوں۔“

”چچا پہلے ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ آیا گھوڑے گاڑی والے زبیرے جو تنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟“

”آمادہ کیوں نہ ہوں گے۔ آخر انہیں کون سا نقصان ہے۔ یہی تو میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے پہل کوئی

بات کی جائے تو ہر کوئی ہنستا ہے۔ جب پہلے پہل ہنری فورڈ اپنی فیکٹری میں پہلی موٹر کار میں چڑھ کر باہر نکلا تو تمہیں پتا نہیں کہ دیکھنے والوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ گئے۔ زیرے آجائیں تو ان کو فروخت کرنے سے پہلے ہم ایک نمائشی زیبرا گاڑی رکھیں گے اور اس میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لیے میکوڈ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزرا کریں گے۔ اس طرح لوگ زیروں کو کوٹور یہ کے آگے جتا ہوا دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ جدت جڑ پکڑنے لگے گی۔ یہ نمائشی گاڑی بڑی ضروری ہے۔ اب میں تمہیں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ شروع شروع میں جب میں کراچی آیا تو لوگ میری ترکی ٹوپی پر تعجب کرتے اور ہنستے تھے۔ اس وقت یہاں بہت کم ترکی ٹوپی پہننے والے لوگ تھے۔ اب تم خود جانتے ہو ترکی ٹوپی کس قدر عام نظر آتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے میں الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزرا رہا تھا۔ سامنے سے چار اچھے بھلے پروقار شخص ترکی ٹوپیاں پہنے ایک قطار میں چلتے میرے پاس سے گزرے انہوں نے مجھے السلام علیکم کہا حالانکہ وہ مجھ سے واقف نہ تھے اور مجھ سے پیراڈائز سینما کا راستہ دریافت کیا۔ تو یہ بات ہوتی ہے۔ بھی بختیار پہلے زیروں کے خلاف تعصب کو دور کرنا ہے۔ ایک دفعہ وہ تعصب دور ہو گیا تو زمین ہموار ہے اور گھوڑوں کے متعلق میری اس بات کو پتھر پر لکیر سمجھ لو کہ گھوڑوں کا مستقبل قطعاً روشن نہیں، تاریک ہے۔“

”تمہاری رائے میں گھوڑوں کا اب کوئی چانس نہیں۔ انہیں میدان چھوڑ دینا چاہیے۔“

”زیروں کے سامنے وہ نہیں ٹھہر سکتے۔ میرا ایمان ہے۔“

میرا اب بھی اطمینان نہ ہوا۔ مگر چچا عبدالباقی نے جمہوری اصول کے مطابق ووٹ لے کر جس میں زیر اپورٹ کمپنی ضرور قائم کی جائے گی، سرمایہ کی فراہمی کا کام میرے ذمہ تھا اور باقی کاروبار کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو پہلی سکیموں میں ہوتی تھیں۔ چچا عبدالباقی اس بزنس میں آدھے سے زیادہ کا حصہ دار ہونے کا روادار نہ تھا۔ وہ بلا تنخواہ میٹنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر تیار تھا۔ اگر میں چاہوں تو عبد الرحمن کو بھی ایک تیسرے شریک کی حیثیت سے لیا جاسکتا تھا مگر اس کا فیصلہ کلی طور پر میری دلی منشا پر چھوڑ دیا گیا۔

”سرمایہ اب کیسے حاصل کیا جائے؟“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس تو صرف چار روپے آٹھ آنے ہیں اور میرا والد اب روپے

کے معاملے میں سخت گیر ہو گیا ہے۔ انہیں میری سکیموں پر بالکل اعتماد نہیں ہے۔“

”ارے بھی بختیار“ چچا عبدالباقی بولا ”لکھ کے دو دیکھو تین ہزار روپیہ شروع میں کافی ہوگا۔ میں نے سنا ہے اس بار ہڈیوں کا نرخ

کافی چڑھا ہوا تھا اور انہوں نے ہڈیوں کے کاروبار میں کافی ہاتھ رنگے ہیں۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے اور جائز وارث ہو۔ ان کا

روپیہ تمہارے کام بھی تو آنا چاہیے۔ آخر کار تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ بھی روپیہ کمانا چاہیے۔ اتنے تفکرات کے باوجود میں اب بھی جب صبح بستر سے اٹھتا ہوں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے گاتا ہوں۔

”او عبدالباقی دیکھ ایک اور نیا دن طلوع ہوا ہے۔ کیا تم اسے یونہی بے فائدہ گزر جانے دو گے؟“

”چچا میں بھی صبح اٹھ کر اپنے آپ کو یونہی الفاظ سے مخاطب کرتا ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”مجھ پر بھروسہ کرو“ چچا عبدالباقی بولا۔ ”زیبرے ہماری مشکلات کو حل کریں گے۔“

جہاں تک اسکیم کا تعلق تھا زیبرا اور درآمد کمپنی کی داغ بیل اسی شام چچا عبدالباقی کے ڈرائنگ میں پڑ گئی تھی۔ مگر سرمائے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ دن گزرتے گئے اور اس عرصے میں میں چچا کے مکان سے کھارادر میں ایک فلیٹ میں ایک دوست کے پاس اٹھ آیا۔ جب بھی میں چچا سے ملتا تو ہماری گفتگو کا موضوع زیبرے ہوتے۔ میں اپنے والد کو روپوں کے لیے لکھنے سے ہچکچاتا تھا کیونکہ میں ان سے اپنی کئی روپیہ کمانے والی سکیموں کے سلسلے میں اتنی مرتبہ روپیہ لے چکا تھا کہ اب ان کا متاثر ہونا محال نظر آتا تھا۔ اپنے پچھلے خط میں انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے ان سے اب کبھی ایک پائی بھی نہ ملے گی اور یہ کہ جہاں تک روپوں کا سوال تھا میں انہیں بھلا دوں تو بہتر ہے۔

آخر مجھے لکھنا پڑا۔ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ واضح الفاظ میں روپے کا مطالبہ کرنے کی بجائے میں نے ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے پہلے تو خط میں انہیں اس سال کے کاروبار میں خوف منافع کمانے پر مبارکباد دی اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ان پر یہ واضح کیا کہ میں نے یہاں ایک امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا ہے اور درآمد کا کام باقاعدہ شروع کر دیا ہے۔ میں نے زیبروں کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرا خیال تھا بوڑھا آدمی میرے اشارے کو بھانپ جائے گا۔ مگر پہلے تو انہوں نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ منافع کے متعلق میری اطلاعات نہایت غلط تھیں اور انہیں اس سال کم از کم پچاس ہزار کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے میرے درآمد کی کمپنی کھولنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر یہ نصیحت بھی کی تھی کہ سرمائے کی کمی سے نہ گھبرانا چاہیے اور یہ کہ جس وقت انہوں نے ہڈیوں کا دھندا شروع کیا تھا ان کی جیب میں کل ساڑھے پانچ آنے تھے میں نے یہ خط چچا عبدالباقی کو دکھایا اور دیر تک ہم بوڑھے آدمی کی خود غرضی اور کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ اس خط کے دوسرے دن ہی مجھے والد صاحب کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ فوراً آؤ۔ تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے اور تمہارا ہونے والا خسر تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہے۔

مجھے جانے میں قدرے تاثر تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلے کئی ہونے والے خسر اپنے ارادے تبدیل کر چکے تھے۔ جب میں نے

یہ چچا عبدالباقی کو دکھایا تو اس نے فوراً جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے کئی ایسے نیک دل خسروں کی مثالیں دیں جنہوں نے شادی کے وقت اپنے دامادوں کو تحفہ پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کے چیک عنایت کئے تھے۔ چچا عبدالباقی کی رائے میں یہ میرے لیے ایک سنہری موقع تھا۔ چچا خود مجھے گاڑی پر چڑھانے کے لیے اسٹیشن تک آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے نہ آیا تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس نے مجھ سے ساڑھے چار روپے ٹیکسی کے لیے قرض لئے چونکہ وہ مجھے رسوا کرانے کے لیے آیا تھا اس لیے غالباً وہ یہ مناسب سمجھتا تھا کہ میں اس کو ٹیکسی میں واپس پہنچانے کا خرچہ برداشت کروں۔ اس دفعہ بھی وہ حسب معمول اپنے پیسے اپنے دوسرے کوٹ کی جیب میں بھول آیا تھا۔ وہ مجھ سے میری کلائی کی گھڑی بھی ادھار لینا چاہتا تھا مگر میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے اسے اس بات کا موقع نہ دیا۔ جب گاڑی نے وصال دی اور رفتہ رفتہ چلنے لگی تو چچا عبدالباقی کچھ دیر پلیٹ فارم پر اس کے ساتھ بھاگتا آیا۔ اس کی گول مٹول پر وقار اور ہنس مکھ ہاتھ ہلاتی ہوئی شخصیت گاڑی کے پلیٹ فارم سے دور تک نکل جانے کے بعد تک مجھے نظر آتی رہی۔ میری آنکھیں بھیگی سی گئیں۔ ہم خلجی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ میں نے افسوس کیا کہ میں نے اسے اپنی کلائی کی گھڑی کیوں نہ دے دی۔

جب میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی گرد اور سیاہی میں ملفوف گھر پہنچا تو بوڑھا آدمی برآمدے میں بیٹھا اپنی داڑھی کو دوسم لگا رہا تھا ایک اور چھوٹا سادہ بلا شخص جو قدرے ایک بھیگی ہوئی چیز کی طرح تھا سامنے کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھا ایک پلیٹ میں سے چلغوزے کھا رہا تھا۔ کسی چیز نے مجھے بتایا کہ یہی وہ ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹ ہے یعنی میرا ہونے والا سر۔ میرا دل میرے بوٹوں تک ڈوب گیا۔ ہونے والے خسروں کا ہمیشہ مجھ پر یہی اثر ہوتا ہے ہم خلجی قدرے نروس ہوتے ہیں۔

”اچھا تو آپ مجھے بتا رہے تھے کہ چک جھنڈو خاں میں آپ کے پندرہ مربیعے ہیں۔ آپ کے نام ہیں یا آپ کے رشتہ داروں کے نام؟“ ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹر میرے والد سے پوچھ رہا تھا۔

”میرے اپنے نام ہیں۔“ میرے والد نے جواب دیا۔

”گو جرانوالہ میں گویا دو کوٹھیاں ہیں آپ کی!“

”چار“ میرے باپ نے کہا۔

”آپ کا بیٹا غالباً اکلوتا ہے۔“

”ہاں“

”اب آپ کی عمر کتنی ہوگی؟“

”پچھتر سال“ میرے باپ نے فخر یہ کہا۔ ”ابھی تک میرا ایک دانت نہیں ہلا۔ میں آج کل کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوں۔“

”ڈیا بیٹس کی شکایت تو ضرور ہوگی؟“ اکسائز انسپکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔ ”آپ شوگر ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ بعض دفعہ پتہ نہیں چلتا۔“

اتنے میں میری موجودگی کا پتہ چلا۔ میرے باپ نے میرا ریٹارڈ اکسائز انسپکٹر سے تعارف کرایا۔ گفتگو غالباً اس قسم کی ہوئی۔ ”برخوردار بیٹھو آج کل کہاں ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کراچی سے آیا ہوں۔“

”کیا کرتے ہیں وہاں کراچی میں؟“

”میں بزنس کرتا ہوں۔ امپورٹ ایکسپورٹ“

”کونسا بزنس کرتے ہیں؟“

”ڈیزل انجن، ملز، بجلی کی موٹریں، حجامت کے استرے، زیبرے“

اکسائز انسپکٹر زیبروں پر کچھ چونکا۔ مگر پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ زیبرے بھی کسی مشینری کا نام ہوگا، اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہوں“

”آپ کے پاس وہاں کراچی میں کونسی میک کی کار ہے۔ شیویا پائینک؟“

”میرے پاس سائیکل ہے۔ ہرکولیس 1943ء ماڈل“

اکسائز انسپکٹر نے میرے باپ کی طرف قدرے گھور کر دیکھا جس نے اسے بتایا تھا کہ میرے پاس کار ہے۔

”آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟“

”بی اے پلکڈ ہوں۔“

”یعنی بی اے پاس نہیں کر سکے آپ؟“

”پانچ چھ سال کوشش کی تھی مگر یونیورسٹی نے ڈگری دینا مناسب نہیں سمجھا۔“

ریٹارڈ اکسائز انسپکٹر اس کے پندرہ منٹ بعد ہی پہلے سے بھی زیادہ بھیگی چڑیا لگتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ میرا باپ مجھ سے بے حد خفا ہوا کہ میں نے بنانا یا کھیل بگاڑ دیا اور اس نے مجھے ریٹارڈ انسپکٹر کے بینک بیلنس اور جائیداد کے متعلق بتایا۔ اس نے شکار کو بڑے

حیلے اور طریقے سے پھانسا تھا۔ ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹر کی تو اس کے بعد کوئی خبر نہ آئی۔ ہاں میرے وہاں جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں چار پانچ ہزار روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈیڑھ ہزار تو بوڑھے آدمی سے بعض عجیب طریقوں سے اینٹھا گیا۔ کچھ میں نے اپنے چند پرانے دوستوں سے لیا جو اب بھٹوں اور کپاس وغیرہ کے کاروبار میں خوب پیسے کما رہے تھے۔ ہم خلجی جب چاہیں کافی میٹھے اور چار منگ لوگ بن سکتے ہیں اور ہمارے خاندان کے افراد ہمیشہ روپیہ ادھار لینے میں اچھے رہے ہیں۔

جب میں روپیہ لے کر واپس پہنچا تو چچا سے زیادہ خوش آدمی نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہم اب اپنی سکیم کو تیزی سے حقیقت بنادیں گے۔ پہلی تو ہم نے میکوڈروڈ کی کئی انگریزی اور دوسری کمپنیوں کے چکر کاٹے اور ان کے مینجنگ ڈائریکٹروں سے تخلیہ میں ملاقات کی اور ان سے زیرے فراہم کرنے کے لیے کہا۔ بہتوں نے سمجھا کہ ہم ان کا مذاق اڑا رہے ہیں اور فوراً ہمیں دفتر سے رخصت ہونے کی درخواست کی۔ بعض نے ہمیں احمقوں کا ایک بے مثل جوڑا سمجھا۔ ایک کمپنی کا ڈائریکٹر تو چچا کے سکیم کی وضاحت کرنے پر اس قدر بے صبر اور غضب ناک ہو گیا کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہمارا اس طرح اس کا وقت ضائع کرنے سے کیا مطلب ہے اور ہمیں تنبیہ کی کہ اگر ہم اسی وقت وہاں سے نہ چلے گئے تو وہ اپنے چوکیداروں کو بلوا کر ہمیں باہر پھینکوادے گا۔

”اب ایک ہی صورت ہے۔“ چچا عبدالباقی بولا۔ ”ان کمپنیوں کو بزنس کرنا ہی نہیں آتا۔ بختیار اب تم کو خود نیروبی جانا پڑے گا۔ وہاں جاتے ہی تم کو پہلے ایک شکاری ”سفری“ کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں تمہیں رائڈر ہیکرڈ کے ایک دو ناول ”شی“ وغیرہ پڑھنے کے لیے دوں گا۔ اس سے تمہیں ایک سفری کے انتظام کرنے کے موٹے موٹے اصولوں کا پتہ لگ جائے گا۔ پہلی چیز جو تمہیں کرنی ہوگی وہ ہے ایک اچھے قابل اعتبار زولو مہتمم کا انتخاب جو افریقی جنگلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ زولو خود ہی سامان اٹھانے والے قلیوں کا انتظام کر دے گا۔ سامان میں تم ایک خیمہ ایک سوٹ کیس اور کچھ کھانے پکانے کے برتن لے جا سکتے ہو۔ ہاں سانپوں کے کاٹے کے علاج کا بکس ساتھ ضرور رکھنا۔ تم ہر بیسویں قدم پر سانپوں سے دوچار ہو گئے۔“

”میں نہیں جا رہا۔“ میں نے جواب دیا۔

آخر بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرا جانا ہر حالت میں ناگزیر ہے اور میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے انیئر لائن اور جہازوں کی کمپنیوں کے دفاتروں میں جا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور کمپنیوں کے سفری لٹریچر کا مطالبہ بڑے انہماک سے کیا۔ ہم یہ طے نہ کر پائے کہ نیروبی جانے کے لیے میرے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ چند دنوں میں ہر کوئی زیبروں کے خرید کے سلسلے میں میرے نیروبی جانے کے متعلق جانتا تھا اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ بہت سے احباب کا خیال تھا کہ میں نیروبی سے واپس آ گیا ہوں۔ خود مجھے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا کہ شاید میں نیروبی کا سفر کر آیا ہوں۔ کئی احباب مجھے بازار میں ٹھہرا کر میرے کراچی میں ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ان کے خیال میں میں ابھی نیروبی وغیرہ میں

ہی تھا۔ بے حد سنجیدہ چہروں سے وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ میں نیروبی سے کب واپس آیا ہوں اور یہ کہ میں کتنے زیرے ساتھ لا سکا ہوں۔ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے کافی ہاؤس میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں ”نقاد“ کے خاص نمبر کے لیے نیروبی پر ایک رپورٹ تاشقلمبند کروں جس میں وہاں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈالوں اور ماہنامے کے قارئین کو زیروں کے پکڑنے کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں۔

اس چرچے اور غل کے باوجود میں نیروبی نہ جا سکا۔ اول تو پاسپورٹ ہی نہ بن سکا اور پھر نیروبی کی حکومت اپنے جانوروں کو بچانے کی اہمیت کے بارے میں تیار ہو گئی تھی۔ اور اپنے ملک میں شکاریوں کے آنے پر قدغن لگا رہی تھی۔ چچا عبدالباقی کی مایوسی دیکھنے کے لائق تھی۔ مگر میں اپنے دل میں کچھ خوش اور مطمئن تھا۔ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور رائڈر ہیکر ڈکے ناول ”شی“ کو پڑھنے کے بعد تو میں کسی حالت میں بھی افریقہ میں جانے کو تیار نہ تھا اور متحیر تھا کہ لوگ آخر وہاں رہتے کیوں ہیں۔

ایک شام کو میں چچا عبدالباقی سے ملاقات کے لیے گیا تو ایک اور شخص کو اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا خوفناک شکل کا شخص تھا اور ان شخصوں میں سے تھا جن کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے چہروں سے ہن برستا ہے۔ مجھے یہ تو اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہن کیا ہوتا ہے مگر اس آدمی کے چہرے سے یہ ہن نٹوں کے حساب سے برس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی زرد اور تاتاری تھیں۔ ہونٹ موٹے اور کچھ احمقانہ تھے اور اس کی مونچھیں لمبی اور الجھی ہوئی تھیں۔ وہ لمبا گلوبند خاکی اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا وہ غالباً مگر مجھ کے چمڑے کے اونچی ایڑی والے کیلڈارفل بوٹ چڑھائے تھا۔ ایک چار بور کی رائفل اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

میں اس کو دیکھ کر اٹے پاؤں جانے لگا تھا کہ چچا عبدالباقی نے مجھے آواز دی۔

”آؤ بھئی بختیار ہمارا کام بن گیا ہے۔“ چارونا چار کمرے میں داخل ہوا۔ چچا ایک دھوتی اور قمیص میں بڑے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ایک مکمل معنک شانت بدھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جسے اس وقت نروان حاصل ہونے والا تھا۔ اس نے لمبی مونچھوں والے خوفناک اجنبی سے مجھے تعارف کرایا۔

”بھئی اچھا ہوا تم آگئے۔ یہ میجر اے آر مسکین ہیں بڑے مشہور بگ گیم ہنٹر ہیں چنانچہ اب پھر بگ گیم کے شکار کے لیے نیروبی پرواز کرنے والے ہیں۔ ان کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ ہمیں زیروں کی ضرورت ہے اور یہ اسی لیے یہاں مجھے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہمارے لیے وہاں سے پچاس زیرے ہر ماہ کے حساب سے شپ کر سکتے ہیں۔ مسکین صاحب ایہ محمد بختیار خلجی صاحب میرے حصہ دار ہیں۔“

میجر نے مجھے اپنی پہلی آنکھوں سے دیکھا اور رد عمل کے طور پر سامنے رکھی ہوئی رائفل کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
میجر نے اپنی رائفل سے کھیلے ہوئے مجھے اور چچا عبدالباقی کو مخاطب کیا۔

”ہاں تو مسٹر عبدالباقی بگ گیم ہنٹنگ کے لیے افریقہ کے گھنے زہریلے جنگلات میں کئی کئی ہفتوں گھومنا پڑتا ہے۔ اگر آپ حضرات نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ قیاس لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں اور خطرے کا ہے۔ سفری کے انتظام میں کافی خرچ آ جاتا ہے چونکہ میں آپ لوگوں کے کام پر نیروبی جا رہا ہوں اس لیے اصولاً تو آپ کو مجھے نیروبی جانے اور وہاں سے واپسی کا کرایہ دینا چاہیے اور وہاں مہم وغیرہ کا خرچ بھی آپ کے ذمہ ہونا چاہیے مگر میں آپ حضرات سے نہ کرایہ لوں گا اور نہ وہ خرچ جو زیبروں کی مہم کے انتظام پر آئے گا۔“

”یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔

”یہ زیبروں کا پکڑنا سخت مشکل کام ہے۔ میں آپ حضرات کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہوں۔ اچھانی الحال آپ کو کتنے زیبرے درکار ہیں۔“

”ڈیڑھ سو۔“ چچا عبدالباقی بولا ”کیوں بھی بختیار فی الحال ڈیڑھ سو کافی ہوں گے؟“

”دو قسم کے زیبرے ہوتے ہیں۔“ شکاری نے کہا۔ ”ایک قسم ذرا بڑھیا ہوتی ہے۔ ایک تو سفید زیبرے ہوتے ہیں جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں پھر بھورے زیبرے ہوتے ہیں جن پر سرخ دھاریاں اور ملگجی دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ حضرات کو کون سے زیبرے چاہئیں؟“

”مے جلع ہوں“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”زیادہ تر اگر سفید زیبرے مل سکیں تو اچھا ہے۔“

”ان کے لیے مجھے نیروبی سے سو میل آگے زینبودریا میں کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ آپ نے ”کنگ سالومنز ٹائٹلز“ اور ٹارزن کا بیٹا فلموں میں دیکھا ہوگا۔ سفید زیبرے غوما کنٹری میں پائے جاتے ہیں۔ غوما کنٹری کے لوگ سخت وحشی اور مردم خور ہیں اور سفید زیبرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے اس خطرے کے لحاظ سے جو مجھے غوما کنٹری میں شکار کھیلنے کے لیے مول لینا ہوگا سفید زیبروں کی قیمت عام زیبروں سے زیادہ ہوگی۔“

”عام زیبروں کی قیمت کتنی ہوگی؟“

”عام زیبرے آپ کو غالباً چار سو روپے جوڑے کے پڑیں گے اور سفید کوئی آٹھ سو کے۔ آپ حضرات کل دس بجے میرے ہمراہ

ہماری کمپنی افریقین ٹریڈنگ کمپنی میں آئیے۔ میرا بڑا بھائی اس کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ آپ ٹرمز وغیرہ وہیں طے کر سکتے ہیں۔“

اس کے بعد اس نے ہمیں اپنے افریقی سفروں کے نہایت دل دہلا دینے والے قصے سنائے۔ باتوں کے دوران میں وہ کئی دفعہ جوش میں آ جاتا اور ہمیں جانور تصور کر کے ہم پر راکفل سے شت باندھ دیتا۔

”ہاں تو چیتا بس وہاں بیٹھا تھا جہاں بختیار صاحب آپ بیٹھے ہیں۔ میں نے فوراً شت باندھی۔ اور ڈڈ ڈڈ“

چچا عبدالباقی اور میں اسے نیچے سڑک پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ چچا عبدالباقی چاہتا تھا کہ میں میجر کو شہر میں لے جا کر کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا وغیرہ کھلاؤں اور سینما وغیرہ پر لے جاؤں۔ چچا نے مجھے ایک طرف لے جا کر کئی ایسے طریقے بتائے جن سے میجر مسکین پر اپنے روپے خرچ کر سکتا تھا۔ میں نے چچا کا ان مفید مشوروں کے لیے شکریہ ادا کیا اور میجر ایک گزرنے والی بس میں دوڑ کر چڑھ گیا۔

”میجر ہے اس کام کے لیے ٹھیک آدمی“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کہا تھا کہ سب کچھ عبدالباقی پر چھوڑ دو۔“

دوسری صبح میجر اے آر مسکین چچا عبدالباقی کے مکان پر آیا اور ہمیں اپنے ساتھ اپنی کمپنی کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر کھارادر میں ایک غیر اہم گلی میں تھا اور باہر ایک نئے رنگے ہوئے سائن بورڈ پر ”افریقین برادران لمیٹڈ“ لکھا تھا۔ میجر اے آر مسکین تھوڑی دیر کے لیے ہمیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ ایک بڑے کمرے میں جو ایک دفتر کی بجائے ایک رہائشی ڈرائنگ روم سے زیادہ مشابہ تھا۔ ایک بے حد موٹا آدمی میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کو اکھاڑے اور دنگل کا خیال آتا تھا۔ یہ آدمی ایک رنگین چھپکلیوں والی بوشرٹ پہنے تھا اور ایک بڑے خوش مذاق دیو کی طرح اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی آلوچوں، بیسوں اور خوبانیوں کی کوئی آدھ درجن پلیٹوں کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی دونوں گالیں فواکھات سے پھولی ہوئی تھیں اور اس کے جبروں کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی میز پر ٹائپ رائٹر کے پیچھے ایک سیاہ چوہی نما عیسائی ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی اور وہ اس کا ٹائپ رائٹر اس کمرے میں ایک کاروباری فضا پیدا کرنے کی ہلکی سی کوشش کر رہے تھے۔

خوش مذاق دیو نے کھڑے ہو کر چچا عبدالباقی اور مجھ سے پر جوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔ اس کے چہرے پر اس بڑے شیمپن پہلوان کا سامر بیانہ انداز تھا۔ جو اکھاڑے میں چھوٹے اور معمولی پہلوانوں سے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے معافقہ کر رہا ہو۔ اس نے بیٹھنے کی دعوت دی اور ہمیں فواکھات میں شرکت کے لیے کہا۔ میز پر اس وقت فواکھات کا صفا یا ہو چکا تھا۔

میجر مسکین نے میز پر بیٹھے ہوئے اپنے بھائی سے ہمارا تعارف کرایا۔

”بھائی تسکین! ان صاحبوں کو زیروں کی ضرورت ہے۔ یہ ان کو گاڑیوں کے آگے جوتا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا ہے کہ میں خود چند دنوں میں نیروبی جا کر جلد از جلد ان کو زیبرے شپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اب یہاں ہم سے بزنس کی ٹرمز وغیرہ پر بات چیت کرنے آئے ہیں۔“

تسکین نے ہمیں ایک کاروباری خوش طبعی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ حضرات مجھے اس ملک میں دو واحد سمجھدار کاروباری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ زیروں کو گاڑیوں میں جوتنے کا خیال خود مجھے آیا تھا۔ مگر میں اور مسکین اپورٹ کے کام میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ہم اور کسی بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ کی سکیم نہایت مبارک ہے۔ زیروں میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔

میجر مسکین نے کہا۔ ”میں نے ان کو سفید زیبرے کے پانچ سواور بھورے کے لیے ڈھائی سو روپے ایف او آر کراچی پرائس کوٹ کی ہے۔“

تسکین نے ہمیں پر جوش طریق سے یقین دلایا۔ ”حضرات! یقین رکھئے آپ اس قیمت پر گویا زیروں کو مفت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈھائی سو روپے میں تو آج کل زیبر تو زیبرا گدھا بھی نہیں ملتا۔ ہم نے اگلے روز چودھری سرکس کمپنی کے لیے دو سیاہ زیروں کا ڈیڑھ ہزار کا آرڈر بک کیا ہے چونکہ آپ حضرات ہم سے پہلی بار بزنس کر رہے ہیں اور آپ کا آرڈر بھی بڑا ہے۔ اس لیے آپ کو بہت کم قیمت بتائی گئی ہے۔“

تھوڑی سی اور بات چیت کے بعد چچا عبدالباقی افریقین برادران سے تیس سفید اور سیاہ زیروں کا آرڈر بک کرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ آرڈر کوئی بیس ہزار کا تھا اور افریقین برادران کی بزنس کی شرائط یہ تھیں کہ آرڈر دیتے وقت کل رقم کا ایک چوتھائی حصہ پیشگی ادا کر دیا جائے۔ افریقین برادران ہمارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور آخروہ اس پر رضامند ہو گئے کہ دو ہزار روپیہ پیشگی ادائیگی پر ہمارا آرڈر بک کر لیں گے۔

”اور ہم آپ سے ایک اور رعایت کرتے ہیں۔“ تسکین نے کہا۔ ”ہماری شرائط میں ہے کہ بقیہ رقم اس وقت ادا کرنی پڑتی ہے جب بندرگاہ سے ہمارے پاس انوائس پہنچ جائے کہ مال لا دیا گیا ہے۔ آپ کو بقیہ رقم اس وقت دینا ہوگی جب زیبرے یہاں ہمارے گودام میں پہنچ جائیں گے۔ ایسی شرائط آپ کو کراچی بھر میں کوئی اپورٹ نہیں دے گا۔“

”آپ زیروں کو انشور وغیرہ بھی کرانا چاہتے ہیں؟“ میجر مسکین نے کہا۔

”ضرور“ چچا عبدالباقی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے انشور کرانا بہتر رہے گا۔“

”پیکنگ آپ کیسی چاہتے ہیں؟“ تسکین نے پوچھا۔

”پیکنگ کا کیا مطلب؟“ چچا عبدالباقی بولا۔ ”کیا آپ کا مطلب ہے کہ زیروں کو پیک کیا جائے گا؟“

”یقیناً یقیناً“ تسکین بولا ”پیکنگ کے بغیر تو ان کی کھال کی شفافیت اور خوبصورتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آخر زیبرے ہیں

کوئی گھوڑے اور گدھے تو نہیں کہ جیسے ہیں ویسے لا دیا۔ عموماً ان کو موسمی کپڑے میں ملفوف کر کے جہاز پر لا دیا جاتا ہے۔“

”ہاں تو پیکنگ بھی کرائی جائے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔

عیسائی ٹائپسٹ لڑکی نے ہمارا آرڈر بک کیا اور میں چچا عبدالباقی کو وہیں چھوڑ کر گھر سے دو ہزار روپے پیشگی کی رقم لانے کے لیے گیا۔ جب میں واپس آیا تو چچا عبدالباقی ٹائپسٹ لڑکی کی بغل میں بیٹھا تھا اور ٹائپ رائٹر کی کلک کلک ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا آرڈر تیزی سے ٹائپ ہو رہا ہے۔ تسکین ٹیلیفون ٹیلیفون کا ریسور اٹھا کر نیروبی آفس کو ٹرنک کال کر رہا تھا۔ ”سناؤ“ کیا کہا؟ دس شیر شپ ہو گئے؟ کب آئے؟ ابے میں پوچھتا ہوں کب کئے؟ برتھے نا؟ اور چیتے؟ کتنے؟ چھ؟ ابے بارہ کا آرڈر بھیجا تھا۔ پکڑے نہیں گئے ابے چیتے نہیں پکڑے گئے؟ اچھا اور چاچی کا کیا حال ہے؟ زیروں کا کیا حال ہے؟ ابے زیبرے بھی زیبرے بکرے نہیں زے۔ ب۔ رے۔ کیا کہا؟ زمیسی کے اوپر چار سو میل چلے گئے ہیں۔ اچھا میں مسکین کو بھیج رہا ہوں۔ سفری کا انتظام کر دینا۔ زیبرا گاڑیوں کے لیے یہاں زیبرے چاہئیں۔ ابے وہ لنگور جو تم نے پچھلی شپنٹ میں بھجوائے تھے انہیں انشور کیوں نہیں کیا؟ تم بھی نرے لنگور ہو۔ راستے میں جہاز پر سے پانچ تو سمندر میں چھلانگ لگا گئے۔ اب ان کے پیسے تیرا باپ دے گا۔ چودھری سرکس کمپنی والے روز ناک میں دم کرتے ہیں۔ کیا کہا.....“

آرڈر آخربک کر دیا گیا۔ افریقین برادران سے آرڈر کی ایک کاپی اور دو ہزار کی رسید لے کر ہم باہر آ گئے۔ چچا عبدالباقی دونوں مسکین اور تسکین کے لیے تعریف اور تحسین سے پر تھا۔

”بزنس مین فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز میں آج کل روپیہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے دیکھا زیبروں کے نام ہی سے تسکین چونک پڑا۔ بختیار! میں تمہیں بتاؤں اس شخص تسکین کی کھوپڑی میں واقعی کاروباری دماغ ہے۔ یہ دونوں بھائی ہمارے لیے خدا نے رحمت کے فرشتے بنا کر بھجوائے ہیں۔

ہم چوتھے پانچویں روز افریقین برادران میں زیبروں کے متعلق پتہ کرنے جاتے۔ تسکین کبھی دفتر میں ہوتا اور کبھی باہر۔ مگر اس

کی ٹائپسٹ مس میسی وہیں ہوتی۔ پہلی بار ہمیں بتایا گیا کہ میجر اے آر مسکین نیروبی میں پہنچ گیا ہے اور سفری کے انتظام کرنے میں مشغول ہے۔ دوسری دفعہ جانے پر پتا لگا کہ وہ زولو شکاریوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ دریائے زمبزی میں ہو چکی ٹوچی کنٹری کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ ایک مہینہ تک وہ وہیں تھا اور چچا عبدالباقی اور میں کچھ فکر مند رہے کہ کہیں اے آر مسکین کو ہو چکی ٹوچی کنٹری کے مردم خورشچی بھون کرنے کھا گئے ہوں۔ ہمیں اے آر مسکین کے بھونے جانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے زیبروں کی۔ آخر ایک دن افریقین برادران جانے پر تسکین نے ہمیں اطلاع دی کہ تھوڑی دیر ہوئی اس نے نیروبی سے ایک ٹرنک کال موصول کی ہے۔ مسکین دوسو زیبروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے اور ان کی شپنگ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ دو دن بعد ہمیں بتایا گیا کہ زیبرے ایس ایس ڈھمرا سے شپ ہو چکے ہیں اور دو ہفتے کے اندر اندر کراچی بندرگاہ میں پہنچ جائیں گے۔ چچا عبدالباقی اور میں اسے خبر سے دیوانے ہو گئے اور چچا کی کوٹھی کے پچھواڑے ایک احاطے کو زیبروں کے قیام کے لیے صاف کر دیا گیا۔

دو ہفتے کے بعد افریقین برادران میں جانے پر تسکین ہنس ہنس کر ملا۔

”آپ کے زیبرے آ گئے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ ہم نے بیتابی سے پوچھا۔

”صبر تو کیجئے۔“ تسکین بولا۔ ”میرا کلیئرنگ ایجنٹ آج صبح ان کو کلیئر کر کے لے آیا ہے۔ چوگی ان پر بہت پڑ گئی ہے مگر وہ سب نہایت چست حالت میں ہیں۔ اس وقت وہ کلیئرنگ ایجنٹ کے گودام میں ہیں۔ ہاں ایک زیبرا میں نے بطور نمونہ اپنے گودام میں منگوالیا ہے۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔“

زیبروں کے آنے کی خبر سن کر ہمارا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ تسکین ہمیں کئی کمروں میں سے لے جاتا ہوا ایک بند کمرے کی طرف لے گیا۔ جس کا دروازہ مقفل تھا ایک کھڑکی میں سے جس میں سلاخیں لگی تھیں۔ ہم نے اندر جھانک کر دیکھا ایک خوبصورت سفید زیبرا اندر کھڑا گھاس کھا رہا تھا۔

”تسکین“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”دروازہ کھولو میں اس زیبرے کو تھپکی دینا چاہتا ہوں اور نزدیک سے اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”گودام کی چابی میرے پاس نہیں۔“ تسکین بولا۔ ”اور دوسرے زیبرا سفر کی وجہ سے کچھ تھکا ہوا ہے۔ خیر باقی زیبرے بھی سب اسی طرح خوبصورت اور تندرست ہیں۔ آپ شام کو آ کر یہاں سے ان کی ڈلیوری لے سکتے ہیں۔ پانچ لڑکوں کا انتظام آپ کو کرنا ہو

”گا۔“

جب جانے لگے تو تسکین نے ہمیں بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے کہا۔ ابھی انیس زبرے آئے تھے اور ہمیں تین ہزار روپیہ اور افریقین برادران کو ادا کرنا تھا۔ بقیہ رقم کے سوال نے اس خوشی کو جو بیروں کے آجانے سے ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی قدرے ابرآلود کر دیا۔ تسکین نے مس میسی کو فوراً ہمارا بل ٹاپ کرنے کے لیے کہا۔

”ابھی ہم ایک ہزار روپیہ دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ پندرہ زبرے فی الحال لے جاسکتے ہیں۔“ تسکین بولا۔ ”مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے باقی دو ہزار کے لیے میں ہفتہ تک انتظار کرنے کو تیار ہوں۔“

شام کو ہم پھر افریقین برادران پر دوڑ ٹک لے کر پہنچے۔ کافی دیر ہم گلی میں ٹھہرنا پڑا اور پھر تسکین باہر آیا اور ہمارے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر ہمیں اپنے کلیرنگ ایجنٹ کے مکان پر لے گیا۔ اب کافی اندھیرا سا ہو چکا تھا۔ کلیرنگ ایجنٹ ایک چھوٹا سا پھر تیل آدمی تھا جسے آنکھیں مارنے کی بڑی عادت تھی۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھواڑے ایک احاطے کی طرف لے گیا۔ اس احاطے میں چالیس پچاس کے لگ بھگ زبرے ہوں گے۔ بہت سے ابھی موم جاموں میں ملفوف تھے۔ چچا عبدالباقی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی کہ زبرے کچھ قد میں چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمیں سمجھایا کہ یہ بڑی جلدی بڑے ہو جائیں گے۔ اور یہ کہ ان کو سدھانا اور گاڑی کے لیے تیار کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔

زیروں کو ٹرکوں میں لا دنا کافی مصیبت ثابت ہوا۔ ایک دو نے مجھ پر دولتیاں بھی چلائیں۔ آخر ڈرائیوروں اور مزدوروں کی مدد سے ہم ان کو سڑکوں میں لا دنے میں کامیاب ہو گئے۔ تسکین بڑا خوش معلوم ہوتا تھا اور اس کی ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ چھوٹا کلیرنگ ایجنٹ تسکین کو بار بار آنکھ مار رہا تھا۔

ہم زیروں کو چچا عبدالباقی کے مکان پر لے آئے۔ یہاں ان کو ٹرکوں سے اتارا گیا اور اس احاطے میں چھوڑ دیا گیا جو خاص ان کے لیے صاف کر دیا گیا تھا اور جس کے گرد ایک چھوٹی چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ چچا عبدالباقی کے کئی ہمسائے اپنی کوٹھیوں کی چار دیواری پر سے ہمیں اور ہمارے زیروں کو دلچسپی اور دہلی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھ رہے تھے اور چند چچا عبدالباقی کو زیروں کی آمد پر مبارکباد دینے کے لیے آئے تھے۔

تسکین ہمارے ساتھ چچا کے مکان پر آیا تھا اور ہمیں زیروں کی پرورش کے متعلق مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو پہلے چند

دن صرف دودھ اور تازہ کے لیے دیئے جائیں۔ ان کو گرم پانی اور صابن سے ہرگز ہرگز نہ نہلا یا جائے۔ بلکہ برش سے رگڑ کر صاف کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم اس قدر مضطرب اور خوش تھے کہ اس کی باتوں پر ذرا توجہ نہ دے رہے تھے۔ جب تسکین نے ہم سے تیس زیبروں کی وصولی کی رسید لے لی اور ایک ہزار روپیہ اپنی جیب میں ڈال لیا تو وہ سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔

اب کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ زیبرے بڑے بڑے خوش تھے۔ سفر نے انہیں مضطرب کر دیا تھا۔ چچا عبدالباقی میں اور عبد الرحمن احاطے کی چار دیواری کے باہر سے ان کی سیاہ کھالوں کو دیکھ رہے تھے۔

”بے چارے بڑے بھوکے ہوں گے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”بختیار! بازار جاؤ اور ان کے لیے کیلے اور دودھ لے آؤ۔ تسکین نے کہا ہے کہ پہلے چند دنوں تک ان کو کیلوں اور دودھ کے علاوہ کچھ نہ دیا جائے۔“

”میرا خیال ہے تین من دودھ اور بیس درجن کیلے کافی ہوں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی! آج رات کے لیے تو کچھ کرو۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”دیکھا بھوک کے مارے ان میں زندگی نظر نہیں آتی۔ کل سے ہمیں باقاعدہ کسی ڈائری اور کسی میوہ منڈی والے سے انتظام کرنا پڑے گا۔“

اتنے میں زیبروں میں سے ایک نے آواز نکالی۔ یہ آواز کچھ گدھے کے ہنہانے سے ملتی جلتی تھی۔

”یہ تو گدھے کی آواز لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ غالباً احاطے سے باہر کسی گدھے کی ہے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”ویسے زیبرے کی آواز بھی گدھے جیسی ہوتی ہے۔“

میں چچا کے گھر سے کچھ مٹکے اور خالی ڈرم لئے، کنوڑیہ میں رکھ کر بازار گیا اور دو تین گھنٹے کے بعد کئی دکانوں پر پھرنے کے بعد دودھ اور کیلے خرید کر لایا۔ زیبروں کو دودھ پلانے کے بعد ہم سو گئے۔ صبح میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو زیبرے احاطے میں تھے۔ ان کی دھاریوں میں مجھے کچھ عجیب بات معلوم ہوئی۔ دوسرے یہ زیبرے بہت چھوٹے اور بیہودہ نظر آنے والے حیوان معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمارے لیے کچھ اور بڑھیا نسل کے زیبرے در آمد نہ کئے تھے۔

چچا عبدالباقی اس وقت اپنے سوٹ میں ملبوس کمرے میں آیا۔

”بھئی بختیار! تم ابھی تک بستر میں ہو۔ اٹھو بھئی زیبروں کے ناشتہ کا انتظام کرنا ہے اور ان کو نہلا کر پونچھنا ہے۔ بے چارے بے

حد میلے کیلے دکھائی دے رہے ہیں۔“

عبد الرحمن نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں زیبروں کو نہلاتا ہوں۔“ اور وہ ایک گرم پانی کی بالٹی اور کپڑا لے کر نیچے ان کو

نہلانے چلا گیا۔ چچا عبدالباقی میرے پاس بیٹھ کر مجھے حساب کتاب کر کے بتانے لگا کہ اب زیبروں کے آجانے کے بعد ان کو پالنے پونے سدھانے وغیرہ کے لیے کتنا سرمایہ درکار ہوگا۔ میں اسے صاف صاف کہنے والا تھا کہ میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں کہ عبد الرحمن نے نیچے زیبروں کے پاس سے آواز دی۔

”اباجی! یہ ان زیبروں کی دھاریوں کا رنگ تو کچا ہے۔“

”کچا! کیا مطلب؟“ چچا عبدالباقی نے کھڑکی میں سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”دھونے سے اتر آتا ہے۔ اس زیبرے کو دیکھو میں نے اسے نہلایا اور اس کی دھاریاں مٹ گئی ہیں۔“

”اوہ“ میں چلایا۔ ”میرے خدا! چچا عبدالباقی! یہ تو گدھے ہیں۔“

اسی وقت ڈھینچوں ڈھینچوں کی متحدہ آواز نیچے سے اٹھی۔ اس دفعہ غلط فہمی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔

ہم اسی وقت بھاگے بھاگے افریقن برادران کے دفتر میں پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر تسکین نے دروازہ کھولا۔ وہ اپنی بنیان پہنے تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں گلد تھا۔

”آئیے آئیے“ اس نے پر جوش خوش طبعی سے کہا۔ ”میں صبح ڈنٹر پیلنے کا عادی ہوں۔“

”تم نے ہم سے دھوکا کیا ہے۔“ چچا عبدالباقی نے ہڑبڑا کر دونوں بازوؤں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”وہ زیبرے نہیں وہ سب گدھے نکلے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ تسکین نے کہا۔ ”کل شام تم مجھ سے دیکھ بھال کے بعد زیبرے لے گئے وہ رسید جو تم نے مجھے دی ہے اس میں تم نے صاف لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیبرے وصول پائے۔ اب اگر کوئی راتوں رات زیبرے کھول کے لے جاتا ہے اور ان کی بجائے گدھے چھوڑ جاتا ہے تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ لیکن تم کو یہ کیسے یقین ہے کہ وہ زیبرے نہیں؟“

”زیبرے نہیں زیبرے نہیں کیا زیبروں کی آواز ایسی ہوتی ہے؟“ اور چچا عبدالباقی نے گدھے کی ہنہانے کی ایک غیر مکمل سی نقل کی۔ ”اور گرم پانی سے دھونے سے ان کی دھاریاں سب دھل گئی ہیں۔ تم نے یہ دھاریاں گدھوں پر رنگی تھیں۔“

”آپ صاحبان ذرا ٹھنڈے تو ہو جائیے۔“ تسکین نے کہا۔ ”آپ نے ان کو گرم پانی سے دھویا؟ کیا آپ کو معلوم نہیں زیبروں کے لیے گرم پانی مہلک ہے۔ آپ کو انہیں شیل 100 سے دھو کر آئل کا تھ سے صاف کرنا چاہیے تھا۔“

”میں تم پر مقدمہ چلاؤں گا۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“

”تمہاری رسید میرے پاس ہے جس پر تم نے خود لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیبرے وصول پائے۔“
 ”تم چار سو بیس ہو۔ میں تمہاری موچھیں کھینچ لوں گا۔“

”کیا؟ نکل جاؤ، نکل جاؤ۔“ تسکین نے مگدر کو دھمکانے کے انداز میں اٹھائے ہوئے گلی کے اخیر تک ہمارا پیچھا کیا۔

ہم نے غصے سے کھولتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے بند روڈ پر آ کر دم لیا۔ چچا عبدالباقی سخت غصے کی حالت میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس دھوکے باز شخص پر مقدمہ چلائے گا۔ اور اس سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہے گا اور دو تین دن تک میں نے اسے بڑی بڑی قانون کی کتابوں میں منہمک پایا۔ اس دفعہ کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا جس کے تحت افریقین برادران پر مقدمہ دائر کیا جاسکتا تھا اور آخر مقدمہ بازی کا ارادہ چھوڑ دیا گیا۔ ہماری قانونی پوزیشن واضح نہ تھی۔

اس کے چند دن بعد جب میں افریقین برادران کی کمپنی کے پاس سے گزرا تو نیارنگا ہوا بورڈ غائب تھا۔ دو لمبے چوڑے شخص جن کی موچھیں منڈی ہوئی تھیں ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے دروازے میں کھڑے مجھے تمسخرانہ طریق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ طالب علم تھے اور ان کے چہرے بے حد آشنا لگے۔ جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے ایک لفظ ”زیبرے“ سنا اور آگے جا کر مجھے خیال آیا کہ وہ مسکین اور تسکین تھے، موچھوں کے بغیر۔

یہ تھی زیبرا سکیم!



چچا سام کے نام آخری خط

(جسے اس کے بھتیجے سعادت حسن منٹو نے اپنے مرنے کے چند روز بعد جنت سے دستی مکتوب الیہ کو بھجوایا)

چچا جان..... السلام علیکم!

آپ کو یہ سن کر بے حد صدمہ پہنچے گا کہ پچھلے دنوں میرا انتقال ہو گیا۔ چچا جان وہ مرنے کی دھمکی جو میں آپ کو اپنے ہر خط میں دیا کرتا تھا، آخر کار سچ ہو گئی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میری موت میں آپ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ میری بار بار کی فرمائشوں اور منتوں کے باوجود آپ نے نہ اپنے ہاں سے جان ہیگ کی دھمکی بھجوائی اور نہ ہالی وڈ کی کسی فتنہ سامان کی ملین ڈالر ٹانگیں۔ غالباً اپنے پچھلے خط ہی میں میں نے ان ٹانگوں کو قریب سے دیکھنے کی تمنا ظاہر کی تھی۔ کیسے بے مہر نکلے آپ چچا جان! میری بات سنی ان سنی کر کے پی گئے۔ ادھر میری سعادت مندی کا حال دیکھئے کہ آپ کی تعریفیں کرتے کرتے زبان تالو سے چپک گئی۔ اب آپ کے سب سے پیارے بھتیجے کا انتقال ہو گیا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اس میں قصور سراسر آپ ہی کا ہے۔ آپ تو خدا جانے انتقال کا مطلب بھی سمجھتے ہوں گے یا نہیں؟ کیونکہ آپ ٹھہرے خوش قسمتی سے لافانی۔ آپ کا کبھی انتقال نہ ہوگا۔ چچا جان! واللہ باللہ آپ بھول کر بھی انتقال نہ کیجئے گا۔ جنت کے بارے میں جو باتیں سن رکھی تھیں یہاں آ کر سب جھوٹ نکلیں۔ یہاں نہ تو آپ کے مالک کی سات آزادیوں کے مزے ہیں اور نہ ہی ہالی وڈ ہے۔ کوئی ایسا ملک بھی تو نہیں جسے آپ فوجی امداد سے نواز سکیں یا جسے آپ اپنے ہائیڈروجن بم سے نیست و نابود کر سکیں۔ آپ کی جان ہیگ تو یہاں بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملتی۔ شام کے وقت صراحیوں میں ہم جنت کے مکینوں کو شراب طہورہ ضرور تقسیم ہوتی ہے لیکن کم بخت میں نہ سرور ہوتا ہے نہ نشہ۔ آپ کی جان ہیگ کا ذکر ہی کیا۔ اس میں پاکستانی ٹھہرے کی خاصیت بھی تو نہیں۔ اس طہورہ سے تو آپ کے ہاں کا کوکا کولا جسے ایک دفعہ لاہور میں پینے کا اتفاق ہوا تھا بدرجہا اچھا ہوتا ہے۔

ہاں تو چچا جان! میں اپنے انتقال پر ملال کا سانحہ آپ کے گوش گزار کر رہا تھا۔ اخباروں میں تو آپ نے اس خبر کو پڑھا ہوگا۔ مشرق کے ایک مفلوک الحال ادیب کی اوقات ہی کیا تھی کہ آپ کے اخبارات اور میگزین اسے چھاپنے کی زحمت اٹھاتے۔ انہیں تو ملین ڈالر

ٹانگوں والی لڑکیوں کے برہنہ فوٹو شائع کرنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ اس طرف ان کی توجہ ہوتی تو کیونکر؟ ہمارے ملک کے اخباروں نے البتہ اس خبر کو سیاہ حاشئے چڑھا کر ضرور شائع کیا۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ آپ کا یہ نالائق بھتیجا اس لائق بھلا کہاں تھا کہ اس کے مرنے کا نوٹس لیا جاتا۔ ہو سکے تو میری طرف سے ان اخباروں کے مرنجاں مرتخ مدیران کا شکریہ ادا کر دیں۔ گستاخی معاف! آپ کی مارلین منرو آج کل کیا کر رہی ہیں؟ چچا جان ان کو صرف ایک ہفتے کے لیے ان میروں کی دلجوئی کے لیے پاکستان بھیج دیں۔ ہو سکے تو ان میروں کے منہ ڈالروں سے بھر دیں۔ بہر حال ان کو اس کرم فرمائی کا صلہ ملنا ضرور چاہیے۔

چچا جان! آپ کو شاید اس بات کا پتہ نہ ہوگا کہ آپ کے اس نالائق و ناعاقبت اندیش بھتیجے کی ایک بیوی اور تین پیاری بچیاں بھی تھیں۔ آپ کہیں گے کہ بہتر ہوتا کہ وہ سب بھی میرے ساتھ انتقال کر جاتیں۔ ارادہ تو میرا بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر سدھارتا لیکن ملک الموت صاحب نے اتنی مہلت ہی نہ دی اور آنا فانا جان قبض کر لی۔

چچا جان! آپ بڑے رحمدل اور بامروت مشہور ہیں۔ اس لیے یہ کہنے کی جرات ہوتی ہے کہ ممکن ہو تو میرے بیوی اور بچوں کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیں۔ آپ کے ایک ڈالر کی قیمت ہمارے پاکستانی ساڑھے چار روپے ہوتی ہے (مجھے اچھی طرح یاد نہیں) پچاس ڈالر ماہوار انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔ چچا جان خدا کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔ صرف پچاس ڈالر ہمارے غریب ملک میں پچاس ڈالر بہت ہوتے ہیں اور ایک اچھا خاصہ کنہ اس رقم میں پل سکتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں آپ اصولاً ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کو میرے جیسے بھک منگوں سے سخت چڑ ہے اور پھر ان دنوں سات آزادیوں کو روسیوں سے بچانے اور ہائیڈروجن بم تیار کرنے کے تردد میں لگے ہیں۔ ایک نادار مرے ہوئے فنکار کی بچیاں جنیں یا میریں آپ کی بلا سے۔ آپ کے رو برو تو بڑے بڑے مسائل ہیں! اچھا چلئے۔ چھوڑیے اس قصے کو وہ صوبہ جہاں اس خانہ خراب کا مسکن تھا۔ وہاں کے وزیراعظم فیروز خان نون ہیں (میرے انتقال کے وقت تو یہی صاحب اس گدی پر متمکن تھے) ان کے نام ایک سفارشی چٹھی لکھ دیں۔ اثر شاید اس کا بھی کچھ نہ ہو کیونکہ نون صاحب ان دنوں ایک یونٹ کے پھیر میں ہوں گے۔ خیر آپ کو اس سے کیا۔ آپ چٹھی ضرور انہیں لکھ دیں۔ بہر حال میری واحد امید آپ کی ذات ڈالر صفات ہے۔

چچا جان! ہے تو یہ سخن گسترانہ کی بات۔ لیکن کہے بنا رہ بھی نہیں سکتا۔ مرتے دم تک آپ سے جان ہیگ کی دہسکی بھجوانے کے لیے درخواست کرتا رہا اور آپ اسے گول کرتے رہے۔ خدا جانے آپ کیا سمجھے۔ میں تو ہر دم ہر محفل میں آپ کی تعریفوں کے پل باندھا کرتا تھا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میرے ہی قلم کا صدقہ تھا کہ میرے ملک میں لوگ آپ کی سوجھ بوجھ اور شفقت کے قائل ہو گئے اور

آپ کے اتنے سارے بھتیجے پیدا ہو گئے۔ میرے غریب ملک میں سچ ماننے، خدا اور اس کے رسول کے بعد جس قدر عقیدت مندی سے آپ کا نام لیا جاتا ہے، کسی اور کا نہیں لیا جاتا۔ ہماری مسجدوں میں فقیہ اور ملا۔ اخباروں کے ایڈیٹر اور مسلم لیگ کے لیڈر اب بھی اکثر خدا اور اس کے رسول کے نام کو زبان پر لاتے رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھئے تو ڈالر کھٹکتے سنائی دیں گے۔ یہ سب آپ کے اس مرحوم بھتیجے کی پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے تو آپ کے نام کو چکانے کے لیے یہ کچھ کیا اور آپ سے اس وفاداری کے عوض میں اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہاں سے کوئی سیکنڈ ہینڈ پیکارڈ ہی بھجوا دیتے۔ ملین ڈالر ٹانگیں نہیں تو ان کے پرٹ ہی عنایت کر دیتے۔ واہ بھئی، چچا جان، واہ!

خیر ان باتوں کو چھوڑیے۔ یہ تو اس بدنصیب ملک کی باتیں ہیں جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔ جس جگہ میں اب ہوں۔ یہاں انسان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ستاتی۔ نہ جان ہیگ کی دہسکی کی نہ پیکارڈ کی اور نہ مارلین منرو کے ہونٹوں کے پرٹ کی۔ یہاں بالکل ہوکا عالم ہے۔ چچا جان آپ یہ سن کر حیران اور خوش ہوں گے کہ یہاں میں نے آپ کی طرح داڑھی رکھ لی ہے۔ ہر صبح لب تر شواتا ہوں، آٹھوں پہر با وضو رہتا ہوں۔ کوئی فاسد خیال میرے ذہن میں نہیں آتا حالانکہ اپنے ملک میں فحش نگار مشہور تھا۔ وہاں میں ہمیشہ فن کی تخلیق کی فکر میں جلتا بھنٹا رہتا تھا، یہاں آ کر ایک افسانہ نہیں لکھا۔ دراصل چچا جان (گو آپ جیسے سیانے آدمی سے کچھ کہنا لقمان کو حکمت سکھانا ہے) یہ آرٹ واٹ سب کو اس ہے۔ چہرے پر نور دل میں سرور اصل چیز ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر جیب میں ڈالر بھی ہوں تو واللہ کیا ہی کہنے۔ کاش وہاں افسانے لکھ لکھ کر اپنی زندگی اور صحت برباد کرنے کی بجائے کھانڈ یا کسی اور جنس کا بزنس کرتا اور سٹے سے کمائے ہوئے روپے کے بل بوتے پر دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہو جاتا اور تین چارج کر لیتا تو دنیا اور آخرت سدھر جاتی۔

چچا جان! آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں اس نئی دنیا میں بڑا خوش و خرم ہوں گا۔ ہرگز نہیں۔ آپ کی دنیا کو ہائیڈروجن بم سے اڑانے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ یہ تو آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ ہاں اگر میں آپ سے ہائیڈروجن بم کا نسخہ سیکھ کر آیا ہوتا تو اس دنیا کو ضرور اڑا دیتا۔ دنیا میں تنگی و ترشی جو میرے نصیبے میں تھی وہ اس عیش و آرام اور نورانیت سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو مجھے یہاں حاصل ہے۔

چچا جان! کیا آپ اپنا کوئی بمبار طیارہ ادھر نہیں بھیج سکتے یا ابھی ٹھہر جائے، کو بالٹ بم کو ایجاد ہو جانے دیجئے۔ آپ نے اس بم کو بنانے میں اتنی دیر کیسے کر دی۔ مسٹر جان فوسٹر ڈلز کا کیا حال ہے؟ آپ کے بعد وہ مجھے سب سے پیارے لگتے ہیں۔

چچا جان! ابھی کل کا ذکر ہے کہ حوض تنیم کے پاس چہل قدمی کرتے ہوئے میرزا سے مڈ بھڑ ہو گئی۔ یہ وہ میرزا غلام احمد قادیانی

نہیں ہیں جنہوں نے کسی زمانہ میں دعویٰ نبوت کیا تھا (اور جن کا یہاں بسیار جستجو کے بعد بھی سراغ نہ پاسکا) یہ مرزا اور ہیں۔ مرزا اسد اللہ خان غالب۔ ان کا نام بھلا آپ نے کا ہے کونسا ہوگا۔ ان کے باپ کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ سو پشت سے پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ یہ صاحب ہماری بدنصیب اردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہو گزرے ہیں۔ آدمی مزے کے نکلے۔ فوراً بے تکلف ہو گئے۔ کہنے لگے ”اماں سعادت! یہ کیسی جنت ہے۔ دنیا میں تو اس کی بڑی تعریفیں سنتے تھے یہاں نہ تو دور دور تک کوئی انسان نظر آتا پڑتا ہے نہ کسی کو شعر کہنے سننے کا ذوق ہے۔ ہاں بھی کسی سے کہلو کر ایک بوتل اسکاچ کا انتظام تو کرادو۔ اولڈ ٹام یا کسی اور کا، متھرا داس مہاجن کے نام تمسک لکھ دیتا ہوں۔ شراب طہورہ پی پی کر ذہن و دماغ کند ہو چکا ہے اور ہاں بھی ہماری چودھویں تو کہیں نظر نہیں پڑی۔“

چچا جان! مجھے ان مرزا غالب کی خاطر بہت عزیز ہے اس لیے میرے لیے نہ سہی ان کے لیے ہی ایک کیس بڑھیا دھسکی کا بھجوا دیں۔ شیمپن ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم دونوں کے جگر خراب ہیں۔ ضرور توجہ فرمائیں۔ آپ کا غمگسار اور مہربان اور کہاں ہے زمانے میں!

ہاں چچا جان! میرے انتقال سے کچھ دن پہلے آپ کوئی سیٹو میڈ و وغیرہ بنا رہے تھے۔ امید واثق ہے کہ آپ کو اس مقصد میں کامیابی ہو چکی ہوگی۔ بڑھاپے میں بھی آپ کی ہمت جواں ہے ناممکن ہے کہ آپ کسی کام میں ہاتھ ڈالیں اور وہ سرانجام نہ پا جائے۔ میری طرف سے ڈنر صاحب کی خدمت میں عرض کر دیوں کہ اس جنت کے خطے کو بھی اپنے سیٹو یا میڈ و میں شامل کر لیں۔ یہاں کے کارپردازوں کو شیشے میں اتارنا مجھ پر چھوڑیے۔ بات یہ ہے کہ حوریں تو یہاں ہم سب کے پاس بہت ہیں لیکن ان میں وہ بات نہیں جو آپ کے ہاں کی ہالی وڈ کی ایکٹرسوں میں ہے۔ یہ حوریں بہت زیادہ پاک اوصاف اور نورانی ہیں۔ پھر اس جنت میں خدا بھلا کرے آپ کا نہ اخبار ہے نہ میگزین اور نہ ریڈیو۔ اور تو اور قلم دوات تک ناپید ہے۔ یہ قلم دوات جس سے آپ کو یہ خط تحریر کر رہا ہوں بصد حیلہ اپنے کرام الکاتبین سے مانگ کر لایا ہوں۔ وہ ان دنوں بے کار ہیں اور میرے دنیاوی اعمال کے مسودے لیے روز حساب کے منتظر ہیں۔ آپ کے بھتیجے کو جنت میں انترم (Interm) عرصے کے لیے رکھا گیا ہے۔ بعد میں قیاس غالب ہے کہ اسے یہاں سے منتقل کر کے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔

میری موت کا حال سنئے! کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب میرا انتقال ہوا تو میری گھر والی کو مجھے باعزت طریقہ سے کفن کرنے کی کتنی فکر لاحق تھی۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے چند ناشر حضرات کا کہ جنہوں نے اس آشفہ حال کی کتابیں

چھاپی تھیں انہوں نے کمال دریا دلی سے غسل اور قبر وغیرہ کا خرچہ اپنی گرہ سے دے دیا۔ پھر بھی اتنے بڑے افسانہ نگار کا جنازہ جس بے کسی اور کسمپرسی کے عالم میں نکلا وہ ہرگز قابل دیدنی تھانہ شنیدنی۔ چچا جان! کاش میں آپ کے ملک کا ولی موریتی ہی ہوتا۔

چچا جان! آپ اکتانہیں گئے! دراصل آپ سے باتیں کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ یہ میرا آپ کے نام آخری خط ہے۔ جنت سے خط لکھنا اور اسے بھیجنا عجب درد سر ہے۔ قلم دوات کا حال عرض کر چکا ہوں، ڈاک کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں بلکہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ آپ کی سات آزدیوں کے ملک کی کوئی راحت بھی یہاں میسر نہیں۔ اس خط کو آپ کے دست مبارک تک پہنچانے کے لیے بڑی منتوں سے ایک صاحب کو بہلا پھسلا کر تیار کیا ہے۔ ان صاحب کا نام حضرت عزرائیل ہے۔ کافی مشہور بزرگ ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ نے ان کا نام سن رکھا ہو۔ ہائیں چچا جان! یہ کیا! آپ عزرائیل کے نام پر پیلے کیوں پڑ گئے۔ آپ تو لافانی ہیں اور پھر ابھی تو آپ کو سات آزدیوں کو بڑھا کر ساٹھ آزادیاں بنانا ہے۔ سیٹو، میٹو، نیٹو وغیرہ کی تشکیل کرنی ہے۔ کو بالٹ بمب ایجاد کرنا ہے۔ خدا نہ کرے، ابھی آپ کیسے مر سکتے ہیں؟

چچا جان! ایک اور مزے کی بات سنئے! ہندوستان میں ایک بزرگ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ہیں، پچھلے دنوں سنا ہے وہ ہمارے محترم گورنر جنرل غلام محمد صاحب سے کسی سلسلے میں پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ ”صدق“ رسالہ نکالتے ہیں۔ آپ بڑے پایہ کے ادیب اور مانے ہوئے عالم ہیں اور متعدد فاضلانہ اور عالمانہ مقالوں اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں کو وہی حضرات پڑھ سکتے ہیں جن کے دل میں نور اور آنکھوں میں سرور (یا اس کے برعکس) ہو اور جن کی آنکھوں پر تعصب اور مذہبی دیوانگی کی پٹی بندھی ہو۔ مولانا دریا آبادی اس غم اور سوگ پر جو میرے مرنے پر ہوا بے اختیار تلملا اٹھے اور اپنے رسالہ ”صدق“ میں انہوں نے اس پر سخت تعجب کا اظہار کیا کہ ایک معمولی فحش نگار کی موت کا اس قدر کیوں ماتم کیا جا رہا ہے۔

دیکھا چچا جان! ہمارے ملک میں کیسے کیسے روشن دماغ اور ادیب دوست حضرات بستے ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں بھی ارنسٹ ہمنکو، کالڈول، تھامس وولف اور ہراس فنکار کو جو سچائی کے اور بے باکی سے جھوٹ کے پردے چاک کرتا ہے اور دنیا کو آگے لے جاتا ہے، اسی طرح فحش نگار کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو چچا جان سرے سے باوا آدم ہی نہ لایا ہے۔ سچ ماننے اگر نالائق سمجھے کی باتھ بھر لمبی داڑھی ہوتی، لب ترشے ہوتے، تین بیویوں کا خاوند اور دو درجن بچوں کا باپ ہوتا۔ فحش اور عریاں افسانوں کی بجائے بہشتی زیور کی قسم کی کوئی کتاب کا مصنف ہوتا اور اس نے پاکستان میں آ کر اللہ کے فضل سے پانچ مکان دو باغ اور دس دکانیں الاٹ کرائی ہوتیں تو یہی مولانا آبادی اس کی موت پر بے انتہا قلق کا اظہار فرماتے اور اسے قوم و ملت کے لیے نقصان عظیم قرار دیتے۔ خیر

چچا جان مجھے اس کا غم نہیں کہ مولانا دریا آبادی قسم کے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو آنے والی نسل کرے گی اور ہاں چچا جان! آپ کے دل میں یہ خیال یقیناً کسی حاسد نے ڈال دیا ہے کہ آپ کا یہ بھتیجا کمیونسٹ ہے۔ آپ کی سات آزادیوں کے ملک میں ہوتا تو اغلب تھا کہ آپ میکاتھی صاحب کی شہادت پر مجھے سچ مچ کمیونسٹ یا ہم سفر ساتھی قرار دے دیتے۔ افسوس کہ تنگدستی اور بیماری میں گھل گھل کر مر گیا۔ آپ کے یہاں یقیناً آپ کے بے مثل قتل گھر کی اونچی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر بجلی کی روکے ذریعے خوب مزے سے مرتا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے ہمارے پاکستان میں بھی سات آزادیاں ہیں لیکن یہاں ابھی آپ کا ساقط گھر نہیں بنا۔ واللہ باللہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ آپ بھی عجب سادہ لوح ہیں کہ میرے حاسدوں کی بات میں آ کر مجھے کمیونسٹ سمجھ بیٹھے۔ خدا را اس بدگمانی کو اپنے دل سے دور کیجئے۔ میری بات پر یقین نہ آتا ہو تو پاکستان میں اپنے قونصل خانہ سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمن میلکوف سے میری کبھی ایسی پیار اور محبت کی باتیں نہیں ہوئیں جیسی کہ آپ سے ہوئی تھیں۔ یہ سراسر بہتان ہے کہ میں نے میلکوف کو ماموں بنا رکھا تھا۔ آپ جیسا مربی اور ہمدرد ایک چچا ہی میرے لیے کافی ہے۔ (اور اب تو یہ بھی سنا ہے کہ میلکوف صاحب نے خود اپنی نااہلی کا اعتراف کر کے روس کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا ہے)

چچا جان! میں تو قسم ہے خدائے واحدہ لا شریک کی دنیا میں صرف آپ ہی کا بھتیجا تھا اب بھی آپ ہی کا بھتیجا ہوں۔ گو آپ اپنی بدگمانی کی وجہ سے میری ہر فرمائش اور درخواست کو مسکرا کر ٹالتے رہے۔ لیکن میری سعادت مندی اور وفاداری میں سرمو بھی فرق نہ آسکا۔ ویسے چچا جان! آپ کمیونسٹوں سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ اپنی سات آزادیوں میں موج اڑائیں۔ کمیونسٹوں کو اپنے کلہاڑوں اور درانیوں کو چلانے دیجئے۔ ان غریبوں کے پاس نہ آپ کی سی دھسکی ہے اور نہ ہی ملین ڈالر ناگئیں۔ کیا آپ تاریخ کے طالب علم نہیں رہے؟

کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ تہذیب اور تمدن کبھی ایک سے نہیں رہے؟

آپ لاکھ کوشش کریں۔ ہائیڈروجن بم سے انسان ختم نہیں ہو سکے۔

یہ خط بڑی طوالت پکڑ گیا ہے۔ ابھی آپ سے اور باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا لیکن ادھر روشنائی ختم ہو چکی ہے۔ ادھر حضرت عزرائیل پیر تمہ پاک کی طرح سر پر سوار ہیں کہ جلدی کرو مجھے اور بھی کام ہیں۔

عزرائیل صاحب کو اس خط کا جواب لکھ کر دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ ہاں جان ہیگ کا ایک کیس ضرور ان کے حوالے کر دیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے کشید کرنے کا نسخہ ہی مرحمت فرمادیں۔ مزید برآں اگر آپ ہالی وڈ کی

کسی تازہ ترین ملکہ کی رانوں کے پرنٹ بھجوا سکیں تو ممنون ہوگا۔

عزرائیل صاحب کو ڈلڑ صاحب سے ملاقات کا بڑا اشتیاق ہے اپنی بیوک یا کرائے کی ٹیکسی ہی میں ڈلڑ صاحب کے دولت کدے پر پہنچانے کا انتظام فرمادیں۔ ہاں یاد آ گیا۔ دس یا پندرہ نئے ڈھلے ہوئے ڈالربھی بھجوادیتجئے۔ اب تو انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

(آپ کا مرحوم بھتیجا، سعادت حسن منٹو)



دہقانی یونیورسٹی

میں ریاست بہاولپور کے ایک گاؤں میں اپنے ایک ایسے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا تھا جو مجھے دوست سے کچھ زیادہ عزیز ہے۔ اس گاؤں کا نام خان بیلا ہے اور مولوی غلام قادر سجادہ نشین درگاہ حضرت مولوی سلطان محمد بخش علیہ الرحمہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ گاؤں تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اتنا ہی پرانا ہے جتنا اوچ شریف یا ملتان شریف۔ اور یہ شہروں اور قلعہ بندیوں کی ایک کڑی ہے جن پر کئی صدیوں پیشتر راجہ داہر کا راج تھا (تو کیا وہ بہادر مسلمان جرنیل محمد بن قاسم یہاں سے گزرا تھا)

مولوی غلام قادر اس گاؤں کے نام خان بیلا کی وجہ جواز یہ بتاتا ہے کہ پچاس (یا سو) سال پہلے یہ علاقہ ریاست کے نوابوں کی شکار گاہ تھا۔ جنگلی سوروں کے شکار کے لیے ان کا چہیتا ”بیلا“ اب ریاست کے باشندے اپنے نواب کو پیار سے یا روایتاً خان سائیں کہتے ہیں (اور دولہا سائیں بھی کہہ لیتے ہیں) سو خان سائیوں کا بیلا ہونے کی وجہ سے خان بیلا نے اپنا نام پایا۔ ایک مقامی بھانڈے (بھانڈے سے میرا مطلب وہی ہے جو انگریزی ”بارڈ“ کا ہے اور یوں مجھے اس لائق شاعر کی ہنک یا تضحیک مقصود نہیں جس کے لیے میں نے بھانڈے کا لفظ استعمال کیا ہے) جو ایک سرکاری پیش کار تھا۔ اپنے اس دیس کے گاؤں کے متعلق پچاس سال پہلے ایک بند کہا تھا جو بقول مولوی غلام قادر اس وقت تک اس پر اور اس کے رہنے والوں پر درست بیٹھتا ہے اور اس مقام و ماحول کے تاثر کو اپنے شوخ اور بولتے ہوئے الفاظ میں سمیٹ لینے میں کامیاب ہے۔ خان بیلا کے اس شاعر کا بند یہ ہے۔

خان دا بیلا یار یاری دامیلہ

مولوی غلام قادر مجھے بتاتا ہے کہ خان بیلا اب تک یار یاری کا میلہ ہے اور اس گاؤں کی شبینہ زندگی تو اپنے انداز میں اتنی ہی ہوشربا اور رومان انگیز ہے جتنی پیرس اور دائی ماکے۔ شاید رات کو گاؤں کی الہڑ ہیریں خان بیلا کی تنگ اور ٹیڑھی گلیوں کی دیواروں کے ساتھ دبک کر یا بازار کی بوریوں اور کھجور کے چھال چھپروں سے ڈھنپی ہوئی چھت کے نیچے اپنے گڈریوں اور ”محبوتوں“ کا انتظار کرتی ہیں (سننے والے کے سامنے یہ رومانی تصور بندھتا ہے) مگر مولوی غلام قادر کی معلومات کے مطابق یہ شبینہ زندگی قدرے کثیف اور گھناؤنی ہے اور اس کا تعلق دراصل بوڑھی شباب سے گزری ہوئی دلالہ عورتوں سے ہے۔ یہ قدیم جادو گر نیاں ”محبوتوں“ کی ملاقاتیں بڑی ترکیب سے کراتی ہیں اور ان کے توسط سے عاشقوں کو براہ راست اپنی محبوبوں کے گھروں میں ہی شربت وصال سے مدہوش

ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کو گلیوں کے نکڑوں پر محبوباؤں کے انتظار کی کوفت نہیں اٹھانی پڑتی۔ مغرب اور مشرق کی شبینہ زندگی میں یہ بڑا فرق ہے۔ مشرق میں یہ شبینہ زندگی دبیز پردوں کے نیچے ڈھنپی ہوتی ہے اور گہری گھنیری وادیوں میں بہتی ہے (کیونکہ ہم بے حد با حیا لوگ ہیں) مغرب میں یہ رنگین شفاف قمقمے کی چکا چوند میں اور جاذب بند اور ناب زریں کی معیت میں دندناتی ہے۔ لیکن مجھے تناسب اور اضافیت کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ شاید میں پیارے پڑھنے والے کو خان بیلا کے بارے میں ایک بالکل غلط تاثر دے رہا ہوں جس سے اسے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ عشق اور آزاد محبت کے لیے یہ گاؤں ایک مثالی مقام ہے اگر وہ یہاں رومان کی تلاش میں کچھ عرصہ آ کر ٹھہرے گا تو غالباً اسے مایوسی ہوگی اور وہ کچھ دن کے بعد جھنجھلاہٹ اور برہمی کے انداز میں اس جگہ کو چھوڑ دے گا اور اس صورت میں مصنف تصور کر سکتا ہے کہ وہ کوسا جا رہا ہے اور اس پر دانت پیسے جارہے ہیں۔ ”کہاں ہیں اس کی وہ دوشیزائیں اور رومانی شبینہ زندگی میرے پاس کوئی بڑھی کٹنی کسی گھلتی ہوئی دیہاتی دوشیزہ کا پیام لے کر نہیں آ چکتی۔“ میں اپنے قاری کو بڑبڑاتے ہوئے سن سکتا ہوں۔

پیارے پڑھنے والے بات یہ ہے کہ اجنبی اس شہر نگار میں کچھ شک اور کچھ ڈر سے دیکھے جاتے ہیں اور دوشیزائیں پردیسیوں کے پیچھے نہیں جاتیں۔ پردیسیوں کے خلاف ان کے اس بے پروایانہ اور معاندانہ رویہ کی میرے پاس یہ تشریح ہے کہ خان بیلا میں کوئی سینما گھر نہیں بلکہ خان بیلا کے آس پاس پچاس میل کے دائرے میں کوئی سینما گھر نہیں اور جب تک یہاں کی دوشیزائیں فلمیں نہ دیکھیں ان کی پردیسیوں کے چھپے گنوں کا کیسے علم ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے ان کو دیس والوں پر ترجیح دے سکتی ہیں۔ اپنے گاؤں میں رہنے والوں ان کے اپنے گھروں کے باسیوں کے لیے ان کے بازو ہمیشہ کھلے ہیں۔ مولوی غلام قادر صاحب نوجوان تھا تو ایک دفعہ مگر مولوی غلام قادر شرماتا ہے۔

خان بیلا میں محبت عمر کی قیود سے یکسر آزاد ہے۔ سومر سٹ ماہام کا وہ مقولہ کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق براہ راست تمہارے پٹھوں میں چند غدودوں کی قوت پر ہے۔ کم از کم بیلا کے مردوں کے بارے میں غلط ہے۔ یہاں ایسے ساٹھ سالہ بزرگ بھی پائے گئے ہیں جن کی خاطر سترہ سالہ دوشیزائیں اور بیس بائیس سالہ شادی شدہ عورتیں اپنی حالت بگاڑ لیتی ہیں اور سردھڑکی بازی لگا کر اپنے اپنے معر ”رانجمن“ سے عشق کی روایتیں نبھاتی ہیں وہ اپنے سن رسیدہ عاشق پر صدقے ہوتی ہیں۔ وہ دوسرے مرد کو دیکھنے تک کی روادار نہیں ہوتیں اور پیارے پڑھنے والے سچ مانو کہ خان بیلا میں اٹھارہ سال کا نوجوان پردیسی ایک بوڑھے دیسی کے مقابلے میں ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔

یہاں اکثر (مشتیات کو چھوڑ کر) عاشقی کی عمر شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب یہاں کے مردوں اور عورتوں میں ایک تجربہ کارانہ چٹنگی آ جاتی ہے۔ کیونکہ کے کاروبار میں مولوی غلام قادر کی نظر میں نفع بھی شامل ہے۔ اس کے حب کے تعویذوں اور گنڈوں کی کافی مانگ رہتی ہے۔ وہ تیر بہدف نسخے بھی تیار کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس علاقے میں وہی ایک ایسا شخص ہے جس کا مطلقہ تعویذ کبھی خطا نہیں جاتا مگر وہ اسے کسی کسی کو ہی دیتا ہے۔ مطلقہ کا تعویذ اس عورت کے لیے ہوتا ہے جو کسی اور سے محبت کی خاطر یہ چاہتی ہو کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے تاکہ وہ بعد میں اپنے یار سے نکاح کرنے میں آزاد ہو۔ یہ تعویذ بہت کڑا ہوتا ہے اور مولوی غلام قادر اس کا سو روپیہ سے کم ہدیہ قبول نہیں کرتا۔ مولوی غلام قادر نے خان بیلا میں عشقیہ جذبہ کو زندہ رکھنے میں معتد بہ حصہ لیا ہے اور جب کوئی مورخ یہاں کی تاریخ لکھنے بیٹھا تو اس کے لیے سجادہ نشین درگاہ حضرت سلطان محمود بخش کی خدمات کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جائے گا۔

مثلاً جنگلوں کے شکاری کو لو اس کی عمر پچپن برس کی ہے اپنے بھاری جے، رنگین تصویر پت سے پر لباس اور مہندی سے رنگی ہوئی پتکھے نما داڑھی کے ساتھ وہ فینمور کوپر (Finimore Cooper) کے سرخ انڈین ناولوں کا ایک کردار لگتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایک نالی بندوق ہے جو گڑھی شریف کے ایک مقامی اسلحہ ساز کی صنعت کا نمونہ ہے اور جس میں سرے کے رنگ کی سی پسی ہوئی بارود نالی کی راہ سے بھری جاتی ہے۔ اس بندوق کو بھرنا اور اسے چلانے کے لیے تیار کرنا پورے پندرہ منٹ کا کام ہے اور بذات خود ایک تکنیک ہے۔ جنگلوں کا شکاری اپنی اس بندوق پر بے حد مغرور ہے اور اکثر وہ اس ہتھیار کو اپنے سینے پر باندھے خان بیلا کی گلیوں میں ایک عجیب الہیت آوارہ وطن سرحدی کی طرح پھرتا ہے اسی کی وجہ سے خان بیلا بعض دفعہ ایک خاموش پرسکون بستی کی بجائے ایک خطرناک سرحدی چوکی کا تاثر دیتا ہے۔ مگر جنگلوں کا شکاری اپنے اس سفاک ہتھیار کے باوجود ایک جنگجو مجاہد نہیں بن سکتا۔ بھنگ سے سبز ہوتی ہوئی اس کی آنکھیں اس کے جنگلی ارادوں کو جھٹلاتی ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر کشمیر کی باتیں پوچھتا ہے اور اشارتا کہتا ہے کہ اگر اسے خان بیلا میں زمین کے دھندوں (اور معاشقوں) سے فرصت مل سکتی تو وہ جہاد پر ضرور گیا ہوتا (کیا اس کے پاس ایک بندوق نہیں)

وہ ہمیں ایک دن نشانہ کی مشق اور شکار کے لیے باہر کھیتوں میں لے گیا (خان بیلا کے گرد اس کے باغوں اور کھیتوں میں واحد شکار چھوٹے گیرے ہوتے ہیں، فاختا کی!) یہاں میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار بندوق چلائی اور معلوم کیا کہ میں کوئی بڑا ناشانچہ نہیں۔ اسی شکار کی مہم کے دوران میں جنگلوں کا شکاری کے کردار کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آیا۔ اس نے میرے دوست سے 7 جھجکتے

ہوئے درخواست کی کہ اسے اپنی جنسی قوتوں کی افزائش کے لیے ایک ایسی معجون درکار ہے جس سے عورت بالکل اس کی رام ہو جائے اور کسی اور مرد کا خیال نہ کرے۔ میرے دوست کے کریدنے پر اس نے رفتہ رفتہ ہمیں بتایا کہ وہ ایک انیس سالہ کنانی کے دام تیزویر میں گرفتار ہے اور یہ کہ پچھلے چند ہفتوں سے اس کی محبت کا جنسی پہلو اس قدر تشفی بخش نہ تھا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اور اس کی امساک کی اہلیوں میں کافی کمی رونما ہو چکی تھی۔ کنانی بھی اس کی پہلے کی سی مطیع نہ رہی تھی اور اس نے اس کے متعلق بعض باتیں بھی سنی تھیں۔ میرے دوست نے ”جنگلوں کے شکاری“ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کو ایک ایسی زبردست خوراک دے گا جو واجد علی شاہ کے شاہی حکیم کی خاص بیاض کے ایک نسخے سے تیار کی ہوئی ہے اور پھر واپس آ کر اس نے اسی چھپن سالہ عاشق کو کونین مکچر کی ایک بڑی ڈوز اپنے سامنے پلوادی۔

لیکن میں اصل موضوع سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔ میں نے دھاندلوں کی بستی کی دہقانی یونیورسٹی پر قلم اٹھایا تھا اور اب دیکھتا ہوں کہ اصل موضوع کی بجائے میں نوجوانوں کی عام کمزوری اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے خان بیلا کی معاشقانہ زندگی کی کششوں میں پڑ گیا ہوں۔ خیر! پیارے پڑھنے والے! اس سب کو ایک تمہید سمجھو۔ اس اچھے گاؤں پر ایک حاشیہ جہاں سے میں اپنی ننھی سی یا ترا پر روانہ ہوا۔

میرے دوست نے مجھے اس یونیورسٹی کی بابت بتایا تھا جو محض ایک شخص، محض ایک دہقان کی ذاتی کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ تھی اور جس کے کل اخراجات کا صرف وہی کفیل تھا۔ اس یونیورسٹی سے ملحقہ میرے دوست نے کہا، ایک کتب خانہ بھی ہے۔ دو ہزار قیمتی اور نایاب عربی اور فارسی کتب کا ذخیرہ۔ کتابوں کا ذکر سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ مجھے کتابوں سے محبت ہے۔ پرانی، قدیم، ورق لٹے ہوئے انگوٹھوں سے میلے صفحوں والی کتابوں سے خصوصاً۔ دنیا میں کوئی خوشبو مجھے اس خوشبو سے زیادہ پسند نہیں جو بوسیدہ نسخوں، ان کی قدیم جلدوں اور زرد دیائے ہوئے اوراق سے آتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم عربی نہ جاننے کی وجہ سے وہ کتابیں نہ پڑھ سکو اور زرد صفحوں پر لکھی ہوئی باتیں تمہارے لیے اسرار ہیں مگر تم میٹھی سی، باسی سی، شیمپن کی طرح دماغ میں بستی ہوئی سی خوشبو تو سونگھ سکتے ہو۔ تم ان کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپک تو سکتے ہو۔

سو جب میرے دوست نے خود ہی ایک روز یہ تجویز کیا کہ میں اگلے روز شام کے چار بجے سائیکل پر خان بیلا سے روانہ ہو کر دھاندلوں کی بستی پہنچ جاؤں جہاں وہ میرا منتظر ہوگا تو میں نے اسے دل ہی دل میں سراہتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میرا دوست خود اگلے روز صبح پٹواری کے ہمراہ گھوڑی پر سوار پڑتاں پر دھاندلوں کی بستی کی طرف روانہ ہو گیا اور جانے سے پہلے اس نے

ایک لفافے کی پشت پر ایک نقشہ سا بنا کر وہ راستہ واضح کر دیا جو مجھے اختیار کرنا تھا۔ ویسے راستہ اتنا آسان تھا کہ ایک بچہ بھی اس کو سمجھ سکتا تھا۔

یہاں میں اپنے دوست کے بارے میں کچھ لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ محکمہ نہر میں ایک ضلع دار ہے۔ یہ عہدہ اس جیسے ہر لحاظ سے بڑے حیران کن قابلیتوں کے شخص کے لیے قدرے مضحکہ خیز ہے۔ اس کی صلاحیتوں اور اس کے حقیر کام میں جس پر وہ مامور ہے۔ ایک قطعی طور پر بے جوڑ پن اور عدم مناسبت ہے جیسے رستم کو جری لشکروں سے لڑنے کی بجائے بچوں کے ہاتھ گاڑی دھکیلنے پر لگا دیا جائے۔ جیسے نیولین کو میونسپل کمیٹی کا صدر بنا دیا جائے جیسے مرزا غالب کو مقامی بلدیہ میں کسی میونسپل کمشنر کی مدح میں قلیل معاوضہ پر قسیدے لکھنے کے کام پر فائز کر دیا جائے۔ مجھے کپل وستو کے شہزادے کی پاک روح کی جھلک اگر کسی شخص میں نظر آئی ہے تو وہ میرا دوست ہے۔ کتنا عظیم ترین اور بلند ہے وہ اس کی صحبت میں گزری ہوئی ایک گھڑی ایک ایسی سعادت ہے ایک ایسا دائمی اور لازوال تجربہ ہے کہ آدمی اس کے لیے خوشی سے اپنی بے حصول کم مایہ زندگی کے لیے کئی سال دے سکتا ہے۔ اس کی محبت ایک بڑی سی کتاب پڑھنے کے مترادف ہے اور اس کی گفتگو میں ایک مسحور کن ڈرا دینے والی صفت ہے جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کی گفتگو کی یہ عجیب کشش انسانیت کے لیے اس کی حقیقی تڑپ اس کی ان خوبصورت بڑی آنکھوں میں وہ بے باک اور حوصلہ افزا نگاہ جو جھوٹوں اور کچھڑ میں رہنے والے انسانی مینڈکوں کے لیے (جیسے ہم میں سے بیشتر ہیں) پر تحقیر اور بے رحم ہے۔ اس سب کچھ کو الفاظ میں اس طرح پیش کرنا کہ پیارے پڑھنے والے تم اس بڑے آدمی کی ایک زندہ جیتی جاگتی تصویر اپنے روبرو دیکھنے لگو تو اس کے لیے تو بازو ویل جیسی صلاحیتوں اور حافظہ اور صبر کی ضرورت ہے۔ میں بد قسمتی سے کوئی بازو ویل نہیں۔ ایک دفعہ کئی سال پہلے اسے ڈیرہ دون میں آرمی کمیشن کے لیے تقریباً چنا گیا، اس نے کمیشن سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح سے بچا لیا۔ کیونکہ اس نے مجھے بتایا کہ اگر کبھی فوج میں شامل ہوا بھی تو ایک معمولی پرائیویٹ کی حیثیت سے شامل ہوگا۔ اور یہ محض ایک لڑکے کا ناپختہ جوش نہ تھا۔ اس میں وہ برفانی حوصلہ ہے جسے نیولین سرما کی آدھی رات کا حوصلہ کہا کرتا تھا۔ وہ ایک بھلا راج پوت گھرانے کا سپوت ہے اور ڈھاکوں کے درمیان وہی کے دامن میں اس کا حسین دیس ہے اس بھلے شہزادے کا خاندان اپنی پرانی قبائلی روایات اور اس کے افراد کے درمیان ایک مضبوط خونی بندھن کی وجہ سے (جس سے وہ ایک دوسرے سے ایک ایسی خاندانی وفاداری سے جکڑے ہوئے ہیں جو ان دنوں میں حیران کن ہے) مجھے اکثر سکاٹ لینڈ کے ان سرحدی قبیلوں کے سرداروں کی یاد دلاتا ہے جن کے متعلق والٹر سکاٹ اور اسٹیونسن کے زندگی سے اچلتے ہوئے ناول ہمیں بتاتے ہیں۔ وہ گیور اور اقبال کا عاشق ہے (اسے ان کے صفحات ازبر ہیں) اور ان

دونوں نے اس کے کردار کی تشکیل میں بہت حصہ لیا ہے۔ اس کے علاقے کے سادہ دہقانوں کے لیے جو اس کے پاس پانی یا خرابہ کی درخواستیں لے کر آتے ہیں اس کے دروازے اور اس کا دل ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ ان کی مصیبت دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کے گھر کی چھت کے نیچے وہ دہقان اپنے آپ کو محفوظ پاتے ہیں۔ وہ اپنے سارے دکھ اس کے پاس لے کر آتے ہیں۔ میرے دوست کو اکثر دکھ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لیے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس ملک میں اصل مسئلہ روندے ہوئے لوگوں کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی ہے۔ اس استعماری نظام میں یہ خوشحالی ممکن نہیں اور غریب آدمی کی اذیت کو کسی طرح ہلکا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کہانی میں اپنے دوست کے متعلق یہی کچھ لکھوں گا۔

اگلے روز چار بجے میرے دوست کے ملازم اور باورچی (اور دوست) غلام قادر نے اپنے سائیکل کو باہر نکال کر صحن میں کھڑے ہوئے شریں کے تنے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اس نے پمپ کے ذریعے بائیکل کے پہیوں میں نہایت پیار اور احتیاط سے ہوا بھری۔ دہلا پتلا اور چھلا وہ نما غلام قادر اپنی زبان کا شاعر بھی تھا اور اس نے ہوا بھرتے وقت اپنی سائیکل پر لکھی ہوئی نظم کے بند جیسی لے میں گنگنا نے شروع کئے۔ یہ نظم جو ہم تقریباً ہر رات تیل کے لیمپ کی پیلی ریٹنگی ہوئی روشنی سے لپی ہوئی دیواروں والے کمرے میں اس سے سنا کرتے تھے اور جس کی سادگی اور خوبصورتی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ریاست کے رہنے والے ہیں۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے۔

ایہو	سیکل	گھر	پہنچیندا	اے
تے	دچھڑے	یار	ملیندا	اے

(یہی سائیکل گھر پہنچاتا ہے اور بچھڑے یار ملاتا ہے)

میں نے اپنا سامان گٹھڑی کی صورت میں باندھ لیا تھا۔ رات کا پا جامہ، تولیہ، اپنے دوست کے کچھ سرکاری کاغذات جن کی اسے ہسپتال پر ضرورت تھی اور مسٹر بلیر بیلک کے افسانوں اور مضامین کا ایوری مین ایڈیشن، گٹھڑی کے پیچھے ایک رسی کے ذریعے کیرئیر پر کس دی گئی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ہوا وغیرہ ٹھیک ہے اور یہ کہ بریکیں کام کرتی ہیں (ایک کام نہیں کرتی تھی) میں گویا یا تر اپر روا لگی کے لیے تیار تھا۔

اب میں نے پتلون کی جیب میں سے پیکٹ نکال کر قینچی کا سگریٹ سلگایا۔ میرے خیال میں سگریٹ سلگانے کا جائز ترین اور بہترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب آدمی سفر پر روانگی کا آغاز کرنے والا ہو۔ اور اس تقریباً مقدس ریت کے لیے ایک بڑا اچھا سگریٹ ہونا چاہیے۔ بلیک اینڈ وائٹ، پانچ سو پچپن یا وہ روسی سو برانچس کاٹن دس روپے میں ملتا ہے۔ جس کے کاغذ کا رنگ افیون کی طرح سیاہ

ریشمی ہوتا ہے۔ اس جس کے بھنے تمباکو میں (مجھے یقین ہے) حشیش کی آنچ ہوتی ہے۔ مگر خان بیلا میں بہترین اور سب سے بڑھیا سگریٹ جو دستیاب ہو سکتا ہے وہ قینچی ہے۔ بے شک قینچی ان سگریٹوں میں سے نہیں جو پرکشش ٹینوں میں سے فرار اور سکون کے راہداروں کی طرح نکلتے آتے ہیں اور جن کے متعلق ان کے بنانے والے تمہیں یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کو ایڈورڈ ہفتم اور دوسرے دولت مند خوش ذوق امیر باقاعدگی سے پینے کے عادی تھے اور یہ کہ ان کے شاہانہ حلقوں کو ان سے ذرا بھر بھی نقصان نہیں پہنچا۔ جن کے متعلق بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان میں استعمال شدہ تمباکو سے بہتر تمباکو ورجینیا میں اور کہیں نہیں گوندھا جاتا۔ قینچی ایک پرولتاری سگریٹ ہے۔ غالباً ایک متوسط الحال سفید پوش سگریٹ مگر یہ ایک اچھا ایماندار سگریٹ ہے اور اسے کسی کی نفاست طبع پر گراں نہ گزرنا چاہیے۔ جو کچھ بھی ہو خان بیلا اس سے بہتر سگریٹ دینے سے قاصر ہے۔

غلام قادر سائیکل پکڑے میرے ساتھ گاؤں کے باہر سڑک تک آیا اور جب ہم خان بیلا کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں اور بوریوں کے سائبان والے بازار سے گزر رہے تھے (وہ بازار جہاں چھوٹی دکانوں میں یہاں کے سوداگر بچے گڑ کی بھیلیاں، نمک، تیل، لون، مٹھانے اور کپڑے دھونے کا صابون بیچتے ہیں) وہ مجھے راستے کے متعلق واضح ہدایات دے رہا تھا۔ اسے شاید میرے منزل مقصود پر پہنچ سکنے کا یقین نہ تھا۔ اس نے مجھے کتوں سے بھی خبردار رہنے کا مشورہ دیا جس پر میں مسکرایا۔ کیونکہ میں کتوں سے مطلق نہیں ڈرتا اور ان لوگوں کو تحقیر سے دیکھتا ہوں جو ڈرتے ہیں۔

سڑک پر میں نے اسے الوداع کہی اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔ مولوی غلام قادر اپنے آموں کے باغ میں کھڑا ہوا اپنے چند آدمیوں سے کام کروا رہا تھا۔ ہاتھ ملا کر میں نے اسے سلام کیا اور پختہ پکی سڑک پر پہنچ گیا جو ریاست بہاولپور کے شمال مغربی حصے کے وسط میں سے ایک شہر کی طرح گزرتی ہے۔ لاہور اور کوئٹہ اس شاہراہ کے دوسرے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں یہ فوجی اغراض کے تحت بنائی گئی تھی۔ بعض ٹکڑے چھوٹی سلوں سے مسطر ہیں۔ بعض ٹکڑے باقاعدہ Metalled ہیں۔ پچھلی جنگ نے ریاست بہاولپور کو کم از کم ایک گھٹیا گرانڈ ٹرنک روڈ تو دے ہی دی ہے۔ ایک شاہی شاہراہ جو مستقبل میں ملک میں تجارت اور صنعت کی ریل پیل میں ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت اور ضرورت زیادہ سے زیادہ جتائے گی۔ آج کل ماسوا کے دے ٹرک یا موٹر کار کے سڑک پر سے بہت کم ٹریفک گزرتا ہے۔

”ایہو سیکل گھر پہنچیں اے“ میں گہری سوچیں سوچتا ہوا، سہ پہر کے سورج کی زریں فضا میں سے پیڈل چلاتا گزرتا گیا۔ کھیتوں اور کیکروں اور ہوا کے تھیسڑوں سے جھکے ہوئے ریشمی جھالروں والے سروٹوں کے پاس سے کھجوروں اور دوسرے پیڑوں کے جھنڈوں

میں دھکتے ہوئے گوٹوں کے پاس سے، میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ یہ رومانیت سے پرگوٹ ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے تھے۔ ہر گوٹ عموماً ایک دو پکے مکانوں، متعدد گھاس کے چھپروں کی جھونپڑیوں، ایک گنبد والے روضے اور ایک پتلے میناروں والی مسجد پر مشتمل ہوتا۔ میں نے سوچا ہر گاؤں کا ایک چھوٹا فرعون ہے جو پکی حویلی میں رہتا ہے۔ اس کی اطاعت گزار رعیت، گھاس کی جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ اونچے میناروں والی مسجد چھوٹے فرعونوں نے ثواب کے لیے بنوائی تھی اور غالباً اس لیے بھی کہ اس کی رعیت اس میں اللہ کو یاد کرنے میں مشغول رہ سکے۔ اس گاؤں کے رہنے والے (یعنی رعیت) اپنی کسی مشکل کے وقت اس گنبد دار روضے کے نیچے سوئے ہوئے پیر یا ولی کے پاس جا کر گڑ گڑاتے تھے جو ان کو اپنی کرامات کے طفیل اولاد اور مولیٰ عنایت کرتا تھا اور جو پراسرار جسمانی عارضی سے ان کی اور ان کے بچوں کی جان بچاتا تھا۔ انہیں شاید خدا سے زیادہ اپنے اس پاک آدمی کی اعانت پر اعتماد تھا اور وہ ان سب مافوق الفطرت معجزات اور کرامات پر یقین کرتے تھے جو سجادہ نشین ان کو اپنے ولی کے متعلق بتاتا تھا۔ اللہ دور تھا، اوپر آسمانوں کے پردوں کے پیچھے ان کا پاک آدمی ان کے درمیان تھا۔ چھوٹا فرعون پاک آدمی سے بھی زیادہ نزدیک تھا۔

ان لوگوں کے لیے تحریر و تقریر کی آزادی، اشتراکیت، اشتمالیت، جمہوریت اور دوسری ہمتیں کتنی دور کی باتیں تھیں، میرے کافی باؤس والے ذہنی اور زردور نو جوانوں کی گرم اور تند بخشش (کافی کو چوستے ہوئے ۹ ان کے ملک کو جنت بنانے کے ارادے) (پانچ سو بچپن پیتے ہوئے) ان لوگوں سے کتنی صدیاں آگے تھے۔ ان لوگوں کو تم کوئی سا بھی ”ازم“ یا کوئی سی بھی ہیبت دے دو وہ اسے برداشت کریں گے۔ بشرطیکہ ان کے پیر، ان کے خدا اور ان کے چھوٹے فرعون کو ان سے نہ چھینا جائے۔ ان کے بغیر وہ اس الجھی ہوئی ظالم دنیا میں کھو جائیں گے۔

پاس ایک جھاڑ کے پیچھے سے ایک کسرتی بدن کا کتا یک لخت میری طرف پھلانگتا ہوا آیا۔ اس کتے کا ارادہ میری ٹانگ لینے کا تھا اور خطرہ دیکھ کر میں فوراً سائیکل سے نیچے اتر آیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سائیکل کو اپنے اور کتے کے درمیان حائل کر کے میں نے اس بھونکتے ہوئے حیوان کو طیش بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ اب اپنا ارادہ بدلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر وہ ان عام کتوں سے زیادہ دلیر تھا جو ذرا سی بھیگی دینے سے دم کو ناگوں میں لے کر چلے جاتے ہیں۔ اس نے اپنا بھونکنا اور لپکنا جاری رکھا اور (میں اقرار کرتا ہوں) کہ میں اب خائف ہونے لگا۔ کچھ دیر بھونکنے کے بعد یہ کتا پرے جھاڑیوں میں چلا گیا مگر میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ پھر لوٹ کر میرا تعاقب کرنے کا فیصلہ نہ کرے۔ کچھ دور سائیکل ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ پیدل چلتا گیا۔ میرا یہ ڈر بے بنیاد تھا کیونکہ ایک بار جو کتا شکست تسلیم کر چکا ہو وہ دوبارہ جنگ کے لیے نہیں لوٹتا۔ ان لوگوں کو جو کتوں سے خائف ہیں۔ میں ایک ”گر“ بتاتا ہوں کبھی

کتوں سے نہ بھاگو۔ مدافعت اور چیلنج کے انداز میں ان کے سامنے کھڑے رہو۔ ان کو یہ تاثر نہ دو کہ ان سے خائف ہو ورنہ وہ تمہیں کاٹ لیں گے۔ یعنی ان کے کاٹنے سے پہلے تم خود انہیں کاٹ لو۔

میں نے آگے سڑک پر ایک خاندانی قافلے کو جالیا۔ کنبے کا بڑا بزرگ ایک چھوٹے سے ٹیوپر سوار تھا وہ ایک پگڑ پہنے تھا اور ٹیوپر کے دیہاتی جتنے اور قامت کے لیے اتنا چھوٹا تھا کہ اس آدمی کے پاؤں سڑک کی سطح سے گھسٹتے جا رہے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی اس پر ہنسنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے چہرے پر اپنے کنبے کی سرداری اور تمکنت اور سنجیدگی تھی۔ اس کا کنبہ جولا تعداد عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا اس کے پیچھے دو اونٹوں پر کجاؤں میں ٹھنسا ہوا تھا۔ کجاوے میں لدی ہوئی عورتوں نے مجھے ایک عجیب دلچسپی سے دیکھا۔ ان میں سے دو کچھ ایسی بد صورت نہ تھیں اور وہ آدمیوں کے بازوؤں کے لیے بھرپور تھیں۔ میں نے سوچا ان عورتوں کی زندگیوں میں معاشقے ہوتے ہوں گے یہ بھی گاؤں کی گلیوں کے موڑوں پر اندھیرے میں اپنے رانجھنوں کا انتظار کرتی ہوں گی۔ کون جانتا ہے پھر بھی ان کو دیکھتے ہوئے اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو ان باتوں سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ ان کے چہروں پر (سوائے ایک کے) ایک معصومانہ کنوار پن کی چھاپ تھی جو عورتیں پتا نہیں کیسے پہن لیتی ہیں۔ تندرستی اور صحت اور جوانی سے دمکتی ہوئی، اپنے سرخ کپڑوں میں سے جھلملاتی ہوئی (مجھے ایسا لگا) وہ کراچی کے بے جان بد صورت سیاہ سوکھی ٹانگوں والی تیلیوں (ٹائپ رائٹر پر ٹپ ٹپ آٹھ گھنٹے ٹپ ٹپ) اور برقعہ میں مدفون یا مکفون بے ہنگم لاشوں کے مقابلے میں کتنی زیادہ خوش نصیب تھیں۔ اس کا کیا کہ یہ عورتیں کبھی کالج نہ گئی تھیں یا ان کے گھبراتے خاوندوں کے پاس موٹر کاریں نہ تھیں۔ فتح ان کی ہی تھی۔ صحت کی دمک ان کی تھی وہ اپنے خاوندوں کو خوشی اور لطف دے سکتی تھیں انہوں نے گھبر و مرد دیکھے تھے اور محبت کی تھی۔ یہ قافلہ اب غالباً کسی پیر کے عرس یا کسی قربت دار کی شادی میں شریک ہونے جا رہا تھا اور ظاہر تھا کہ وہاں وہ خوب مزے کا وقت کاٹیں گی۔ صحت اور جوانی سے دکتے ہوئے چہرے!

میں نے ان کو قدرے ہچکچاہٹ سے پیچھے چھوڑا۔ میرے پاس سائیکل کو اتنا آہستہ چلانے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ رہوں۔ کھیتوں میں اور سڑک کے بیچ میں مجھے ننھے چرواہے ملے جن کے راگ میرے دوست ندیم نے اپنی لافانی نظموں میں گانھے ہیں۔ وہ عموماً سڑکوں کے وسط میں مکمل اطمینان اور بے پروائی سے بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے اپنے بکریوں یا بھیتروں کے ریوڑ کی نگہبانی کرتے تھے۔ زندگی ان کے لیے فراخ اور کشادہ اور شیریں تھی اور دنیا ایک چمکیلی منمناتی ہوئی گھنٹی۔ کوئی ظالم استاد یا بے حس باپ ان کی جانوں پر ہر وقت سوار نہ رہتے تھے۔ انہیں خشک کتابوں کے رٹنے کا عذاب بھی معلوم نہ ہوگا۔ وہ کبھی دفتر کے سنول پر نہ بیٹھیں گے۔ وہ بھی اپنی اس چھریری جسمانی متناسب الاعضاء خوبصورتی کو نہیں کھوئیں گے۔ (وہ بد صورت اور بھدے اور کوتاہ نظر نہیں ہوں

(گے)

وہ اس طرح پھول پھل رہے تھے جیسے ایک درخت اگتا ہے، جیسے ایک ندی بہتی ہے۔ ورڈز ورتھ کی لوسی گرے کی طرح مادر فطرت خود (کھلی فضا کی تاروں سے نکھری ہوئی راتیں بھڑکتی ہوئی شفقتیں، فراٹے بھرتی ہوئی ہوا، مادر فطرت یہی تو تھی) ان ننھے چراواہوں کی تشکیل کر رہی تھی۔ یہ ننھے چرواہے وہ کبھی نیوراس کا شکار نہ ہوں گے۔ وہ کبھی کراچی کے کروڑ پتیوں اور تاجروں کی طرح محض افراد اور محرومی ہی کو زندگی نہ سمجھیں گے۔ وہ کبھی بنگلوں اور سٹاک ایکسچینجوں پر استوار شدہ سونے کی چمکی کے پاٹوں میں نہ پسیں گے اور کبھی ہر آدھ آدھ گھنٹے کے بعد ایک بیکار بے فائدہ دوڑ کے بعد سامنے کے ایرانی راستوران میں بیٹھ کر ایک چائے اور پانی کا گلاس اپنے اندر نہ انڈیلیں گے۔ دولت! سٹوڈی بیکر، کوئٹہ، بیوک، تہذیب! مگر تہذیب اپنے عقب میں کیا لائی ہے۔ ایک ناقابل علاج بے سکونی اور محرومی، سچی سادہ زندگی سے دوری، نیوراس، تہذیب! تہذیب سگمنڈ فرامڈ کو لائی ہے اور اس کی وہ سب تحت الشعور اور لاشعور اور احساس اوڈی پس کی عجیب و غریب پاگل بنادینے والی تھیوریوں کو موجودہ مہذب دنیا کی بیشتر آبادی، محروم آدمیوں پر مشتمل ہے جو عجلت بوتے ہیں اور بدبھمی کاٹتے ہیں اتنے بڑے مسئلے کی ہیبت ناک وسعت کا تصور کرتے ہوئے آدمی دہل جاتا ہے۔ ان آدمیوں کی محرومی جو دولتیں کما چکے ہیں، ان کی جو کسی طرح دولت نہیں کما سکے ان کی محرومی جو جنسی طور پر محروم اور غیر مطمئن ہیں اور سائیکالوجی میگزین کا بھت مطالعہ کرتے ہیں، ان کی جو نہیں جانتے کہ وہ پیدا کیوں ہوئے اور اب ہو گئے ہیں تو کیا کریں وہ لا تعداد سگریٹ پھونکتے ہیں۔ لا تعداد چائے کی پیالیوں میں فرار ڈھونڈتے ہیں۔ یہ ننھے چرواہے تہذیب کے لائے ہوئے اس خوف ناک عارضے سے محفوظ رہیں گے۔

جب میرے انٹیکچوئل دوست، کپکپاتی ہوئی انگلیوں میں سگریٹ پکڑے، کافی کے پیالے پر اقتصادیات اور اونچی سیاسیات پر عالمانہ بحثیں کرتے ہیں اور رائے پیش کرتے ہیں کہ اشتمالیت یا اشتراکیت یا شریعت سب انسانی دکھوں کا تریاق ہے اور یہ زمین پر ایک نیا بہشت لے آئیں گی تو میں اکثر سوچنے لگتا ہوں، کیا یہ سب کچھ اتنا ہی آسان ہے۔ کیا اقتصادیات کی تھیوریاں فی الواقع دائمی سکون اور خوشی انسان کو دے سکیں گی۔ آدمی نے سائنس میں، ادب میں، آرٹ میں اتنی ترقی کی ہے مگر کیا بیسویں صدی کا مہذب آدمی جو ہوا میں اڑ کر بارہ گھنٹے میں کراچی سے لندن پہنچ سکتا ہے۔ اپنے پتھر اور دھات کے زمانے کے مورث سے زیادہ خوش، زیادہ مطمئن ہے! مجھے اس میں شک ہے۔ مجھے یہ ساری ترقی (اگر یہ فی الحقیقت ترقی ہے) قدرتوں کی ایک کڑی تضحیک لگتی ہے۔

میں اب منچن برانچ پر تھا۔ یہاں مجھے سڑک کو چھوڑ کر بائیں طرف مڑنا تھا۔ اور نہر کی پٹری پر پانچ چھ میل آگے جانا تھا۔ ریاست

کی نہریں اس کے خطوں میں اس طرح پڑی ہوئی ہیں جیسے انسانی جسم میں شریانیں۔ ان کے ذریعے اسے اس صحرا میں زندگی کا خون دوڑتا ہے لیکن اب یہ صحرا صحرا نہیں ہے۔ بیکانیر اور جیسلمیر کے ساتھ سرحدی علاقے کو اور مہیب روحوں کو چھوڑ کر ریاست کا ایک بڑا حصہ ان نہروں کی شفقت سے اب ایک سرسبز کھلتا ہوا باغ ارم بن چکا ہے۔ کل کو اگر کسی وجہ سے یہ نہریں یہاں نہ رہیں یا دریا سوکھ جائیں تو یہ سارا خطہ پھر ہیر و ڈونس کے میسو پوٹیمیا کی طرح ایک بخر بے آب و گیاہ صحرا میں بدل سکتا ہے۔ پانی دیوتا کے ہاتھ میں اتنی مہیب طاقت ہے۔

مخن براچ کی ہموار جمی ہوئی پٹری پر سائیکل چلانا بے حد خوشگوار لگتا تھا۔ نہ کوئی ہچکولے تھے نہ ہی سائیکل کی شکایت آمیز کراہیں! کیرئیر پر بندھے ہوئے پمپ کی کھڑکھڑاہٹ جو مجھے راستہ بھردق کرتی رہی تھی۔ پٹری پر آتے ہی بند ہو گئی اور مجھے کئی دفعہ یہ جاننے کے لیے مڑ کر دیکھنا پڑا کہیں پمپ گرتو نہیں پڑا۔ نہر کے دورویہ شریں اور کیکر اپنی شاخوں میں سورج کا سونا لئے ایستادہ تھے اور ان کے درمیان نہر گہری اور زمر دیں اور پراطمینان بہہ رہی تھی۔ کالج کے دنوں میں جب میں اسٹیونس اور رائیڈر بیکر ڈکے مہماتی ناول پڑھا کرتا تھا اور ان کے کرداروں کی سی زندگی جینا چاہتا تھا تو میں ان نہروں میں خیالی سفروں کے پروگرام بنایا کرتا۔ ان دنوں میں ایک عرصے تک سنجیدگی سے ایک نہ ہو سکنے والی کینوس کی کشتی خریدنے پر غور کرتا رہا تھا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے بمبئی ایک دو انگریزی کمپنیوں کو بھی جو کینوس کی کشتیاں مہیا کر سکتی ہیں اس سلسلے میں لکھا۔ ایک کشتی کی قیمت کا میں اس وقت کفیل نہ ہو سکتا تھا اور آخر مجھے چارو ناچار اس ارادہ کو ترک کرنا پڑا۔ آدمی ان نہروں کے ذریعے تقریباً ساری ریاست کا سفر کر سکتا ہے اور پانی کے بہاؤ پر سفر کرنے سے بے جا مشقت بھی نہ کرنا پڑے گی۔ اگر وہ چاہے تو مچھلیاں پکڑتے ہوئے سفر کر سکتا ہے یا اپنی کشتی میں لیٹ کر نیلے آسمان کو اوپر سے گزرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے وہ پرندوں کی راگینوں کے ساتھ لاتعداد سگریٹ پی سکتا ہے یا اسٹیونس کو پڑھ سکتا ہے۔ قصہ مختصر ہزار اور ایک چیزیں ہیں جن سے وہ اپنا دل بہلا اور اپنا وقت خوشی اور نفع سے گزار سکتا ہے۔ جب وہ بہتا بہتا کسی آبشار کے پاس پہنچے تو وہ کشتی کو کھے کے کنارے پر لے جائے اور اس کو کندھے پر اٹھا کر (کیونکہ یہ ہلکی ہوتی ہے اور اس کا وزن سو پونڈ ہوتا ہے) اگلی نہر میں ہموار پانی میں اتار دے جہاں سے اس کا سفر پھر جاری رہ سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دن رات کشتی ہی میں رہے۔ وہ سبز کنارے پر اسے باندھ کر اپنی چائے یا کافی بنا سکتا ہے۔ وہ آس پاس کے گاؤں میں زمینداروں کے ہاں بطور مہمان ٹھہر سکتا ہے اور ان سے رخصت ہوتے وقت اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کو چاندی کے سکوں میں اس مہمان نوازی اور پناہ کا صلہ ادا کرے جو اسے ان کی غریبانہ چھتوں کے نیچے میسر ہوئی مگر وہ جاتے ہوئے اس مہمان نوازی کی ادائیگی ایک فراخ شکر گزار

مسکراہٹ اور اچھے مہربان الفاظ سے کر کے اپنے میزبانوں کو ہمیشہ کے لیے رام کر سکتا ہے۔ اگر تم ریاست کے دہقانوں کی اصل زندگی کا لطف اور مہمائی اضطراب کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہو تو تم یقیناً اس نہری سفر سے بہتر اور خوشگوار سفر کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملک میں لوگ اس قسم کے خیالات پر ہنستے ہیں۔ ہم میں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جن کو قدرت اور کھلی ہوا اور مہموں سے محبت ہے۔ بیشتر انسانوں کے لیے واحد مہم سونے کی کان دریافت کرنے کی مہم ہے اور اس کان تک چائے کے ان گنت پیالوں، محرومی کی مسلسل گھڑیوں لالچ اور ضمیر کشی اور زمانہ سازی کی بھیانک دلدلوں میں سے ہی گزر کر پہنچا جاسکتا ہے۔ (ہمارے ملک میں بیک وقت ایماندار اور دولت مند ہونا ممکن نہیں)

ہوا پر لائی ہوئی مبہم آوازیں مجھے سنائی دیتیں۔ نیچے دہکتے ہوئے سبز کھیتوں میں موسیقیوں کے گلے میں گھنٹیوں کی دھیمی آوازیں شاید یہ دنیا کی سب سے زیادہ رومانٹک اور خوبصورت آواز ہے۔ گھنٹیوں کے بجنے کی آواز شاید پہلی موسیقی تھی جو انسانی کانوں نے سنی ہے یہ یقیناً عظیم ترین موسیقی ہے جو تم سن سکتے ہو۔ خوشی سے ٹھناتی ہوئی گھنٹیاں غم اور موت کی اداس اور ہولے ہولے بجتی ہوئی گھنٹیاں، لمبے سکوت کے وقفوں کے بعد موسیقیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹنٹن، پھر فاختہ کی کوکو کو کو آئی۔ تم اس آواز کو ان علاقوں میں دوپہر اور سہ پہر کے وقت ہمیشہ سنو گے اور اگر تم ویسے ہی آدمی ہو جیسا کہ میں تم کو سمجھتا ہوں (اگر تم ویسے نہ ہوتے تو تم اس مضمون کو شروع سے ہی اکٹا کر کسی زیادہ پر لطف مشغلے کی خاطر چھوڑ چکے ہوتے) تو تم ضرور کبھی نہ کبھی اس آواز سے مسحور ہوئے ہو گے فاختہ کی ضد پر جو پرندہ ہے وہ الو ہے۔ الورات کے سنائے میں بولتا ہے اس کی آواز میں ایک برائی اور بدی کا سر ہے اور وہ اجاڑ جگہوں اور مستقبل کی مایوسیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مگر ”گلوبند“ لگی فاختہ کی الاپ میں ایک رفاقت سی ہے، ایک امید سی۔ یہ فاختہ آدمی کی دوست ہے اور جب تک مسافر اپنے سفر پر اس رفاقت کی الاپ کو سن سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں اور سب ٹھیک ہے۔

پڑی پر تین عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، ایک بوڑھی اور سن رسیدہ تھی اور اس کے سفید چاندی کے پریشان بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ابھی اس کا چہرہ بد صورت اور چھوڑا نہ ہوا تھا اور جادوگرنی سی نہ لگ رہی تھی جس طرح بہت سی بوڑھی عورتیں لگنے لگتی ہیں (عمر عورتوں کے لیے سخت مہلک ہے اور انہیں گھناؤنی جادوگرنیوں میں تبدیل کر کے دم لیتی ہے) عمر عورت کی مستقل ہر وقت حاضر سخت دل دشمن ہے اور اپنے شکار کو یہ مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ اس کی موجودگی بھول جائے۔ خوبصورت قلو پطرہ بھی اپنی کشش کھودے گی، اس کے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ وہ ایک جادوگرنی کی طرح خمیدہ اور خوفناک ہو جائے گی۔ یہ ایک عورت کا ناگزیر گھناؤنا

مستقبل ہے۔ دوسری دو عورتوں میں سے ایک نہر کے کنارے پر کپڑے چٹختے میں منہمک تھی اور دوسری پٹری کے سرے پر کھڑی کچھ جھکی ہوئی ایک کپڑا نچوڑ رہی تھی۔ اس نے مجھے کچھ محبوب، سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ انیس بیس برس کی ہوگی، جسم بھرپور اور ترغیب دینے والا تھا۔ میں نے قیاس کیا کہ وہ غالباً اس بوڑھی عورت کی بیٹی ہے۔ کیا اس کے مشاغل ہمیشہ اتنے ہی محبوب اور معلوم ہوتے ہوں گے جتنا یہ کپڑے نچوڑتا۔

آگے جا کر میں نے اس مسئلے پر زیادہ سوچنا شروع کیا، ایک صورت میں وہ کیا چیز تھی؟ وہ کیا کشش تھی؟ کیسا پیغام تھا جس کی وجہ سے تم اس کو دیکھے بغیر اور ایک نفس خیال دل میں لائے بغیر اس کے پاس سے نہیں گزر سکتے تھے۔ کیوں ہمیشہ ہمارے خون میں ایک چھوٹا سا سلاطین، ایک ننھا سا ہیجان بپا ہونے لگتا ہے۔ کیوں تمہارا چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ کشش صرف جسموں کی کشش تھی یا اس میں دور وحوں کے اختلاط کی خواہش مضمر تھی۔ ایک دہکتی ہوئی نوجوان عورت کو دیکھ کر کیوں تمہارا دل ایک مبہم سی تمنا، ایک ازلی تنہائی کے احساس سے ہلنے لگتا ہے اور وہ نامعلوم حسرت سی کہ تم اس کو کبھی اپنے بازوؤں میں نہ لے سکو گے کہ یہ مادہ تمہارے مادے میں کبھی مدغم نہ ہوگا۔ وہ نامعلوم حسرت کیوں سینے میں دھوئیں کی طرح اٹھتی تھی۔

عورت کے حسن سے بڑھ کر اور کئی چیزوں کا حسن تھا۔ یا قوتی نا پوکا حسن، سفید ابا بیلوں کے سے بھاگتے ہوئے ایک جہاز کا حسن، رنگین شفق کا حسن، سورج کی سنہری روشنی میں نہاتے ہوئے کھیت کا حسن۔ ان چیزوں کے حسن سے آدمی تھک جاتا تھا اور کچھ دیر کے بعد ان سے بے پروا ہو جاتا تھا مگر کوئی آدمی ابھی تک ایک خوبصورت عورت کو دیکھنے یا گھورنے سے نہیں تھکا اور دیکھنے میں ایک مبہم تمنا دہی ہوئی ہوتی ہے کہ کاش ان کے مادے ایک ہو سکتے اور اس خوبصورت عورت کا جسمانی تصرف ممکن ہوتا۔ ہمارے دلوں میں یہ تمنا ہمیشہ رہے گی اور ہم سب نفس اور عامی حیوان ہر عورت کی عصمت دری کرنے پر آمادہ رہیں گے۔

پیارے پڑھنے والے! ہمیں گناہ اور جرم کا احساس نہ ہونا چاہیے۔ قدرت کی طاقتیں گہرے اور پراسرار طریق پر کام کرتی ہیں اور ایک مرد کا ایک عورت کی طرف کھینچنا اتنا ہی قدرتی ہے جتنا کہ بارش سے بھیگے ہوئے ایک ننھے پرندے کا اپنے گھونسلے میں گھس کر پناہ لینے کی کوشش کرنا۔ میں آزاد اور قدرتی محبت کا وکیل نہیں مگر اس کو اس قدر گھناؤنا اور ہولناک نہیں سمجھتا تھا جتنا کہ لوگوں کے اخلاق کے محافظ اس کو سمجھتے ہیں۔ مجھے ہوا کے پرندوں اور حیوانوں کے جوڑوں کی محبت میں کچھ گھناؤنا پن نظر نہیں آتا۔ مگر لوگوں کے اخلاقوں کے محاسب پوچھتے ہیں ”تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ گیا۔“ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان بھی محض ایک حیوان ہے اور کتنے ہی سماجی اور معاشی قوانین کی قیود میں اسے کیوں نہ جکڑ دیا جائے۔ وہ کتنا ہی مہذب ہو جائے اس کی جبلی حیوانیت مرنہیں سکتی۔ یہی جبلی

حیوانیت اصلی انسان ہے۔

خان بیلا سے روائگی کے وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنا اگلا سگریٹ تقریباً اپنے سفر کا آدھا حصہ طے کر چکنے کے بعد پیوں گا۔ اب میں آدھے سفر سے کافی زیادہ طے کر چکا تھا اور میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اب تم ضمیر کی کسی سرزنش کے بغیر اپنا سگریٹ پی سکتے ہو۔ میں سائیکل کو پڑی کے کنارے ایک سنگ میل کے متوازی لے آیا اور گدی پر بیٹھے بیٹھے اور سنگ میل کے اوپر ایک پاؤں رکھے میں نے یہ متبرک خوشگوار اور رسم انجام دی۔ سگریٹ کو سلگانے میں سگریٹ پینے کا آدھا لطف ہے اور لیڈی نکوٹین کے سچے غلام ہمیشہ سگریٹ کو سلگانے سے پہلے بعض آداب کا لحاظ رکھتے ہیں۔

وہ اسے محبت سے اپنی انگلیوں میں سہلاتے ہیں اس کو ڈبیا پر تھپکتے ہیں اور اس طرح جان بوجھ کر اس کو سلگانے کے لمحے کی عظیم مسرت کا انتظار کرتے ہیں۔ لیڈی نکوٹین! اگر میں شاعر ہوتا تو تمہارے گیت گاتا، کیا ہوا اگر انسان تندرست نہیں، کیا ہوا اگر وہ غریب اور تنگدست ہے اور اسے پچھلے ماہ کا مکان کا کرایہ بھی ادا کرنا ہے۔ کیا ہوا اگر کوئی عورت اس سے محبت نہیں کرتی۔ لیڈی نکوٹین تو اس کی ہے۔ اپنے سارے جھوٹے تفکرات، حقیر محرومیوں کو تم سگریٹ کے ایک کش میں اڑا سکتے ہو۔ میں نے نیچے سبز کھیتوں کی وسعت پر دھواں اڑاتے ہوئے اپنے سگریٹ کو اطمینان اور سکون سے ختم کیا۔

میں سگریٹ ختم کر کے پھر روانہ ہوا۔ ”ایہو سیکل گھر پہنچیند اے“ سہ پہر کی تہمتا ہٹ اور خیرگی اب نہ رہی تھی اور وہ شام کی سرحد پر گویا دم لے رہی تھی۔ سامنے ایک گاؤں تھا جو پڑی کے نیچے اپنے کھجور کے جھنڈوں اور آرام کے پیڑوں کے جھرمٹ میں دبکا ہوا بے حد حیرت انگیز لگ رہا تھا۔ پڑی کی طرف رخ کئے ایک پختہ اینٹوں کا رومانٹک مکان تھا جس کے روشن دان برقعے کی آنکھوں کی مانند چوکور اور جالی دار تھے۔ اس کی بغل میں ایک روضہ تھا جس کا گنبد گرما کے آسمان کا سانپا تھا۔ مکان کے صحن میں مرغیاں پھڑ پھڑاتی اور کڑکڑاتی ہوئی پھر رہی تھیں۔ اس گاؤں میں عجیب سکون اور امن بس رہا تھا، یوں محسوس ہوتا جیسے شاید اسی دروازے کے پیچھے آدمی سچی مسرت سے ہمنکار ہو سکتا ہے۔ دل نے کہا کیا اچھا ہوا اگر یہی دھاندلوں کی بستی ہو جہاں تمہیں پہنچنا ہے۔ مگر یہ گیارہ آر ڈی ہے اور مجھے بتایا گیا تھا کہ دھاندلوں کی بستی (یا اسلام آباد) چھ آر ڈی پر تھی۔

میں تھوڑا ہی آگے گیا ہوں گا کہ بائیں طرف آدموں کے باغ میں سے ایک کتاب مجھ پر بھونکتا ہوا جھپٹا۔ اس دفعہ میں فوراً سائیکل سے اتر آیا اور کتاب دبا کر ساتھ میں ایک جھاڑی میں جا کر پیشاب کرنے لگا۔ میں پھر سائیکل پر سوار ہونے ہی لگا تھا کہ پڑی کے کنارے پر بیٹھا ہوا چودہ سالہ لڑکا جو عمر کے مقابلے میں بڑا معلوم ہوتا تھا اور جس کے ہاتھوں میں دو تین کتابیں تھیں، جن پر کپڑے کی

جلدیں تھیں وہ اٹھ کر میری طرف بڑھا۔

”آپ ضلع دار صاحب کے دوست ہیں۔“ اس نے بہاولپوری میں کچھ شرمیلی ہچکچاہٹ سے پوچھا۔ میرے یہ کہنے پر کہ میں ہی ضلع دار صاحب کا دوست ہوں اس نے مجھے بتایا کہ یہی اسلام آباد کی بستی تھی۔ اور یہ کہ وہ ڈھائی بجے سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔ میرے دوست نے ان کو میرے آنے کی اطلاع پڑتال پر سے بھجوا دی تھی مگر اس نے غالباً ان کو اس وقت کا اندازہ نہیں ہونے دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچ سکوں گا۔ اس لڑکے نے سائیکل میرے ہاتھ سے لے لی (میرے کمزور احتجاج کے باوجود) اس کے دائیں ہاتھ میں کتابیں تھیں اور بائیں طرف سائیکل اور ظاہراً اسے سائیکل کو قابو میں رکھنے کے لیے دقت ہو رہی تھی۔

”سائیکل مجھے دے دو۔“ میں نے کہا۔

”چھوڑ دو سائیں“ اس نے مسکرا کر کہا۔ خوش اخلاقی سے، دکشی سے اور مضبوطی سے۔

”اپنی کتابیں مجھے دے دو“ میں نے کہا۔

وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوا کہ ان کا مہمان کتابیں اٹھائے۔ مگر میں نے اسے یہ بتایا کہ میں اس کی کتابوں کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا پڑھتا ہے۔ یہ اسے عجیب درخواست معلوم ہوئی اور اس نے کچھ پیس و پیش کے بعد کتابیں مجھے دے دیں۔ یہ کپڑے کی جلد کی بوسیدہ رجسٹر نما کتابیں تھیں۔ ہم اب پڑی سے اتر کر ایک گِلڈنڈی پر سے سامنے مکانوں کی طرف چل رہے تھے۔

”ضلع دار صاحب ابھی نہیں آئے۔“ میں نے پوچھا۔

”ابھی نہیں“ اس نے ریاستی میں کہا۔ ”سائیں نے پڑتال پر سے پیغام بھیجا کہ آپ (ستان) آؤ گے۔ انہوں نے شاید غلطی سے آپ کو چھ آڑی بتا دیا تھا۔ یہ گیارہ آڑی تھا۔ میں اسی لیے نہر پر آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ کہیں آ گے ہی نہ چلے جائیں۔“

”ہاں“ میں نے کہا۔ ”اگر تم نہ کھڑے ہوتے تو میں ضرور آ گے چلا جاتا۔ تم کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔“

اس کے لبوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے واقعی انتظار کرنا پڑا تھا۔ مگر اس نے کہا۔ ”نہیں“ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم ویسے ہی دوپہر کے وقت باغ میں بیٹھ کر سبق یاد کرتے ہیں۔“

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مولوی فقیر اللہ صاحب کے طالب علموں میں سے ہے اسے یہاں ایک سال ہو چکا تھا اور وہ عربی کی نحو ختم کر چکا تھا۔ مگر صرف ابھی آدمی ہی ہوئی تھی۔

”کیا تم مسافر طالب علموں میں سے ہو؟“

”ہاں میرا گاؤں فیروزہ ہے۔“

”کتنے مسافر طالب علم یہاں پڑھتے ہیں؟“

”کل تیس مسافر طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں لیکن اس وقت مدرسہ میں پندرہ سولہ سے زیادہ نہیں۔ باقی محرم کی چھٹیوں پر اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔“

اس نے مجھے بتایا کہ یہ مسافر طالب علم اکثر تو نزدیک کے گوشوں کے رہنے والے تھے مگر ان میں تین چار مظفر آباد کے تھے، دو تحصیل علم کی خاطر کوہاٹ سے آئے تھے۔ مولوی فقیر اللہ ہی ان کے کھانے کا خرچہ برداشت کرتے تھے۔ کتابیں انہیں جامع سے مفت مہیا کی جاتی تھیں۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کراچی میں رہتا ہوں اور اب چند دنوں کے لیے اپنے دوست ضلع دار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں کراچی میں ملازم ہوں۔ اور میں نے جواب دیا کہ میں ایک کمپنی میں ملازم ہوں۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ کمپنی کیا ہوتی ہے اور وہ کچھ حیران نظر آنے لگا۔ پھر اس کی ذہین آنکھوں میں ایک عرفان کی روشنی نظر آئی۔ شاید اس نے میری کمپنی کو ایک سرکس یا کھیل تماشے کی کمپنی سمجھا تھا لیکن اس نے وضاحت نہیں چاہی۔ وہ اس خاکی پتلون اور سبز سوٹر والے دبلے پتلے پر اسرار اجنبی سے جو کراچی میں رہتا تھا۔ مگر وہ غالباً ایک نووارد مہمان پر اپنے آپ کو زیادہ ٹھونسنے سے شرماتا تھا۔ میں خود اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن عرصہ ہوا گفتگو کا تحفہ قدرتوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کچھ بے آسودگی کچھ خوف محسوس کرتا ہوں۔ شرمیلے پن اور ڈر کی ایک موٹی آہنی دیوار ہمارے درمیان ہمیشہ حائل رہتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ایک بڑے شہر میں جہاں میں تنہا ٹھہرا ہوا تھا، میں نے پورا ایک ہفتہ کسی سے بات تک نہ کی تھی اور ڈرتے ڈرتے ہوئے کہ کہیں مجھ سے طاقت گویائی نہیں چھن گئی اور اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میں اس بڑے شہر کی ایک تنہا جگہ پر گیا اور وہاں ریت پر لیٹ کر سامنے لڑھکتے ہوئے نیلے سمندر سے ایک گھنٹہ باتیں کرتا رہا۔

ایک کچی چھوٹی دیوار میں جانے کا راستہ تھا اور اس میں سے ہم یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ احاطہ کوئی ہزار فٹ مربع تھا اور جا بجا بنیادیں نئے حجروں کے لیے کھودی جا رہی تھیں۔ سامنے ایک گلابی آسمان کے بالتقابل چھوٹی مسجد تھی۔ میرا کم عمر ساتھی مجھے دائیں طرف ایک کوٹھے کی طرف لے گیا۔ ہم اندر ایک بھکاری پھانک نما دروازے سے گزرے۔ مکان کی شکل کا تھا اس کے سامنے ایک کپا وسیع چبوترہ تھا اور چبوترے کے نیچے صحن میں جنگلی خود رو بوٹیاں اور کوڑھٹوں کی حکومت تھی۔ مکان میں دو کوٹھڑیاں

تھیں۔

میرے ساتھی نے اپنے ایک اور دوست کو آواز دی کہ ایک پلنگ نکال کر چبوترے پر بچھا دے۔ اس دوست کی عمر چھبیس سال کی ہوگی۔ اس کا چہرہ ملائم اور عالمانہ تھا اس کی داڑھی ریشمی بھوری رنگت کی تھی۔ اس کے سر کے بال ”چھتے دار“ تھے اور ریاستی رواج کے مطابق پیچھے سے گندھے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھڑی کے اندر سے ایک نوار کا پلنگ اٹھالایا اور اسے چبوترے پر میرے لیے بچھا دیا۔

”آرام فرمائیے“ اس نے ایک چونکا دینے والی خوش خلقی سے کہا۔ یہاں طالب علموں کو حدیث اور فقہ صرف و نحو کے علاوہ پرانی عرب خوش اخلاقی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

مجھے پلنگ پر بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازے میں سے ایک شخص اندر داخل ہوا۔

ایک شخص جو یہاں کے زمینداروں کا عام لباس ایک ڈھیلا کرتہ اور چادر پہنے ہوئے تھا جو مضبوط گٹھے ہوئے اعضاء کا تھا۔ سب دیندار آدمیوں کی طرح اس کا پیٹ پالا پوسا ہوا اور گول مثول تھا۔ مگر یہ پیٹ اس آدمی کا حصہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ جسمانی ساخت میں وہ مجھے آلیور ٹوسٹ کی اس مشہور تصویر میں جہاں آلیور سبھے ہوئے سکول ماسٹر سے یہ کہہ رہا ہے ’تھوڑا اور شور بہ سکول ماسٹر مسٹر کی یاد دلاتا تھا۔ اس کا چہرہ فراخ تھا جس سے ایک کھیتوں کے آدمی کی سادگی ایک جبلی ملائمت اور ایک قدرتی محبت کا پتہ ملتا تھا۔ ایک ہلکی سیاہ داڑھی اس کے گول چاند سے منہ کو ایک سیاہ ہالے کی طرح گھیرے ہوئے تھی۔ ہونٹ موٹے اور حساس تھے آنکھیں روشن اور ذہین اور میرے لیے خوش آمدید سے لبریز۔ اس کا چہرہ ایک بہت ذہین اور انٹلیکچوئل آدمی کا چہرہ تھا۔ مگر اس میں کثافت یا مذہبی جنوں کا شائبہ تک نہ تھا۔ روحانی اطمینان اور سکون اس کی پیشانی پر دلیر حروف میں رقم تھے اور موٹے ہونٹوں کی حساسیت بتاتی تھی کہ اسے خدا کی اچھی چیزوں سے خط اٹھانے سے بھی عار نہیں اور یہ کہ ان نعمتوں کے لیے اس کے دل میں ماسوا شکر کے اور کچھ نہیں۔

یہ شخص مولوی فقیر اللہ تھا۔ اس مدرسہ کا بانی، پرنسپل، اس کے اخراجات کا واحد کفیل، اس کا جسم بڑا تھا اور اسی طرح اس کا دل بھی بڑا تھا۔

اس نے گرم جوشی سے اور سرور آنکھوں سے یہاں کے رواج کے مطابق میرے ہاتھ کو دو ہاتھوں میں لے کر مصافحہ کیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا، اس کے طالب علم اندر سے اس کے لیے ایک اور چار پائی لے آئے اور مولوی فقیر اللہ اس کے درمیان میں آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ اس کے شاگرد بھی مولوی صاحب کے ساتھ چار پائی پر بیٹھ گئے۔ وہ مولوی فقیر اللہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس سے ایسا ہی ڈرتے تھے۔ جیسا کہ کوئی سخت استاد سے ہی ڈر سکتا ہے اس کے باوجود مولوی فقیر اللہ کے مدرسہ میں جمہوریت

تھی۔ استاد شاگرد آخرا ایک کنبہ ہی تو تھے۔ آپس میں علم و محبت کے مضبوط رشتے سے منسلک۔

اس نے مجھ سے خوش خلقی سے خیریت پوچھی۔ وہ بالکل خالص ریاستی معلوم نہ ہوتا تھا اور عجیب طور سے اس کے کئی الفاظ اور لب و لہجہ گجرات اور جھنگ کی یاد دلاتے تھے۔ اس نے مجھ سے میرے پیشے وغیرہ کے متعلق پوچھا۔ میں نے ہنکپاتے ہوئے اس سے اس کے درس کے بارے میں چند سوالات پوچھے۔ وہ ایک بے حد کسرتس آدمی تھا اور جتنی بھی باتیں اس نے کیں اس میں غرور اور شہنی کا نام نہ تھا۔ اپنی اس گفتگو کے دوران میں اس نے مجھ پر یہ جتانے کی مطلق کوشش نہ کی کہ وہ ہی اس درس کے کلی اخراجات کا کفیل ہے۔ (یہ اخراجات میں نے اور میرے دوست نے بعد میں تخمینہ لگایا، تین سو پچاس روپے سے کسی طرح کم نہ تھے)

اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس کے درس میں پختہ طالب علم تعلیم پا رہے تھے۔ نصاب وہی تھا جو دیوبند خیر المدارس ملتان کا تھا۔ ایک دو سال سے طالب علموں کے باقاعدہ امتحان لیے جا رہے تھے۔ پورا کورس تو دس سال کا تھا مگر بیشتر طالب علم پانچ چھ سال کے بعد چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ پچھلے سال تک یہ مدرسہ حکومت کا منظور شدہ نہ تھا مگر اب اسے باقاعدہ منظور کر لیا گیا تھا اور اس کے طالب علم اعلیٰ سندوں کے لیے جامع عباسیہ بہاولپور اور مدرسہ خیر المدارس ملتان میں داخل ہو سکتے تھے۔

گورنمنٹ نے اس وقت تک کوئی گرانٹ نہ دی تھی اور یہ مدرسہ زمین کی آمدنی اور ادھر ادھر کے چندوں سے جو مقامی معززین دیتے تھے چل رہا تھا۔ چندہ اکٹھا کرنا بھی سہل نہ تھا۔ اس علاقے میں شیعہ سنی کا جھگڑا تھا اور یہاں متمول حضرات کی غالب اکثریت شیعہ ہونے کی وجہ سے مولوی فقیر اللہ کے مدرسہ کو اعانت دینے سے جھینپتی تھی (مولوی فقیر اللہ کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کا تھا) پہلے تو وہ اکیلے ہی سارا کام خود کرتا تھا لیکن اب اسکے پاس ایک مددگار بھی تھا، مولوی رسول بخش۔ وہ بھی اسی کا شاگرد ہی تھا۔ اور اس سے چھ سات سال درس و تدریس کے بعد وہ جامعہ عباسیہ بہاولپور میں چلا گیا تھا جہاں سے اس نے علامہ کی سند حاصل کی تھی۔ مولوی رسول بخش نے اب اس کا بوجھ کچھ ہلکا کر دیا تھا۔

پاس کی مسجد سے شام کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔ آواز ایک لڑکے کی تھی۔ یہ مولوی فقیر اللہ کا اپنا طالب علم تھا جو نماز پڑھنے والوں کو نماز کے لیے بلارہا تھا۔ مولوی فقیر اللہ نے نماز کے لیے اجازت چاہی وہ اور اس کے شاگرد چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میرے ضمیر نے ایک ہلکی سی ملامت کی، کب تک! کب تک تم خدا سے بھاگتے رہو گے؟ مگر میں پلنگ پر بیٹھا رہا۔ خدا کی محبت کی مزاحمت کرتا رہا۔ افسوس! افسوس! میں ایک کلبی اور ملحد بن گیا تھا، خدا کا دھنکارا ہوا، روند اہوا۔ مگر اس کی رحمت کے پٹ کھلے تھے اور میں اب بھی اس کے قدموں میں جا سکتا ہوں۔ اب بھی اس کے عفو کی بھیک مانگ سکتا ہوں۔ وہ وقت شاید ابھی نہ آیا تھا۔

میں مسٹر ہلیئر بیلک کو پڑھنے لگا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ سیانا اور خوش مذاق انگریزی مصنف مجھے یہ بتا سکتا کہ رابسبری (Robesbberie) بظاہر اس قدر معمولی اور منفی طور پر غیر موثر سردار ہونے کے باوجود کس طرح فرانسیسی انقلاب کا پہلا لیڈر بن گیا، میرا دوست مولوی فقیر اللہ کی معیت میں میرے سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس کی آمد پر کتنا آسودہ اور مسرور محسوس کیا۔ ایک بوجھ میرے کندھوں پر سے اٹھ گیا۔ گفتگو میرے لیے ایک کوشش ہے۔ ایک افیت ہے۔ اب میں بغیر کسی پریشانی یا الجھن کے منہ میں گھنٹکیاں ڈال کر بیٹھ سکتا تھا۔ اور گفتگو کی ذمہ داری کلہم اپنے دوست پر ڈال سکتا تھا۔ میرا دوست شاید دنیا کا بہترین ”اندوز“ گفتگو کرنے والا ہے۔ اگرچہ باہر وہ خاموشی کے لمبے طویل وقفوں کا قائل ہے۔ ہم اندھیرا پڑتے تک بیٹھے مولوی فقیر اللہ کے مدرسے اور زمینوں کی باتیں کرتے رہے اور کچھ وقت کے بعد جب مولوی فقیر اللہ کسی کام کے لیے چلا گیا تو میرا دوست مجھے مکان سے باہر یونیورسٹی کے احاطے میں لے آیا۔

یہ ایک وسیع رات تھی۔ محرم کی تیسری کا چاند ایک زریں درانقی کی طرح تاریک مغل آسمان میں معلق تھا۔ اس کی دھار کی زد میں ایک سفید، چنچل ستارہ مسکرا رہا تھا۔ مولوی فقیر اللہ کا غریبانہ کوٹھا، مسجد ارد گرد طالب علموں کے حجرے، مدھم اور پراسرار کھیتوں کی وسعت میں ایک نیلے جھپٹے کا لحاف اوڑھے خاموش پڑے تھے۔ ہم چلتے ہوئے احاطے کی کچی چھوٹی دیوار کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اس سحر زدہ وقت میں ایک مویشی کے گلے کی گھنٹی کی ٹن ٹن کی آواز آئی دو کھیتوں سے۔

میرے دوست نے کہا۔ ”تم جانتے ہو دنیا کی سب سے اچھی اور خوبصورت آواز کون سی ہے؟“

”کون سی؟“ میں نے پوچھا، بالکل معصوم بن کر، اگرچہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے لگا ہے۔ میں اس کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”یہ مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔ یہ دراصل جھپٹے کا راگ ہے۔ جب نہ ہی اندھیرا ہو اور نہ ہی روشنی۔ اس وقت اس آواز

میں بڑی کشش ہوتی ہے۔“

ہم کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک میرے دوست نے جو کچھ سوچ رہا تھا۔ مجھے کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا اور بڑے جوش سے کہنے لگا۔ ”تم نے بڑی بڑی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں۔ جہاں جا کر ہمارے لڑکے والدین کے ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں جہاں پروفیسر بے فائدہ مضامین پر خشک لٹے ہوئے لیکچر دینے کے عوض ہزار روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ ہم زندگی کے چودہ پندرہ سال انگریزی زبان کے سیکھنے میں ضائع کرتے ہیں مگر کیا ہم واقعی انگریزی سیکھتے ہیں؟“

ہم میں سے کتنے بی اے پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب یا شاعری کی کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قسم کی

انگریزی ہم سیکھتے ہیں۔ تم جانتے ہو یہ یونیورسٹی جس میں اب تم کھڑے ہو ایک مختلف قسم کی یونیورسٹی ہے۔ اسی قسم کی یونیورسٹیوں میں ہمارے آباء و اجداد نے تعلیم کی روشنی پائی تھی اور فارسی اور عربی زبانوں میں قابلیت اور دسترس حاصل کی تھی۔ تمہارے دادا نے آخر قصیدہ بردہ شریف کی عربی میں شرح لکھی ہے اور فارسی زبان میں کتنی نظمیں لکھی ہیں۔ بے شک ہمارے نزدیک جو کچھ پرانے طرز کے متروک لوگ تھے جن میں اب ہم سوسائٹیکلڈ نو جوانوں کو تضحیک کے پہلو نظر آتے ہیں مگر وہ دراصل کیریئر کے لوگ تھے۔ اور ہماری یونیورسٹیوں کے گھرے ہوئے چھپھورے کھوکھلے نو جوانوں کی طرح نہیں تھے جن کی رگوں میں خون کی بجائے پانی ہے۔ اور پھر ادب ادب ہے خواہ وہ انگریزی ادب ہو یا عربی ادب یا فارسی ادب ادب کا شوق اور مطالعہ ہمیشہ صحیح انسانیت پیدا کرتا ہے۔ اور ادب کا طالب علم خواہ وہ لندن میں ہو یا اسلام آباد میں کبھی کوئی کمینہ یا رذیل کام نہیں کر سکتا۔ اب اس شخص مولوی فقیر اللہ کو دیکھو وہ ذیلداری کی خاطر افسران بالا کے پیچھے نہیں بھاگا پھر تانہ ہی سر بیچ بننے کی خواہش میں پنچایت آفیسر کو دو سو روپیہ نذرانہ دینے کی فکر میں ہے۔ اس کی تھوڑی بہت زمین ہے جس کی آمدنی وہ کلہم اس درس پر صرف کرتا ہے۔ اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں۔ وہ شیخی نہیں بگھارتا کہ اس نے دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ خاموشی سے دیانت سے اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی دیکھو۔ اس کی امید اس کا حوصلہ اس کی ہمت اس کے اپنے درس کے لیے اس سے بھی زیادہ بلند ارادے ہیں۔ روپے کی قلت کے باوجود وہ اس یونیورسٹی کی وسعت کے متعلق سوچ رہا ہے۔ اس سارے احاطے میں طالب علموں کے لیے حجرے بنوا رہا ہے۔ جوں جوں روپیہ آتا ہے عمارت پر صرف کرتا جاتا ہے۔ اس علاقے میں ہزار میں بمشکل ایک آدمی پڑھا لکھا ہوگا۔ ایسے گناہ گاؤں میں شہروں سے دور جہالت اور توہمات کے اس گہوارے میں ایسا درس قائم کرنا اور اپنی ساری پونجی اس پر لگا دینا یقیناً ایک عظیم آدمی کا کام ہے۔ یہاں کے پڑھے ہوئے طالب علم اپنے گاؤں میں جا کر علم کا دریا روشن کریں گے۔ غالباً تم کچھ اور سوچ رہے ہو۔ تم سن تو رہے ہو کہ انہوں نے کیش اور بارن کو نہیں پڑھا۔ انہوں نے کارل مارکس کا نام نہیں سنا اور وہ بڑی اشتراکی بغاوت سے بیگانہ ہیں۔“

عجیب طور سے میں یہی سوچ رہا تھا۔

اتنے میں مولوی فقیر اللہ بھی وہاں آ گیا اور ہمیں یونیورسٹی کی توسیع کے متعلق اپنی سکیم اور ارادے بتانے لگا۔ ”ایسے ہی لوگ ہیں“ میں نے سوچا ”جو اخلاقی خلوص اور بے غرضی سے عملی کام کرتے ہوئے وہ طوفان نہیں لائیں گے مگر طوفان کو طاقت اور تندہی بخشنے والے انہی کے مضبوط شانے اور ہاتھ ہوں گے اور وہ کس قدر پرسکون اور محفوظ معلوم ہوتا تھا جس طرح اس کے کام کرنے کے لیے ساری ابدیت پڑی ہو۔ بیسویں صدی کی غلبت بخارزدہ ذہنی بے سکونی کی کیفیت اسے چھوٹک نہ گئی تھی۔“

”انشاء اللہ خدا کی مرضی ہوئی تو رفتہ رفتہ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کی دھیمی سبکی آواز میں ایک اتھاہ صبر، تحمل اور توکل تھا۔

اس نے بتایا کہ نئے حجرے آہستہ آہستہ بن رہے ہیں جس وقت فصل سے کچھ روپیہ آتا ہے اس کا کچھ حصہ اس کام پر لگا دیا جاتا ہے اور بہت سے طالب علم خود تعمیر کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ اس وقت آمدنی کے مطابق تیس سے زیادہ مسافر طالب علموں کی گنجائش نہ تھی پھر بھی وہ کسی علم کے بھکاری کو اپنے دروازے سے مایوس نہیں لوٹاتا تھا۔

میں نے پوچھا ”کیا طالب علموں کے پڑھائی کے اوقات مقرر ہیں؟“

اس نے کہا ”ہم گھڑی کے ساتھ وقت کی پابندی تو نہیں کرتے۔ ہاں صبح کی نماز کے بعد ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اندازاً بارہ سے ڈیڑھ دو تک چھٹی ہوتی ہے۔ جس کے بعد پھر پانچ بجے تک تدریس ہوتی ہے۔“

”طالب علم فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”فارغ وقت ان کے پاس بچتا ہی نہیں۔ شام کے کھانے اور عشاء کی نماز کے بعد وہ دس سے تین بجے رات تک مطالعہ کرتے اور اپنے سبق ذہن نشین کرتے ہیں۔“

میرے دوست اور میں نے اس پر احتجاج کیا۔

”صرف تین گھنٹے نیند! یہ تو بالکل ناکافی ہے۔ آپ کم از کم ان کے لیے چھ سات گھنٹے نیند ضرور وقف کیجئے۔“

”ہاں ان کے لیے کافی ہوتی ہے۔“

مولوی فقیر اللہ اپنے انضباط کی سختی میں نرمی پیدا کرنے کا روادار نہ تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک معقول آدمی کے لیے چار ساڑھے چار گھنٹے نیند کافی ہوتی ہے۔ ”دراصل عربی صرف و نحو بے حد محنت اور حافظے کا کام ہے۔ علم جان جو کھوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم نے خود اپنے زمانہ طالب علمی میں ایسا ہی کیا ہے۔“

میرے دوست نے مولوی فقیر اللہ کو سمجھایا کہ زیادہ نیند سے لڑکے صبح کے وقت تازہ دم انھیں گے اور کام کے وقت بہتر کام کر سکیں گے۔ اس صورت میں وہ اپنا سبق بھی جلد یاد کر سکتے ہیں۔ مولوی فقیر اللہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں اپنے قواعد کو کچھ ڈھیل دینے کے بارے میں کچھ سوچے گا۔ میرے دوست میں لوگوں کو اپنے نظریہ پر پھسلا کر لے آنے کی طاقت بدرجہ اتم ہے۔

ہم واپس آئے چار پائیاں اب اندر کوٹھڑی میں بچھا دی گئی تھیں اور ایک بچھڑی داڑھی والا لکڑا طالب علم ایک طاقے میں رکھے ہوئے دیئے کو روشن کر رہا تھا۔

”یہ محمد بخش میرا خاص شاگرد ہے۔“ مولوی فقیر اللہ نے کہا۔ ”یہ مجھے بڑا پیارا ہے۔ یہ ہر ایک کی خدمت کرتا ہے۔ یہ میرے درس کا خادم ہے۔“

ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دوسرا مدرس مولوی غلام رسول آ گیا۔ وہ پاس کے ایک گاؤں اللہ آباد میں (جو اتفاق سے وہ جگہ ہے جہاں میں نے پہلے پہل اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں) کسی کام کے لیے گھوڑی پر گیا ہوا تھا۔ اس نے باری باری خوش اخلاقی سے ہماری خیریت پوچھی۔ دو ہاتھوں سے مصافحہ کر کے وہ اپنا ایک ہاتھ سینے پر لے جاتا اور پھر کہتا۔ ”خیریت سے ہیں؟ الحمد للہ خدا کا شکر ہے۔“ یہ جتنے تلے جملے شاید کسی حدیث کے حوالے سے تھے جس میں سچے مسلمان کو وہ آداب سکھائے گئے تھے جو ایک مہمان کی خیریت پوچھتے وقت بروئے کار لائے جائیں۔ اس کا خیریت پوچھنے کا مبالغہ آمیز انداز دلکش تھا اور پر خلوص اور مہمان کو ایک گونا مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا کہ دنیا میں کم از کم ایسا شخص ہے جسے اس کی روحانی اور جسمانی صحت کے بارے میں اس قدر دلچسپی اور تردد ہے۔ یہ ایک آرٹ ہے جو بد قسمتی سے مہذب دنیا میں ناپید ہے۔

مولوی غلام رسول، مولوی فقیر اللہ کا پرانا شاگرد اور اب اس کا دست راست، ایک دھیمی طبیعت اور چھریرے بدن کا شخص تھا۔ اپنی پگڑی اور واسکٹ میں وہ مغل شہنشاہوں کی تصویروں کی یاد دلاتا تھا اور اس وقت کے ایرانی مصوروں کے لیے ہمایوں یا شاہجہاں کے ماڈل کا کام دے سکتا تھا۔ یہ مشابہت اس وقت بے حد نمایاں ہوتی جب اسے سائڈ سے دیکھا جاتا۔

تیسری چار پائی پر لنگڑا محمد بخش اور دوسرے تین طالب علم بیٹھے دیئے کی پہلی مدھم لومیں اپنی زرد دیائے ہوئے ورقوں والی کتابوں کو آنکھوں سے لگائے اپنے سبق یاد کر رہے تھے۔ دراصل یہ ان کی کوٹھڑی تھی جہاں ہم نے تصرف آجایا تھا۔

میرے دوست نے ان سے باتیں کرنا شروع کیں۔ وہ تندرست چمکیلے لڑکوں کی طرح کوئی تفریح تو چاہتے ہی تھے وہ اس انٹرویو کے لیے ایک قطار میں چار پائی پر سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ میں وہ گفتگو جہاں تک مجھے یاد ہے یہاں درج کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ پیارے پڑھنے والے! تم کو یہ اندازہ ہو سکے کہ کیسے طالب یہاں تحصیل علم کے لیے آتے ہیں اور یہاں آ کر وہ اپنی تعلیم اور یہاں کی زندگی کو کیسا پاتے ہیں۔

پہلا نمبر لنگڑے محمد بخش کا تھا۔ میرے دوست نے چار پائی پر لیٹے لیٹے اس سے سوال کیا۔ (یہ تمام گفتگو ریاستی زبان میں ہوتی رہی)

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”سائیں محمد بخش“ (محمد بخش اور اس کے ساتھیوں کی دہلی ہوئی ہنسی)

”کس جگہ بیٹھتے ہو؟“ (کہاں کے رہنے والے ہو؟)

”خان کوٹ سائیں“ (دہلی ہوئی ہنسی)

”آپ کا باپ کیا کام کرتا ہے محمد بخش!“

”سائیں کپڑے بتا ہے۔“

”اب آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟“

”پند نامہ“

”کتنا پڑھا ہے؟“

”چھ بیان پڑھ چکا ہوں۔“

ایک دوسرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ بیس سطریں روزانہ سبق لیتا ہے اور اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

”تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

چپ !!! (اس کے ساتھیوں کی دہلی ہوئی ہنسی۔ وہ اسے آہستہ سے کہنی مار کر اساتے ہیں)

”بتاؤ نا محمد بخش“

مولوی غلام رسول نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مسجد کا ملا بنے گا اور کیا؟“

محمد بخش کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس چکیلے لڑکے نے جو مجھے نہر سے لایا تھا اپنے ساتھی کی طرف شرارت دیکھ کر اس کی بجائے جواب دیا۔

”سائیں میں بتاؤں یہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا یہ دوکان کھولے گا۔“

”ہٹ چغلخوڑ، لنگڑے محمد بخش نے کہا۔“ دوکان نا دوکان! نہ سائیں میں دوکان نہ کھولوں گا۔“

”اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دوکان کرے گا۔“ چکیلے لڑکے نے کہا۔

میرا دوست بولا۔ ”بھئی محمد بخش! دوکان کھولنا کوئی بری بات تو نہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود ایک چھوٹی دوکان کھولنا چاہتا

ہوں۔ اچھا تم دوکان نہیں کھولو گے تو بتاؤ تم اور کیا کرنا چاہتے ہو۔“

لنگڑے محمد بخش نے کچھ تامل سے جواب دیا۔ ”سائیں میں پڑھتا رہوں گا۔“

اس پر اس کے ساتھی گھگھکیائے اور ہم سب ہنسے مگر میرے دوست نے کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کیا ہے کہ آدمی پڑھتا ہی رہے۔ علم ہی حاصل کرتا رہے۔ ساری عمر“

(میں نے اپنے متعلق سوچا) میں نے بھی ایسا ہی کرنے کی کوشش کی تھی مگر انجینئرنگ کے آخری سال میں دوبار فیل ہونے کے بعد میں نے ہمت ہار دی تھی اور تیسری بار پاس ہو کر فارغ التحصیل ہو گیا تھا)

”محمد بخش تم نے گاڑی دیکھی ہے۔“

”سائیں ایک دفعہ بچپن میں دیکھی تھی جب میں چھوٹا سا تھا۔“

”کیا تم اس پر چڑھے تھے۔“

”کوئے نا سائیں“

”اچھا یہ بتاؤ گاڑی کیسی ہوتی ہے اور کیسے چلتی ہے۔“

محمد بخش نے سوچ کر کہا۔ ”سائیں لال رنگ کی ہوتی ہے اور نیچے پہنچے ہوتے ہیں اور اندر غائب بیٹھنے کی جگہیں ہوتی ہیں آگے سائیاں ایک کا لادھوت اس کو کھینچتا ہے۔“

میں نے پوچھا لائسنس پر چلتی ہے مگر گرتی نہیں۔ آخر کیوں نہیں گرتی؟ اور عجیب بات ہے کہ اس لڑکے نے جس نے گاڑی غالباً اس وقت دیکھی تھی جب وہ چار پانچ سال کا ہوگا۔ مجھے اس کی ٹھیک وجہ بتادی۔

مولوی فقیر اللہ جو ہمارے تردد میں لگے ہوئے تھے اب آ کر اپنے شاگردوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے انہیں بتایا ان کا شاگرد محمد بخش کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ پڑھتا ہی رہے گا۔

مولوی فقیر اللہ بولے۔ ”محمد بخش کی میں آپ کو بات سناؤں۔ یہ چند جنداں پر انہری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ یہ میٹرک یا ایف اے وغیرہ ہو کر کہیں ماسٹری اور کلرکی کر کے اپنی روزی پیدا کرے گا۔ مگر محمد بخش نے انگریزی پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماسٹر نے سمجھایا اور پینا، اس کے باپ نے بہتیرا سراما مگر اس نے صاف جواب دے دیا کہ میں انگریزی نہیں پڑھوں گا۔ آخر جب انسپکٹر صاحب آئے تو اس کے باپ نے ان سے کہا کہ محمد بخش انگریزی نہیں پڑھتا اسے سمجھائیں وہ بھی بہتیرا زور مارتے رہے۔ آخر انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور فرمایا کہ آپ اس کو سمجھائیں کہ انگریزی پڑھنا گناہ نہیں اور اس میں کوئی ہرج

نہیں۔ انسپکٹر صاحب اور میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم کو انگریزی پڑھنے میں کیا اعتراض ہے۔“ یہ جواب دیتا ہے۔ ”سائیکس وجہ یہ ہے کہ انگریزی الٹی زبان ہے اور الٹی لکھی جاتی ہے اور خدا کی زبان سیدھی لکھی جاتی ہے اس لیے یہ شیطانی زبان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انگریزی میں لکھوں تو وہ نعوذ باللہ لکھا جائے گا۔“ انسپکٹر صاحب اور مجھ سے اس منطق کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے مجبور نہ کیا جائے جو اس کے جی میں آئے کرے۔ ایک روز یہ خود ہی میرے مکان پر ایک مسافر طالب علم کی حیثیت سے آکھڑا ہوا اور میرے پاس اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اسے واپس لوٹا دوں۔ محمد بخش اٹھو بھی چائے کا پانی گرم کرو۔“

اور یہ مدرسے کا لکڑا خادم جس کے چہرے پر ہمیشہ خوشی اور قناعت کی حلتماہٹ رہتی تھی۔ فوراً اپنے استاد کی تعمیل میں اٹھا۔ اس نے صحن میں سے لکڑیاں جمع کر کے چبوترے پر آگ جلائی۔ چائے بنانے میں دوسرے طالب علموں نے اس کی مدد کی اور ماسٹر غلام رسول اور خود مولوی فقیر اللہ نے بھی ہاتھ بٹایا۔ تم جان سکتے ہو وہ چائے جس کی تیاری میں اتنے آدمیوں کا دخل ہو اور محنت ہو کیسی چائے ہوگی۔ یہ وہ مہذب چائے نہ تھی جو پانچ منٹ میں تیار ہو جاتی ہے اور جن میں دودھ کی ایک بوند اور چینی کے دو چمچے ڈال کر حلق میں انڈیلا کیا جاتا ہے۔ یہ چائے دودھ میں پکائی گئی اور ابھی دیکھی آگ پر تھی کہ بورا کھانڈ اس میں چمچوں میں نہیں بلکہ میٹھوں میں ڈالی گئی۔ آدھ گھنٹہ اس کے پکنے میں لگا اور جب وہ تیار ہو گئی تو ماسٹر غلام رسول کیتلی کو اٹھا کر اندر لے آیا اور اسے چھوٹے چھوٹے شیشے کے گلاسوں میں ڈال کر ہمیں پیش کرنے لگا میں نے پانچ گلاس پیئے۔ یہ بے حد لذیذ تھی بے حد میٹھی اور الاپچی کی خوشبو نے اسے ایک ایسا مشروب بنا دیا تھا جو شاہزادوں کے پینے کے لائق ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ لوگ جو اپنے خیال میں اصلی چائے پیتے ہیں۔ اس دہقانی چائے پر برتری کے انداز میں نہیں گے۔ مگر میں ان کو بتا دوں کہ جہاں ان کی چائے ان کو بے خوابی اور جھنجھوڑے ہوئے اعصاب دیتی ہے۔ یہ چائے اپنے پینے والوں کو صحت دیتی ہے اور مگر مجھ کی سی نیند! کیسی لذیذ چائے تھی وہ اور وہ پیلو میں مدھم دکنے ہوئے بے تصنع مہمان نواز دہقان ان کی سادہ پر مذاق گفتگو تیسری کا چاند دروازے کے باہر ایک سفید خنجر کی طرح چمکتا ہوا۔ کیا آدمی کا دل اس سے بہتر اور کچھ اپنے مالک سے مانگ سکتا ہے۔

کھانے کے بعد جو پیتل کے بڑے تندرست چھنے میں مرغ کے سالن اور تنور کی روٹیوں پر مشتمل تھا۔ ہماری مولوی فقیر اللہ سے اس کی پچھلی زندگی اور مدرسے کے متعلق کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ لڑکا ہی تھا کہ تعلیم کے شوق میں گھر سے نکل گیا اور مختلف درس گاہوں میں پھر پھر کر تحصیل علم کرتا رہا۔ وہ پہلے ملتان شریف میں رہا۔ وہاں سے وہ سرہند شریف گیا اور وہاں سے

گجرات شریف۔ گجرات شریف کے مدرسہ الاسلامیہ میں وہ وہاں کے معلم حضرت مولانا ارشد علی تلمیذ میں آٹھ نو سال رہا۔ مولانا مولوی ارشد علی صاحب خدا کے برگزیدہ بندے تھے اور فقہ اور حدیث میں عالم قبحر تھے۔ ان کا وہ کھانا بھی خود ہی پکاتا اور ہر وقت ان کی خدمت میں رہتا۔ وہ بھی اسے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ رخصت کے وقت انہوں نے اسے دعا دی۔ ”جافقیر یا تیری زندگی خدا کی راہ میں وقف ہوگی۔“ وہ واپس اپنے آباء و اجداد کی دھاندوں والی بستی میں کوئی بارہ سال کے بعد لوٹا۔ یہاں سے اپنی بستی میں اپنی بیمار والدہ کا آخری دیدار نصیب ہوا۔ ان کی وفات کے بعد اس نے یہاں اس درس و تدریس کا کام شروع کر دیا جس کو جاری ہوئے اب پچیس برس ہو چکے تھے وہ تین بھائی ہیں ان کی مشترکہ زمین ایک سو پچاس بیگھے ہے جسے انہوں نے تقسیم نہیں کیا اور اس میں صرف سو بیگھے زمین ایسی ہے جو قابل کاشت ہے باقی کلر زمین ہے اور اسے پانی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اسے خود تو درس و تدریس اور عام مدرسے کے کام سے فرصت نہیں ملتی اس لیے چھوٹا بھائی زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی اسی مدرسہ میں طالب علم ہے۔ روپے کی سخت تنگی ہے اور خرچ اخراجات بمشکل جوڑ توڑ کر پورے کئے جاتے ہیں مگر انشاء اللہ خدا بہتر ہی کرے گا۔ یہاں دس سال کے طالب علم کو فقہ حدیث اور دینی تعلیم میں اتنا کچھ پڑھایا جاتا ہے کہ اور کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مدرسے نے پچھلے سال تین طالب علم تیار کر کے خیر المدارس ملتان شریف میں بھجوائے ہیں جو اگلے سال کامیاب ہو کر اور علامہ کی سند حاصل کرنے کے بعد یہاں تدریس میں ہاتھ بٹائیں گے پھر کام زیادہ باضابطہ ہو جائے گا۔“

میرے دوست نے پوچھا۔ ”مولوی صاحب! اسلامی قوانین کیا آپ کے خیال میں موجودہ زمانے میں کامیاب ہو سکیں گے؟“
مولوی فقیر اللہ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں! اللہ کے قوانین ہر زمانے اور ہر وقت کے لیے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔“
اس نے ہمیں بتایا کہ وہ مولوی مودودی صاحب کی جماعت اسلامی کا باقاعدہ رکن تو نہیں مگر ہاں جماعت اسلامی والوں کی مطمح نظر سے اسے کوئی اختلاف بھی نہیں۔ جماعت کا اخبار ”کوثر“ یہاں باقاعدہ آتا ہے اور جمعیت العلماء ہند کا اخبار ”المجمعیۃ“ بھی۔
مولوی فقیر اللہ مولانا ابوالکلام آزاد اور دیوبند کے مولوی حسین احمد مدنی کا نام ادب اور تعظیم سے لیتا تھا۔ اس نے کہا ”وہ دونوں عالم قبحر ہیں۔“

یہ ریاستی دہقان عالم جس کا عربی فقہ اور حدیث کا مطالعہ وسیع تھا جو مجسم طمانیت اور رضا تھا جو فولاد کے مجسمے کی طرح ٹھوس اور دن کی طرح ایماندار اور بے باک تھا۔ کچھ شرمیلے حلیمانہ انداز سے اور ریاستی لہجے میں بولی ہوئی اردو میں ہمارے سوالات کا جواب دے رہا تھا کھلی ہواؤں اور صالح خوراک کے بنے ہوئے مضبوط جسے والا یہ شخص بردباری تحمل خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا یہ پتلا۔ رسول عربی کا مذہب صرف ایسا ہی شخص دنیا میں پھیلا سکتا تھا۔ شاید پیارے پڑھنے والے! تم اسے مکمل طور پر سلجھا ہوا اور تربیت یافتہ

نہ سمجھو اور نہ ہی مہذب اور ماڈرن (یہ بھلا ہماری انگریزی یونیورسٹیوں میں پڑھے بغیر کیسے ہو سکتا ہے) میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک مکمل انسان تھا۔ اس نے مذہب کی سچی روح اپنے اندر تحلیل کر لی تھی اور اس کا دکھتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی روشنی کا پتہ دیتا تھا۔ وہ ایک مذہبی جنونی نہ تھا۔ ان آدمیوں میں سے نہیں جو خدا کا چغہ پہن کر اپنے ہم نفسوں پر حج بن بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب متعین کر دیتے ہیں۔ فسادات کے زمانے میں اس نے مضامین کے ایک ہندو گھرانے کو مدر سے میں پناہ دی تھی اور غصیلے مجمع سے ان کی جان بچائی تھی۔ مذہب میں جو حقیقی طور پر خوفناک اور شیطانی عنصر ہے وہ جنون کا ہے اور میری نظر میں ایک مذہبی دیوانے سے بڑھ کر قابل نفرت اور گھناؤنا شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم اسی جنون کی وجہ سے مذہب سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر یہی جنون ایک کریہہ تر شکل میں دوسرے ازموں میں ہم پر مسلط ہو رہا ہے۔ جنون آدمی کا سب سے ذلیل جبلی جذبہ ہے۔ یہ نفرت کی دیوی کو پیدا کرتا ہے۔ نفرت ہمیشہ تباہ کرتی ہے اور نفرت پر جو کچھ بنتا ہے زندہ رہنے والا نہیں ہوتا۔

اگلی صبح میرا دوست اور مولوی فقیر اللہ مجھے نہر کی پٹری تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ اسی چمکیلے لڑکے نے میرا سائیکل پکڑا ہوا تھا۔ پٹری پر پہنچ کر میرا دوست اور مولوی فقیر اللہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر میں کچھ دیر سائیکل پکڑے نیچے اس ”شکر یلا“ کو دیکھتا رہا۔ جو صبح کے امن میں کھیتوں کے درمیان پڑا تھا اور جہاں سے ایک نیلا دھواں بل کھاتا ہوا اوپر اٹھ رہا تھا۔ یہ صرف دہقان کا ایک معمولی غریبانہ مکان نہ تھا بلکہ علم کی روشنی کا ایک بڑا طاقتور روشن مینار تھا جس کی شعاعیں ارد گرد کی ظلمت کو دور کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ جب میں کچھ روپے پس انداز کر لوں گا تو ایک دن کراچی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں گا۔ میں میکلوڈ روڈ کے اس دفتر کی سیل منجھری کو خیر باد کہوں گا۔ میں اچھے پدرانہ میجر بیتھ کو اور اپنے کافی ہاؤس کے ذہین دوستوں اور نوجوان باہمت انقلاب پسند جرنلسٹوں کو خیر باد کہوں گا۔ میں بمبئی بازار میں اپنے متعفن فلیٹ کو جس کے دروازے کی تختی پر لکھا ہوا ہے۔ ”محمد خالد بی اے بی ایس سی (انجینئرنگ).....“ آخری دفعہ مقفل کروں گا اور گاڑی پکڑ کر اسلام آباد کے نزدیکی اسٹیشن پر اتروں گا۔ ایک طالب علمانہ سادہ لباس پہنے پیٹھ پر پکڑوں اور کتابوں کی ایک گٹھڑی لادے اور ہاتھ میں ایک موٹی سوئی پکڑے میں صبح کی نماز کے وقت اس پگڈنڈی پر چلتا ہوا لنگڑے محمد بخش کی طرح مولوی فقیر اللہ کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور جب وہ نیک آدمی باہر آئے گا تو میرے آنے کا مقصد پوچھے گا تو میں جواب دوں گا۔ ”میں مسافر طالب علم کی حیثیت سے درس میں داخل ہونے آیا ہوں۔“

اور لنگڑے محمد بخش کی طرح میں بھی ہمیشہ پڑھتا رہوں گا۔



معلوماتی قاعدہ (قدرے بڑے بچوں کے لیے)

(مصنف نے یہ قاعدہ لکھ کر ٹیکسٹ بک کمیٹی کو بھیج دیا تاکہ وہ اسے سکولوں کے لیے منظور کر لے۔ مگر کمیٹی کے صدر نے قاعدے کا مسودہ انسپکٹر جنرل پولیس کو بھیجوا دیا)

ہائیڈروجن بم

یہ سائنس کے حیرت ناک کرشموں کا زمانہ ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ ہمارے سائنس دان ہمیں کسی نئی ایجاد سے ششدر نہ کرتے ہوں۔ ان ایجادوں نے ہماری زندگی اور ہماری موت تک کو بھی از حد آسان اور خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان کا رآ مد ایجادوں میں سب سے اچھی اور سب سے مفید جو ایجاد ہے وہ ہائیڈروجن بم ہے۔ کہنے کو یہ محض ایک بم ہے لیکن دراصل یہ ہے بڑے کام کی چیز۔ ہم تو پہلے بھی سنتے تھے پھستا بم۔ ڈوڈل بم مگر ہائیڈروجن بم کی ایجاد کے بعد وہ کھلونے بن کر رہ گئے ہیں۔

بچو! یہ سب تسلیم کر چکے ہیں کہ اس کرے پر انسان کے لیے زندگی و بال ہو چکی ہے۔ اناج کی قلت کپڑے کی مہنگائی اور سیاسی لیڈروں نے ہمارا یہاں رہنا دو بھر کر دیا ہے۔ زندگی کے کام بے سود اور باسی ہو چکے ہیں اور ان کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ ویسے دنیا ہو بھی تو بہت پرانی چکی ہے۔ دس ارب سال یا دس کھرب سال۔ ابھی سائنس دان دنیا کی عمر کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کر سکے۔

اور اس وقت ہمیں جس ایجاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہائیڈروجن بم ہی ہے اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے (یہ محاورہ ہر بم کی ایجاد کے وقت کام آئے گا اس لیے اسے یاد کر لو) یہ تم جانتے ہو کہ دنیا کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ ہائیڈروجن بم کی مدد سے دنیا کے سیاسی لیڈر اس آبادی کو وقتاً فوقتاً گھٹانے اور مناسب حدود میں رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں اب دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی خطرے میں نہیں رہے گی۔ پرانے زمانے میں اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لیے دنیا پر قحط طاعون اور تارنازل کیا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے وقت مصر میں آٹھ طاعونیں یکے بعد دیگرے بھیجی گئی تھیں۔ شہر کے شہر خالی ہو گئے تھے۔ ان طاعونوں کے باوجود بھی مصر میں چند انسان باقی رہ گئے تھے۔ ہائیڈروجن بم مصر کی آٹھ طاعونوں سے زیادہ کارگر

ہے۔ اس کے موجودوں کا دعویٰ ہے کہ یہ بم جس شہر پر گرے گا وہاں انسان تو انسان طاعون تک کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ طاعون اور تاتاریوں کو شہر خالی کرنے اور آبادی گھٹانے کے کام میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ کام پھر بھی خاطر خواہ نہ ہوتا تھا اور ادھورا رہ جاتا تھا۔ آج کل رفتار کا زمانہ ہے ہم سالوں کا فاصلہ گھڑیوں میں طے کر رہے ہیں۔ آج کل ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ ہماری خواہش ہے کہ اگر ناشتہ اس جہاں میں کریں تو لُچ اگلے جہاں میں جا کھا لیں۔ ہائیڈروجن بم پل بھر میں بڑے سے بڑے شہر کو نیست و نابود کر دے گا۔ مجال ہے کوئی شخص جیتا رہ جائے سوائے (غالباً) سیاسی لیڈروں کے جو پہلے ہی اس شہر کو خالی کر کے کہیں اور مزے سے لُچ کھا رہے ہوں گے۔

چچا سام کے پاس ہائیڈروجن بموں کا بہت ذخیرہ ہے۔ چچا سام اس پر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ روس کے پاس بھی ہائیڈروجن بم کے ڈھیرے ہیں لیکن چچا سام کا گمان ہے کہ ان میں محض ہائیڈروجن بھری ہوگی۔ چچا اکثر کہتے سنے گئے ہیں کہ ہمارے ہائیڈروجن بم روسی ہائیڈروجن بموں سے کہیں بڑھیا اور قیمتی ہیں۔ اب ایک اور بم کو بالٹ بم سننے میں آ رہا ہے۔ اسے ارجنٹائن کے پریذیڈنٹ سیز پیروں خاص اپنی سرگردگی میں تیار کروا رہے ہیں۔ یہ اب تک تیار ہو چکا مگر وہ پروفیسر جن کے ذمہ یہ کام تھا جعلی ثابت ہوا۔ وہ دراصل ایک کیمیا گر تھا اور سیز پیروں کو الو بناتا رہا تھا۔ کو بالٹ بم ہائیڈروجن بم سے دس گنا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس کے بعد نائٹروجن کی ایجاد کی باری ہوگی۔ جو کو بالٹ بم سے سو گنا زیادہ طاقتور ہوگا۔ بچو! اسی لیے اب ہمارا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ ہماری نجات اب یقینی ہے۔

نیا سال

آہا! ایلو نیا سال آ گیا۔ یہ سال نئی خوشیاں اور نئی امنگیں اپنے دامن میں لے کر آیا ہے۔ ہر نیا سال مبارک اور سعید ہوتا ہے اور ہر گزرا ہوا سال منحوس اور برا۔ ہر گز رہے ہوئے سال میں اتنے قتل و زلزلے اور قحط ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچا تک نہیں جا سکتا۔ تازہ ترین نئے سال کے آغاز کے شگون بڑے مبارک ثابت ہوئے ہیں۔ سال کے پہلے ہی ہفتے میں یہ خبر آ گئی کہ چند بغاوت پسند ہندو لُچیوں نے پانامہ کے صدر جو شے ریموں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا مرحوم چند معزز خواتین کے ہمراہ گھڑ دوڑ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ پریذیڈنٹ چنے جانے سے پہلے آپ پانامہ کی پولیس کے ہرڈ عزیز چیف تھے اور پولیس ہی کے بل بوتے پر پریذیڈنٹ بنے تھے۔ ہندو لُچیوں نے دھائیں دھائیں چھ سات فائر کئے اور کرنل صاحب کے علاوہ دو تین خواتین کو بھی ڈھیر کرنے کے بعد موٹر میں فرار ہو گئے۔ چچا سام کی رائے ہے کہ یہ کیونسٹوں کی کارروائی ہے اس لیے ہماری بھی یہی رائے ہے۔ ہم ان کے

اطاعت گزار بیعتیے جو ہوئے۔

ہر نئے سال کے پہلے روز لوگ نئے عہد اور نئے ارادے باندھتے ہیں۔ یہ ارادے اور عہد توڑنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔ بچو! تم نے بھی اپنے آپ سے ایسے ہی وعدے ضرور کئے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ تم آئندہ اپنا سکول کا کام اپنے بڑے بھائی سے کروانے کی بجائے خود کیا کرو گے کہ تم بڑے اچھے لڑکے بن جاؤ گے کہ تم ہمیشہ سچ بولا کرو گے خواہ تمہارا باپ مار مار کر تمہاری تھم اڑا دے وغیرہ وغیرہ۔

بچو! گھبراؤ نہیں اگر تم نے ان وعدوں میں سے ابھی تک ایک بھی پورا نہیں کیا۔ یہ وعدے کئے ہی اسی لیے جاتے ہیں تاکہ انہیں توڑا جائے۔

آؤ آج تمہیں ایک ایسے آدمی کی کہانی سنائیں جو طبعی طور پر بے حد کاہل ہے۔ ہر نئے سال کے شروع میں یہ آدمی صدق دل سے عہد کرتا ہے کہ وہ اب اپنی زندگی کا ایک نیا ورق الٹے گا۔ وہ علی الصبح اٹھا کرے گا اور چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹھلٹھا ٹھلٹھا باغ کو جایا کرے گا۔ وہ نسیم سحری سے اپنے کمزور پھپھڑوں کو پوری طرح بھرے گا اور ایک ایک پھول کے قریب ناک لے جا کر سونگھے گا۔ وہ خوش الحان پرندوں کی بولیاں سنے گا اور خود بھی ایک پرندے کی طرح سیٹیاں بجائے گا۔ وہ ایسا سعادت مند اور فرمانبردار لڑکا بن جائے گا کہ دوسرے لڑکوں کے والدین اپنے بیٹوں کے روبرو بطور مثال پیش کیا کریں گے۔ وہ سگریٹ بالکل نہیں پیئے گا اور اس کے دوستوں کی اسے سگریٹ پلانے کی کوششیں اس پر ذرا بھی اثر نہ کریں گی۔ وہ سال میں کم از کم ایک ناول، دس علمی مقالے اور پندرہ مختصر افسانے مکمل کرے گا (یہ آدمی اپنے آپ کو مصنف بھی سمجھتا ہے)

اب بچو! تم سچ مانو اس کاہل آدمی نے اپنا ایک عہد بھی تو پورا نہیں کیا۔ اس سال کی کوئی صبح نہیں دیکھی۔ وہ باغ میں ٹھلنے کے لیے بھی نہیں گیا۔ کیونکہ وہ چھڑی نہیں خرید سکا۔ اسکے والدین اس سے سخت نالاں ہیں اور اس کے روبرو دوسرے والدین کے بیٹوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ لکھنے کا یہ حال ہے کہ ناول کے پہلے دو صفحات کے علاوہ اس نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ حالانکہ ایڈیٹر اس کے دوست ہیں وہ اس کی ہر چیز چھاپ دیتے ہیں۔ یہ سست اور کاہل آدمی ہر روز ایک نہر کے کنارے دھوپ میں لیٹ کر لاتعداد سگریٹ پیتا ہے اور زندگی کے بیش قیمت لمحوں کو رائیگاں جانے دیتا ہے۔ اس آدمی سے سبق لو۔

امیر آدمی نئے سال کا استقبال بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتے ہیں۔ ان کی تصویریں ہمارے فیشن کے رسالوں میں چھپتی ہیں۔ ڈرنسٹ پہن کر یہ بڑے آدمی کسی شاندار ہوٹل میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں دوسرے امیر آدمیوں کی خوبصورت بیویوں کے

ساتھ ڈانس کرتے ہیں۔ بارہ بجے جب نئے سال کے پہلے دن کا ورود ہوتا ہے تو یہ دیکتی ہوئی سکاچ کے جام سے اسے پیئی نیو ایر کہتے ہیں۔ نئے سال کی آمد کو منانے کا اصل طریقہ یہی ہے۔ وہ ہزاروں لوگ جو سردی میں ٹھہرتے ہوئے فٹ پاتھوں کے پتھر پلے بستر پر نئے سال کا استقبال کرتے ہیں وہ نئے سال کی توہین کرتے ہیں اسی لیے نیا سال ان سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے دراصل نیا سال طلوع ہی نہیں ہوتا۔ بچو! ان کے لیے شاید یہ سال بھی طلوع نہیں ہوگا۔ تم کبھی غریب نہ بننا۔

ڈاکٹر

بچو! جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو فوراً ڈاکٹر کے ہاں بھاگے جاتے ہیں یا ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلواتے ہیں۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلوانا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکٹر کو اور بھی کئی کام ہوتے ہیں۔ اس کو بلانے کے لیے سواری بھی بھیجنا ضروری ہے ورنہ ڈاکٹر نہیں آئے گا۔ ایلو! ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔ وہ پہلے ہماری نبض ٹٹولتے ہیں پھر ہماری زبان نگلوا کر دیکھتے ہیں پھر اپنے سانس دیکھنے کے آلے سے ہمارے سینے کا معائنہ کرتے ہیں۔ ”ہونہہ“ کہہ کر وہ ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو اس وقت بلایا ہے جب کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے نسخہ لکھ دیتے ہیں۔ کچھ ہدایات دیتے ہیں۔ مثلاً مریض کو چند روں کے علاوہ کھانے کے لیے اور کچھ نہ دیا جائے۔ جب انہیں فیس دی جاتی ہے تو وہ قدرے حیرانی ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ انہیں اس تکلف کی توقع نہ تھی۔ لیکن وہ فیس چھوڑتے کسی صورت میں بھی نہیں۔

بچو! ہر ایک شخص ڈاکٹری کے کالج سے سند حاصل کر کے اپنا مطب کھول سکتا ہے۔ اس سند سے اسے لوگوں کا علاج کرنے کا پروانہ مل جاتا ہے۔ کوئی شخص ڈاکٹر کے علاج سے مر بھی جائے تو ڈاکٹر کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یورپ میں کئی ایک ایسے ڈاکٹروں کی مثالیں ہیں جنہوں نے کئی اچھے بھلے آدمیوں کو چپکے سے قتل کر دیا ہے لیکن ان کی بابت کوئی بھی نہیں جانتا۔

ایک بار کسی ڈاکٹر کے ہتھے چڑھ جاؤ تو پھر تمہاری آسانی سے خلاصی نہ ہوگی۔ ایسی صورت میں بچاؤ کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آدمی اس شہر سے چلا جائے جس میں وہ ڈاکٹر رہتا ہے۔ تمہیں کوئی معمولی شکایت ہے تم ایک ڈاکٹر کے پاس جاتے ہو وہ تمہارے جسم اور دماغ میں کئی اور عارضے دریافت کرے گا اور تمہیں یقین دلا دے گا کہ تمہارا اس وقت تک زندہ رہ جانا ایک معجزہ ہے۔ وہ ایک علاج تجویز کرے گا جو کافی لمبا چوڑا ہوگا۔ ڈاکٹر عموماً بھائی چارے سے مل جل کر کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تم ڈاکٹر گاما کے پاس زکام کے علاج کے لیے جا نکلتے ہو یہ تمہارے لیے بد قسمتی ہے۔ ڈاکٹر گاما تمہیں لٹا کر سٹیٹھو سکوپ سے تمہارے سینے کا معائنہ کرتا ہے اور اپنے سر کو تشویش سے ہلاتے ہوئے اپنی رائے دیتا ہے کہ تمہارے پھیپھڑے بالکل گل چکے ہیں اور ان کا فوراً ایکسرے ہونا چاہیے۔

اپنی فیس وصول کرنے کے بعد وہ تمہیں ایکسرے کے لیے اپنے دوست ڈاکٹر لیمڈا کے پاس بھیجتا ہے۔ ریڈیا لوجسٹ ڈاکٹر لیمڈا کے ایکسرے ہمیشہ صاف اور سپاٹ ہوتے تھے اس کی ایکسرے مشین خراب ہے اور اس کی چوکھٹا داڑھی ہمیشہ کسی نہ کسی طریقے سے مریض اور ایکسرے کے پلیٹ میں حائل ہو کر فوٹو کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر لیمڈا تمہارے پھیپھڑوں کا ایکسرے لیتا ہے جو دراصل اس کی داڑھی کا ایکسرے ہے۔ اچھی موٹی فیس لینے کے ڈاکٹر لیمڈا ایکسرے کی عکسی تصویر تمہارے حوالے کر دیتا ہے اور تمہیں ڈاکٹر تھیلا کے گھر کا پتا بتاتا ہے جو ایکسرے فوٹوں کو پڑھنے کا ماہر ہے۔ ڈاکٹر تھیلا تمہیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا تمہارے دونوں پھیپھڑے بیکار ہیں یا صرف ایک۔ تھیلا ایکسرے کے بغور دیکھنے کے بعد تمہیں منہ کھولنے کا حکم دیتا ہے اور اپنا سر ہلاتا ہے۔

”اپنے دانت فوراً نکلواؤ۔“ وہ کہتا ہے۔

تم احتجاج کرتے ہو کہ ایکسرے پھیپھڑے کا ہے دانتوں کا نہیں۔ مگر تھیلا پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ اپنی فیس لے کر وہ تمہیں ڈاکٹر گھینڈا کی طرف بھیجتا ہے۔ گھینڈا دندان ساز ہے وہ تمہیں فوراً کرسی پر بٹھا کر تمہارے دانت نکالنے شروع کر دیتا ہے۔ گھینڈا دس روپے فی دانت کے حساب سے دوسروں کی فیس وصول کرتا ہے تم قسم کھاتے ہو کہ تم پھر کبھی کسی ڈاکٹر کا منہ نہ دیکھو گے۔

دو ڈاکٹروں کی ایک مرض کی تشخیص ہمیشہ مختلف ہوتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کے نزدیک اگر تمہارا مرض ہسٹریا ہے تو دوسرا اسے ہائیڈرو فوبیا بتائے گا۔ نئی دواؤں کی ایجاد کے بعد دونوں ڈاکٹر کے نسخوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ہنسلین کے انجکشن ہسٹریا کے لیے بھی اتنے ہی مفید ہیں جتنے ہائیڈرو فوبیا کے لیے ہنسلین کی ایجاد کے بعد مرض کی تشخیص ایسی اہم نہیں رہی ہر ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کا بیری ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے ڈاکٹر کو میڈیسن کی الف بے بھی نہیں آتی۔

بچو! تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ یہ سچی بات کہ ڈاکٹر خود بھی بیمار پڑ جاتے ہیں اور تو اور میں نے دو تین ڈاکٹروں کو مرتے بھی دیکھا ہے۔ بیماری میں ڈاکٹروں جیسا بزدل کوئی ہوتا ہوگا۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنا علاج خود کبھی نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ دوسرے ڈاکٹروں سے کراتے ہیں۔ ایلو پیٹھ، ہومیو پیٹھ سے رجوع کرتے ہیں اور ہومیو پیٹھ سے۔ میرے ایک ڈاکٹر دوست کا قصہ سنو۔ ایک روز اسے معمولی ملیریا ہوا۔ اس کی حالت نہ پوچھو۔ اسے یقین تھا کہ وہ دو گھنٹی کا مہمان ہے۔ وہ مجھ سے بڑے درد بھرے لہجے میں بار بار کہتا، اب کیا بنے گا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو وصیت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سمجھا بجھا کر تھوڑی دیر اور انتظار کرنے پر راضی کر لیا۔ اس حالت میں اس نے کئی بار اللہ اور خدا کو یاد کیا۔ ویسے تو خدا کو یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ ڈاکٹر دہریہ ہونے کا دعوے دار تھا۔

بچو! بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے جو مریض کا معائنہ کرتے وقت اس سے باقاعدہ سانس لینے کی ورزشیں کراتے ہیں۔ مثلاً وہ ڈبل نمونیہ کے مریض کو کہیں گے سانس روک لو اب لمبا سانس لو اور لمبا اپنا دایاں بازو اوپر اٹھاؤ۔ اب بایاں اٹھاؤ اٹھ کر بیٹھو اور بیٹھے اپنے پاؤں کو چھوؤ۔ وہ مریض کی قوت برداشت آزمانے کے لیے اس کے پیٹ میں زور کا گھونسا سید کر کے اس سے پوچھیں گے۔ ”یہاں درد تو نہیں ہوتا۔“ ایسے ڈاکٹروں کو بار بار بلانا اچھا نہیں۔ میں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو مریض سے ورزش نہیں کراتا۔ وہ صرف اسے ننانوے تک گنتی کرانے سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

اب ڈاکٹروں کی ایک قسم اور بھی ہے ان کا دوا دارو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ مختلف علوم کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علم الہندسہ کے ڈاکٹر۔ علم وادب کے ڈاکٹر فلسفہ کے ڈاکٹر سیاسیات کے ڈاکٹر یہ لوگ ایک دو سال کسی یونیورسٹی میں بسر کر کے چار پانچ سو صفحے کا تھیس لکھتے ہیں جس کو ماسوا ایک دو بوڑھے پروفیسروں کے کوئی نہیں پڑھتا۔ ان پروفیسروں کی سفارش پر انہیں ڈاکٹری کی سند مل جاتی ہے۔ میرا ایک دوست علم وادب کا ڈاکٹر ہے۔ اس نے چند رگبت مور یہ کے زمانے میں شاعری کے ترقی پسند رجحانات پر ہزار صفحے کا تھیس لکھا تھا اس کے پروفیسر نے اس تھیس سے اپنی انگلیٹھی کو جلانے کا کام لیا اور میرے دوست کے لیے ڈاکٹری کی سند کی سفارش کر دی۔ یہ تھیس عربی زبان میں تھا۔ یہ ڈاکٹر بڑے بور ہوتے ہیں ان کے نظر آتے ہی اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک معزز خوش پوش نوجوان کو ایک دیوار پھاندتے دیکھا وہ ایک ڈاکٹر سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر ڈاکٹر بن جانے کے بعد بھی تھیس سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔

ہاں بچو! اب تم سوال کرو گے کہ یہ جو سلطان آف زنجبار ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں تو کیا انہوں نے زنجبار کی مچھلیوں اور ان کی گوتوں پر کوئی محققانہ مقالہ قلم بند کر کے کسی یونیورسٹی میں پیش کیا ہوگا۔ نہیں یہ سلطان آف زنجبار دوسرے کئی ملکوں کے سیاسی لیڈروں کی طرح اعزازی ڈاکٹر ہیں۔ پچھلے سے پچھلے سال یہ کانوں کے آپریشن کے لیے (آپ سنتے ہیں) چچا سام کے ملک میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کو ایسا موقع خدادے انہوں نے سلطان پر ڈاکٹری کی ڈگریاں نچھاور کرنے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اب آپ خدا کے فضل سے کم از کم آدھ درجن علوم کے ڈاکٹر ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے آپ علم وادب کے ڈاکٹر ہیں۔ میچگان یونیورسٹی کے سماجی قوانین کے ڈاکٹر اوناوا کے کیمسٹری کے ڈاکٹر ٹیکساس سے جنیات کے ڈاکٹر۔

بچو! قوم کے لیے ہر قسم کے ڈاکٹر ضروری ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دوسرے ملک ہمیں اجڈ اور غیر مہذب سمجھنے لگیں۔

بلے بلیوں کے بارے میں

آؤ پچو! تمہیں بے بلیوں کی باتیں سنائیں۔ بے بلیوں اور ہم انسانوں میں بہت سی عادتیں ایک سی ہیں۔ تم نے کئی ایک بے دیکھتے ہوں گے جن کی شکلیں اور زندگیاں بعض آدمیوں کی شکلوں اور زندگیوں سے بڑی مشابہ ہوتی ہیں۔ یہ بے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جائیں اور کپڑے پہن لیں تو ہو بہو انسان لگنے لگیں گے۔ اسی طرح اگر بعض انسان اپنے گھٹنوں کے بل پر اپنے بازو آگے ٹیک دیں تو ان میں اور بلیوں میں فرق بتانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن بے کو قدرت نے ایک ایسی شے دی ہے جو آج تک کسی انسان کو میسر نہیں آ سکی۔ وہ شے ہے بے کی صاف شفاف اور چمکیلی پشم۔ تم نے ضرور ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی جو پشم کے کوٹ پتلون پہن کر بلیوں کی ہمسری کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر وہ بات پیدا نہیں کر سکتیں۔

اس پشم کو دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے بے بہت کم نہاتے ہیں۔ زیادہ ہوا تو زبان سے اپنی پشم کو چاٹ لیا اور وہ پھر ویسی کی ویسی شفاف پانی میں بھیگنے سے بے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ بھیگی بلی کی مثل اسی سے تو بنی ہے۔ انسان بھی نہانے کے معاملے میں بلیوں سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ ہم بلا وجہ نہاتے اور منہ دھوتے ہیں۔ اگر ہم غسل نہ کیا کریں تو ہمارے جسم پر میل کی تہیں جم جاتی جائیں گی اور خوبصورت پشم بن جائیں گی پھر ہمیں کپڑوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ تم نے اپنے شہر کی گلیوں میں ایسے کئی آوارہ آدمی دیکھے ہوں گے جن کے جسم پر میل کی پشم چڑھی ہوتی ہے۔ وہ کپڑے نہیں پہنتے۔

افریقہ کے ایک زولو فلاسفر کا قول ہے کہ نہانا ایک فضول رواج ہے۔ تم خود دیکھو! ہمیں دنیا میں آنے اور یہاں سے رخصت ہونے پر دو غسل دیئے جاتے ہیں یہ بالکل بیکار ہیں۔ ان کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نہانے کی بات سچ میں آپڑی میں تمہیں بتا رہا تھا! بے بلیوں کے بارے میں۔ میری زندگی میں دو تین بے بلیاں آئے ہیں۔ آؤ تمہیں ان کی کہانیاں سنائیں تاکہ تم عبرت پکڑو اور تمہیں معلوم ہو کہ ان میں اور انسان میں کوئی خاص فرق نہیں۔

مجھے ایک بلی یاد آتی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ بلی ہمارے باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھ کر آگ پر رکھی ہوئی دودھ کی دہجی کی رکھوالی کیا کرتی تھی۔ یہ میری خالہ کی چہیتی تھی اور بالکل قابل اعتبار بلی تھی۔ عام بلیوں کی سی چنور پنے کی عادت اسے چھو تک نہ گئی تھی۔ یہ بلی اپنے روز کے چھپچھڑے اور رکابی میں چلو بھر دودھ پر شا کرتھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ دنیا کی واحد بلی تھی جو دودھ کی رکھوالی کرتی تھی۔ میں نے ایسی بردبار اور شریف نفس بلی کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی پشم برف کی طرح سپید تھی اور ابلتے ہوئے دودھ کی دہجی کے پاس اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھی ہوئی یہ ایک وضع دار سن رسیدہ خاتون کی مکمل تصویر نظر آتی تھی۔ میں نے ایسا وقار اور سکھڑا پاصر ف دو تین خواتین میں دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قدر نیکی اور شرافت اس کی عمر کی وجہ سے نہ تھی! وہ ضرور بلیوں کی کسی

شاہانہ اور عمدہ نسل سے تھی۔ اس میں امیرزادیوں اور شہزادیوں کی خوبو تھی وہ ایک پارسا حاجن تو ضرور لگتی تھی۔ لیکن میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے بارے میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اپنے الہڑپن کے زمانے بھی اس نے نوسو چوہے نہیں کھائے ہوں گے۔ چوہے اس نے کھائے ضرور ہوں گے، کون بلی اس کمزوری سے پاک ہے۔ مگر اس نے یہ کام اپنی خانہ داری کے فرض کے طور پر کیا تھا اور اب اپنے کئے پر سچے دل سے پشیمان تھی۔ وہ یقیناً ایک قابل مثال بلی تھی۔

اس بلی کے انجام کے متعلق مجھے کچھ یقین نہیں۔ میں بڑا ہوا تو میرا چھوٹا بھائی ایک دن کہیں سے ایک بلوگٹزا پکڑ لایا۔ اس کے دھڑ کا پچھلا حصہ اور ٹانگیں سیاہی ملگبی رنگ کے تھے اور سر اور گردن کا حصہ سفید۔ یہ بلوگٹزا آدمی تھا۔ ہم نے اس کا نام ٹام رکھا۔ ٹام جلد ہی سارے گھر کا لاڈلہ بن گیا۔ گھر میں ہر کوئی اسے گود میں اٹھا لیتا اور اسے چکارتا۔ اس بے جالاڈ پیار نے ٹام کی عادتوں کو بالکل بگاڑ دیا۔ ٹام میں ایک پیدائشی شکاری کی سی خصلت تھی اور ابھی یہ دو تین مہینے کا ہی تھا کہ یہ ہمارے صحن میں آگے ہوئے بڑے پیپل کے نیچے بیٹھ کر گھریوں اور چڑیوں کو لپچائی ہوئی نظروں سے تاکا کرتا اور اپنے پنجے تیز کرتا۔ ان دنوں میری والدہ کو مرغیاں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ جب چھوٹے ملائم چوزے اون کی گیندوں کی طرح اچھلتے اور پھدکتے ہوئے صحن میں پھرتے تو ٹام میری والدہ کے پیڑھے کے ساتھ دبک کر انہیں دلچسپی اور حسرت سے گھورا کرتا۔ میری والدہ کو یقین تھا کہ ٹام ایک اچھا بلا ہے اور گھر کے چوزوں کا رکھوالا ثابت ہو گا۔ ہم جو ٹام کے منہ میں خون کی مہک آتے دیکھتے تھے۔ اس کی بھگتی کے متعلق اتنے پر یقین نہ تھے۔ ہم نے پیش گوئی کی کہ ٹام کسی دن چوزوں پر چھپٹ جائے گا لیکن میری والدہ نے ہمیں ٹام کے بارے میں اس طرح سوچنے پر ڈانٹا۔ شروع شروع میں اس قدر ترغیب کے سامنے ٹام کے اس جبر اور صبر نے ہمیں واقعی حیران کر دیا اور ہم خیال کرنے لگے کہ شاید اس کی چوزوں میں دلچسپی ان کی رکھوالی کی وجہ سے ہے۔

آخر ہماری پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ میری والدہ باورچی خانے میں مصلے پر نماز پڑھ رہی تھیں۔ ٹام ان کے ساتھ حسب دستور دبکا بیٹھا تھا۔ ایک مرغی اپنے ننھے چوزوں کو لیے باورچی خانے میں آگئی۔ چوزے بار بار پھدکتے ہوئے ٹام کے سامنے سے گزرتے ان کے نزدیک ٹام جیسے تھا ہی نہیں۔ میں نے دیکھا کہ ٹام کی آنکھیں خونی ہو گئیں۔ وہ اپنی زبان کو باہر نکال کر ناک پر پھیرتا۔ وہ اپنے کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو وہ بالکل گرہ مسکین بن جاتا اور دوسری طرف دیکھنے لگتا جیسے کہ اسے چوزوں کوئی تعلق نہ ہو۔ اب ٹام کو لحاظ تھا تو صرف والدہ کا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ آخر ٹام سے نہ رہا گیا۔ یک لخت وہ ایک چھوٹے سے چوزے پر چھپنا جو پھدکتا ہوا بالکل ٹام کے ناک قریب آ گیا۔ ٹام اسے دبوج کر باہر

بھاگا۔ ہم سب اس کے پیچھے بھاگے اور اسے زخمی چوزے کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں نام کی اس ناشکر گزاری اور نذیرے پن پر بڑا غصہ آیا۔ ہم سب بھائی بہنوں نے عہد کیا کہ اب ہم نام کو بالکل منہ نہ لگائیں گے۔ ہم اس کی بگڑی ہوئی عادات کو سنوارنا چاہتے تھے۔ نام پر ہماری بے رخی کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے اب بلا دھڑک اور بے شرمی سے میری والدہ کے مرغی خانے کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے طور طریق بالکل خراب ہو گئے۔

آخر میرے چھوٹے بھائی اور میں نے اس پر ایک جرگہ بٹھایا۔ اس میں فیصلہ کیا کہ نام کو جھوٹ موٹ پھانسی کی سزا دی جائے۔ نام کے گلے میں پھندا ڈال کر اس کے دوسرے سرے کو پتیل کی ٹہنی سے باندھ دیا گیا مگر نام ہوا میں نہیں لٹک رہا تھا اس کی پچھلی ٹانگیں زمین پر تھیں۔ ہم نے ایک مرے ہوئے چوزے کو جسے ہم نے اسے چھوڑنے کے لیے مجبور کر دیا تھا، ملزم سے دو گز کے فاصلے پر رکھ دیا تاکہ نام کو روحانی سزا بھی ملے۔ گھر کے سب لوگوں نے اسے بے حد شرمندہ کیا اور میرے چھوٹے بھائی نے جس کا اصلی دوست وہ بلا تھا اس کا منہ کالا کر کے اسے آئینہ بھی دکھایا۔ اس سزا کے بعد بھی نام کی اصلاح نہ ہو سکی۔

جب ہم کو یقین ہو گیا کہ وہ قطعی خراب ہو گیا ہے تو ہم نے ایک دن اسے چند اونٹ والوں کے حوالے کر دیا۔ ہم نے انہیں پیسے دیئے اور انہیں ہدایت کی کہ اسے شہر سے چھ سات میل دور لے کر ٹیلوں میں چھوڑ دیں۔ اونٹوں والے نام کو لے گئے۔ مگر اس کے چھٹے یا ساتویں دن نام صاحب پھر گھر میں موجود تھے۔ نام پہلے سے فریاد اور موٹا ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے واپسی کے سفر میں اس نے چوہوں کا خوب شکار کیا تھا۔ اس کے بشرے پر ندامت کے آثار تک نہ تھے۔ ہمارے لیے اس کا دس بارہ میل دور سے گھر کا راستہ ڈھونڈ کر پہنچ جانا معمہ تھا۔ ہم نے پھر اسے اپنے دلوں میں جگہ دی۔ وہ ہمارا بلا تھا اور ہمارے پاس ہی لوٹ آیا تھا اس کی اس سیاحی نے اس کی دھاک بٹھا دی اور ہم اسے اس رشک اور عزت سے دیکھنے لگے جیسے بغداد میں پر امن شہری سندباد جہازی کو دیکھتے ہوں گے۔

جب نام سن بلوغت کو پہنچا تو وہ کافی اوباش اور آوارہ مزاج ہو گیا۔ اب وہ گھر سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا۔ شہر سے دور دراز حصوں میں اس کی بری صحبت میں گھومنے کی ایک دو خبریں ہمیں ملیں۔ لیکن ہفتے یا مہینے کے بعد وہ گھر آ کر شکل ضرور دکھا جاتا۔ ایک دفعہ نام چھ مہینے تک نہ آیا۔ ہمیں خیال ہونے لگا کہیں کسی کتے یا ظالم آدمی نے اسے مار ہی نہ دیا ہو۔ ایک شام ہم صحن میں بیٹھے نام کے مارے جانے کا افسوس ہی کر رہے تھے کہ نام سر جھکائے اور مسکین صورت بنائے دروازے میں سے اندر داخل ہوا۔ اسے شاید کچھ ندامت تھی کہ اس نے اتنا عرصہ گھر سے فرار رہ کر اچھا نہیں کیا اور شاید اس نے یہ بھی تاڑ لیا کہ ہم اسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک شرمسار

مجرم کی طرح ہماری طرف دیکھے بغیر وہ سیدھا سبزھیوں کی سمت گیا اور چڑھتا ہوا میرے چھوٹے بھائی کے کمرے میں جا چھپا۔

نام کے یہ لکھن کتنی ہی مدت تک رہے۔ ایک بار جب وہ اسی طرح گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ ہمارے ہمسایوں کی مرغیاں اور مرغی پر اسرار طور پر غائب ہونے شروع ہو گئے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کو کون لے جا رہا ہے اور ان کا چور کون ہے۔ محلے بھر میں کہرام مچ گیا اور دلی کے ایک چھدری داڑھی والے حکیم صاحب نے جن کی آنٹھ نور مرغیاں ایک ایک کر کے غائب ہو چکی تھیں۔ محلہ کی مسجد میں بذریعہ اشتہار یہ اعلان کیا کہ مرغیوں کے چور کا پتہ لگانے والے کو شربت انار کی ایک بوتل اور پانچ روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ بڑے عرصے تک ہوشیار چور کا کھوج نہ لگ سکا۔ پھر کسی نے ایک کوڑا کرکت کے ڈھیر کے پاس ایک مرغی کی کچلی ہوئی گردن اور پردیکھے۔ اس سے سب پر بھید کھلا کہ یہ کسی چور کا کام نہ تھا اور یہ کہ مرغیوں کو کوئی بلا کھا رہا ہے۔ نام کی شہرت کی وجہ سے نام پر رشک کیا گیا۔ یہ تھا جی نام۔ اور وہ ایک دفعہ اپنے اس شرمناک مشغلے کے جرم میں پکڑا بھی گیا۔ جب محلے کی تمام مرغیاں ختم ہو گئیں اور ڈر بے نہ رہے تو نام ایک اچھے لڑکے کی طرح پھر گھر میں لوٹ آیا۔ اب بڑا موٹا تازہ اور چاق و چوبند نام تھا اور پہچانا نہ جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں کالج میں تھا کہ نام پھر غائب ہو گیا۔ اس دفعہ وہ کوئی ایک سال لا پتہ رہا۔ لیکن اس کی مکاری اور حیلہ سازی کو جانتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہوگا اور ضرور واپس آئے گا۔ اس عرصے میں میں نے اسے صرف ایک دفعہ دیکھا۔ گرما کی ایک شام کو میرا ایک دوست اور میں شوقینی کی خاطر ادھار مانگی ہوئی بوئیں لگائیں اور سیاہ سوٹ پہنے سینما جا رہے تھے۔ جب ہم فوجی افسروں کے کلب کے پاس سے گزرے تو اکٹھے درجن کا لے مور چٹکبرے بلے بلیاں کلب کے پھاٹک سے بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان میں ایک چھوٹی کالی بلی تھی۔ جو لو لگائے ہوئے تھی اور پالتو تھی۔ وہی ایک خاتون تھی باقی غالباً سب مرد تھے۔ ان میں ہمارا نام بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً نظر چرائی۔ یہ لوگ کلب کے کسی ڈنر سے لوٹ کر آتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دوست اور میں اس خیال پر بے حد ہنسے۔ ظاہراً نام اب فیشن ایبل سوسائٹی میں گھومنے پھرنے لگا تھا۔ مجھے اس پر فخر کا احساس ہوا۔

نام اب بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اب بوڑھا ہو چلا ہے اور اب اس نے غائب ہونا چھوڑ دیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اپنی ہی قسم کی ایک چھوٹی بلی کے ساتھ ایک پر امن گزشتہ زندگی گزار رہا ہے۔ نام اب بے حد موٹا اور ست ہو چکا ہے اور اس کے نزدیک پن کا تو بس پوچھو ہی نہیں۔ وہ سنگترے کی قاشیں اور تربوز کے بیج تک کھا لیتا ہے۔ اس کی پینائی بھی کچھ کمزور ہو گئی ہے۔

یہ ہے نام کی کہانی۔ یہ بڑی لمبی ہو سکتی تھی۔ مگر اسے چھوٹا کرنا پڑا ہے۔ بچو اس کہانی سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ساری

تہذیب اور رسم و رواج کے باوجود اپنی اصل میں انسان کی اور ایک بلے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ اسی افریقہ زولو فلاسفر کا (جسے میں نے پہلے نقل کیا ہے) کہنا ہے کہ انسانوں کی طرح بلے بلیوں کے بھی سماجی تعلقات اتنے ترقی پا چکے ہیں اور الجھ چکے ہیں کہ اگر بیسویں صدی کا بلا چار سو سال قبل مسیح کے بلے کو دیکھے تو حقارت سے منہ پھیرے۔ پھر بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو عیش و آرام بلے بلیوں کو قدیم مصر میں میسر تھے وہ آج کل انہیں چچا سام کے دیس میں بھی نصیب نہیں۔ قدیم مصری بلیوں کی پرستش کرتے تھے۔ ہر مصری کے گھر میں بلیوں کے کئی کئی خاندان پرورش پاتے تھے اور بلی کو مارنے والے کی سزا قتل ہوتی تھی۔ آج کل بلے بلیوں کی وہ قدر کہاں؟ جائے عبرت ہے!

سوالات

- ۱۔ اگر ایک طاعون ایک بڑے شہر کو چار مہینے اور دس دن میں خالی کر سکتا ہے تو بتاؤ اس شہر کو خالی کرنے کے لیے ایک ہائیڈروجن بم کو کتنی مدت درکار ہوگی۔
- ۲۔ نیا سال کیوں مبارک ہوتا ہے۔ اسے منانے کا صحیح اور مناسب طریقہ کیا ہے؟ ”مرز“ اور ”ان لکر“ کی تصویروں کو دیکھ کر لکھو۔
- ۳۔ ڈاکٹر قوم کے لیے کیوں ضروری ہیں۔ قسم نمبر دو کے ڈاکٹر بننے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیٹنے پڑتے ہیں؟
- ۴۔ بلے بلیوں سے ہمیں کیا سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اپنے کسی جاننے والے کی زندگی کو سامنے رکھ کر بتاؤ کہ اس کی زندگی بلے سے کس لحاظ سے مختلف ہے؟



آخری دن

ہم ڈھاکہ کے پریس کلب میں بیٹھے تھے۔ یہ ہمارا اس میٹھی دھوپ اور زمر دیں کنجوں کے شہر میں آخری دن تھا اور ہم اکتائے ہوئے اور کچھ اداس تھے۔ ہم میں سے نصف لوگ پہلے ہی اپنی خیر سگالی کو ختم کر کے کیلوں کے گچھوں سے لدے پھندے واپس مغرب کو فلائی کر چکے تھے۔ ناولٹ پامپس ابھی تک ڈھاکہ ہی میں تھا۔ لیکن وہ کلب کے لنچ پر موجود نہیں تھا۔ کلب ایک چھوٹے سے باغ میں ایک خوشنما دو منزلہ عمارت ہے۔ اور ڈھاکہ کے اخبار نویس اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایسا پرسکون اور آرام دہ گوشہ میسر ہے۔

لنچ کچھ مشرقی تھا، کچھ مغربی اور مناسب پینا نے پر پر تکلف۔ ہمارے علاوہ میز پر انفارمیشن آفیسر اور ڈھاکہ کی انگریزی اخباروں کے نمائندے تھے اور وہ دو خوبصورت اور چارمنگ لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک بے حد شرمیلی تھی۔ اخبار نویسوں نے خود کھانا ترتیب دیا اور مجھے ان کی سادہ غیر رسمی سی مہمان نوازی بڑی بھائی۔ لنچ کے بعد ہم اوپر کی منزل کے لاونج میں باتیں کرنے اور سگریٹ پینے کے لیے جا بیٹھے۔ وہاں کسی نے بلدیہ گارڈن کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اسے دیکھے بغیر ڈھاکہ سے نہ جائیں۔

”ابھی کیوں نہ چلیں؟“ لڑکیوں میں سے ایک نے تجویز پیش کی۔ دہلی دہلی شرمیلی ہنسی ہنستے ہوئے مسٹر گوگل، توپ و تفنگ کے گنجے باتونی اور دلچسپ نمائندے نے خود کو بطور گائیڈ پیش کیا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ اس جگہ سو بار ہوا یا ہے اور اس کے چپے چپے سے اسے نفرت ہے۔ لیکن وہ میزبانی کی روایات کی خاطر ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہم مائیکرو بس میں شخص ٹھنسا کے بیٹھ گئے۔ بوس میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم دونوں میں ابھی تک بول چال بند تھی اور چالنا کی دریائی بندرگاہ کے سخت جھگڑے کے بعد ایک دوسرے کو زہر لگتے تھے۔

مائیکرو بس ایک خاموش سڑک کے کنارے پتوں اور پھولوں سے ڈھنپے ہوئے ایک دروازے پر کی اور ہم نیچے اترے۔ مسٹر گوگل نے اندر جانے کے ٹکٹ خریدے۔ اندر جانے کا ٹکٹ تھا۔ مجھے بے چارے گوگل پر ترس آیا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کے لیے ٹکٹ خریدنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا اور ہمیشہ دوسرے اس کا ٹکٹ خریدتے تھے۔ میزبانی کی قیمت ہوتی ہے۔ مجھے ایک غریب اخباری نمائندہ کے اس طرح لٹنے کا افسوس ہوا۔ لیکن ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔ بے چارہ بے چارہ گوگل!

پہلے ہم عجائب گھر میں داخل ہوئے جو بلدیہ باغ کا ایک حصہ ہے۔ یہ میوزیم مجھے پرسکون اور تابوتی لگا اور فضا میں وہ میٹھی پھپھوندی لگی سی ہوتھی جو عجائب گھروں سے مخصوص ہے۔ سبز روشنی رنگے ہوئے شیشوں سے چھن کر آ رہی تھی اور اندر کے جھپٹے کو ہلکا کرتی تھی۔ دو کمرے تھے دونوں میں عجوبوں اور نوادرات سے پرگلاس کیسے سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر کمپنی بہادر اور مغل زمانے کے جنگی ہتھیار جن کے میں نام نہیں جانتا۔ میں نے اس وقت پامپس ناولٹ کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔ پامپس جو خود کو قدیمی اسلحہ پر اتھارٹی سمجھتا ہے۔ یہاں خوب اپنے علم کے جوہر دکھاتا اور بڑے اعتماد سے چمکتا۔ میں نے سوچا پامپس کی کھوپڑی کتنی ہی بیکار اور غلط معلومات سے ٹھنسی ہوئی ہے۔ یہاں اس کی تردید کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتا چل جاتا۔

دونوں خوبصورت لڑکیاں جو یہاں پہلے آ چکی تھیں مجھے شیشے کے صندوق میں رکھی ہوئی چیزیں دکھانے لگیں۔ وہ بڑی اچھی لڑکیاں تھیں۔ پر مذاق اور سلجھی ہوئی اور میں نے خود کو اکیلا محسوس کرتے ہوئے ان کو ساتھ چپکا لیا تھا اور وہ بھی میرا خیال ہے مجھے پسند کرنے لگ گئی تھی۔ پریس کلب میں میں نے انہیں پامپس کو سنדר بن ایڈ وینچر کا حال سنایا تھا جس کو انہوں نے مزے سے سنا تھا اور خوب ہنسی تھیں۔ بورس میری وجہ سے خود بخود ہی ایسی دلنواز صحبت سے الگ رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بہر حال اس کا ستارہ کافی کچھ ماند پڑ چکا تھا۔ گلاس کیسوں کے درمیان پھرتے ہوئے جب دو تین بار ہماری نظریں ٹکرائیں (ہم ہمیشہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے چونکہ نفرت بھی ایک قسم کی محبت ہے) تو مجھے ان میں خون آشامی کی جھلک دکھائی دی۔ مسٹر گول گائیڈ کا حق پوری طرح ادا کرنے پر تڑا ہوا تھا۔ اگرچہ اتنی بار یہاں کی سیر کرنے کے بعد بھی اس کی معلومات ہمارے جتنی ہی تھیں لیکن اسے اس جگہ کی تاریخ کے بارے میں کچھ سوجھ بوجھ تھی برائے نام ہی۔ اس نے اس کے بل بوتے پر ہمیں ایک پوری کہانی سنائی۔

اس جگہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے بلدیہ کی کارگزاری سے منسوب کیا جاسکے۔ عجائبات اور نوادرات کا مجموعہ ایک گزرے ہوئے متمول شہری کا فراہم کردہ ہے۔ کس لگن، کس محبت سے اس نے ان عجوبوں کو ڈھونڈا اور حاصل کیا ہوگا۔ کتنے ہزاروں لاکھوں روپے ان کے حصول پر خرچ آئے ہوں گے۔ اپنی ساری عمر میں اس نے یکسوئی سے اور دل و جان سے اپنے شوق کے پودے کی آبیاری کی اور آرٹ اور حسن کی تلاش میں زندگی دے دی اور اس منزل تک پہنچنے کے جنون میں اس کے قدم کبھی نہ ڈمک گئے۔

عجائب گھر کے داخلے پر اس میوزیم کے خالق کی بڑی فریم شدہ تصویر لٹکی تھی۔ گوگول نے اسے فخریہ انداز سے ہمیں پوائنٹ آؤٹ کیا۔ کسی جگہ میں نے سوچا میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے۔ چھوٹی بیگنی قدرے پر حسرت آنکھیں تنگ نیچا تھا پھولے ہوئے گال، موٹے حساس ہونٹ، ٹھوڑیاں دو تھیں اور چہرہ پلپلا، سر پر سفید پگڑی تھی۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کسی پرانی ہنگامی

فلم میں لاہور کے کسی پھل فروش کی دکان پر نہیں! سکول کی تاریخ کی کتاب میں راجہ رام موہن رائے کی تصویر کے ہلکے سے نقوش میرے سامنے ابھرے۔ فوٹو پرنٹ بھی اسی نسل کا تھا۔ سفید دھندلا مبہم۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا تو یہ وہ آدمی تھا جس کے دل میں نادر چیزوں اور درختوں کے لیے اتنی لگن تھی۔ اس کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس سے اس کے ستھرے ذوق اور ذوق حسن کا پتہ ملتا۔ یہ ایک عام گول منول معصوم تن آسان بنگالی چہرہ تھا۔ کیا چہرے واقعی اتنا کچھ بتا سکتے ہیں جتنا صورت شناسوں کا دعویٰ ہے کیا وہ دل کا سب حسن اور سوز اس کی لگن اور تپش آشکار کر سکتے ہیں۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہ محض ایک شوقین مزاج آرٹ کے خزانے جمع کرنے والا امیر آدمی ہو جس کو ان چیزوں کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہ ہو اور جو انہیں خود نمائی کے جذبے کے تحت اکٹھا کرتا ہو۔ میں یقیناً غلط تھا، تصویر کو دوبارہ دیکھنے سے مجھے اس میں ایک عجیب خوبصورتی نظر آئی۔ یہ ایک شانت مطمئن چہرہ تھا اپنی فرہبی کی تہوں کے باوجود آنکھوں میں حسرت ضرور جھانکتی تھی۔ ایک مضطرب تنہا۔ ان سے زیادہ معصوم آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔

گوگول نے تصویر کے عین نیچے ایک جرے ہوئے کتبے کی عبارت کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ ہم سب نے اسے باری باری پڑھا۔ اس کے باوجود کہ زندگی اور گزرے ہوئے سالوں نے ہمیں سرد دل اور رحم کے جذبے سے خائف بنا دیا تھا۔ اس کتبے کی عبارت میں اتنا درد تھا کہ ہم جذباتی ہو گئے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو لڑکیوں سے آنکھ بچا کر پونچھ ڈالا۔ میں بلاوجہ ہنس پڑا۔ یہ کتبہ اس امیر آدمی نے اپنے بیٹے کی یادگار میں نصب کرایا تھا جو عین جوانی کے عالم میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ کتبے کی انگریزی عبارت بڑی ہی مرصع اور قدرے مضحکہ خیز تھی لیکن اس کے ایک ایک لفظ میں باپ کی شدت غم کی آغچ تھی۔

آخر میں آنے والوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس نوجوان کی سادھی پر پھول ضرور چڑھاتے جائیں۔

اس کتبے کے پیچھے ایک پردہ چھوٹی سی کہانی ہے۔ اگر صرف گوگول بتاتا تو میں کبھی یقین نہ کرتا لیکن میں نے ڈھا کے میں اسے ایک دو قابل اعتماد آدمیوں سے سنا اور یہ ضرور سچ ہوگی۔ اس میوزیم اور باغ کے معمار کی پہلی بیوی شادی کے چند سال بعد ہی سرگباش ہو گئی۔ اس کے بطن سے اس آدمی کا ایک بیٹا تھا اور بیوی کے مرنے سے اس کی ساری محبت اپنے بیٹے پر مرکوز ہو گئی۔ دس بارہ سال گزر گئے۔ اس آدمی نے دوسری شادی نہ کی۔ پھر کچھ خاندانی دباؤ سے اور کچھ اپنی چاہت سے اس نے دوسرا بیاباہ رچایا۔ نئی عورت جوان اور خوبصورت تھی لیکن اس کا دل پتھر تھا۔ وہ کہانیوں کی سوتیلی ماؤں کی طرح سخت دل اور بے رحم تھی۔ دوسری رانی کیسلی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کو اپنے بیٹے سے اسی طرح محبت ہے تو اس نے بیٹے کی طرف سے باپ کا دل میلا کرنے کے لیے کئی

تربیا چلتر کئے۔ سال کے بعد بھگوان نے اس کی گود ہری کی۔ تب تو اس پر اپنے سوتیلے بیٹے کا وجود ہی کھلنے لگا اور وہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئی۔

وہ یہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی جائیداد کا وارث بڑا بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔ ایک دن وہ کھیل کھیلی۔ اپنے سوتیلے بیٹے سے جواب جوان ہو چکا تھا بڑے چاؤ اور بھاؤ سے پیش آئی اور اسے اپنے ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلایا۔ لڑکے کے دل میں کوئی وسوسا نہ تھا۔ وہ دودھ پی گیا، یہ گمان کئے بغیر کہ اس امرت میں زہر گھلا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اور طبیعوں اور حکیموں کی چارہ سازیوں کے باوجود وہ مر گیا۔ اس کے مرجانے کا اس کے باپ کو سخت صدمہ ہوا۔ ایسی باتیں کب چھپ سکتی ہیں۔ بات ظاہر ہونے سے نہ رہ سکی۔ جب باپ پر پورا حال کھلا کہ اس کے لڑکے کی موت کیوں کر ہوئی ہے تو فطر غم سے اس نے اپنے حواس کھود دیئے۔ وہ بدل گیا۔ اسے دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہ رہی۔ اپنے میوزیم اور باغ سے بھی نہیں۔ بیٹے کی موت کے چند ماہ بعد ہی وہ اس سے جا ملا۔

گوگول نے کہا کہ وہ سوتیلی ماں ابھی تک زندہ ہے اور پاس کے مکان میں رہتی ہے۔ مائیکرو بس کے ڈرائیور عزیز الرحمن نے بھی اس کی گواہی دی۔ بورس اس سارے معاملے کے متعلق بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس عورت سے ملنا چاہیے۔ لیکن کسی دوسرے نے اس کی حامی نہ بھری۔ گوگول نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا۔

ہم میوزیم سے باہر باغ میں آئے۔ گھنے پتوں میں جھپٹے کا سماں تھا اور روشنی گویا شفاف پانی میں نتھر کر آ رہی تھی۔ یہاں دو یا تین پودوں کے لیے شیشے کے گھر تھے۔ پودے زیادہ تر ایسے تھے جو ان ہواؤں میں نہیں اگتے ”گرین ہاؤسوں“ سے آگے ہم باغ میں اور جنوری کی سہ پہر کی گلابی دھوپ میں آئے۔ باغ بظاہر اجڑا ہوا تھا اور ویران تھا۔ آسیب زدہ روشوں اور راستوں کے بغیر بائبل کے لٹکتے ہوئے باغ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ ان کا منظر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ میرا چہیتا انگریزی مصنف رابرٹ لوکس سٹیونسن اجڑے باغوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی ایک نظم ”حسین گھر“ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

”پھل اور پھول سے ننگا باغیچہ

ایسی جگہ میں رہتا ہوں

باہر سے اجڑی بجزوی اور اندر سے بے سامان“

مجھے بھی اجڑے باغ پسند ہیں۔ خصوصاً یہ بلد یہ باغ، قتل و خون کے لیے یہ بڑی موزوں جگہ ہے اور جب بھی میں نے کسی کے قتل کا ارادہ کیا (ایسے تین چار آدمی میری نظر میں ہیں جن کے بارے میں کبھی کبھی میرے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوتی ہے) تو میں اس

کو باتوں باتوں میں یہاں لے آؤں گا۔ جب میرا انجانا شکار جاوا کے ربر کے درخت کو حیرت سے دیکھنے میں منہمک ہوگا، میں چپکے سے اپنا لمبا چاقو اس کی پیٹھ میں جھونک کر اسے چلتا کر دوں گا۔ سورج کی گھڑی کے پیچھے ایک گھنی اندھیری جگہ ہے جہاں لاش کو مناسب طریق سے ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے۔

میں نے بورس کی طرف نکلیوں سے دیکھا کیا اس کے دماغ میں بھی اس وقت قتل کے خیالات گزر رہے ہیں؟ گوگول کی زبان کبھی چلنے سے نہ رکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دنیا کے سب سے کئی آدمیوں میں ایک ہوگا لیکن وہ اپنے اخبار کا بڑا کامیاب نمائندہ تھا۔ بیچ لڑانے میں ماہر۔ پچھلے پانچ سال سے وہ ڈھاکہ میں اخبار کے کام کو سنبھالے تھا۔ ہر کوئی اسے جانتا تھا۔ اور وہ ہر کسی کو مگر گوگول قدرے بے پرواہ اور غیر سنجیدہ گائیڈ تھا۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا۔

ایک درخت کی طرف اپنی سوئی سے اشارہ کرتے ہوئے گوگول نے بتایا کہ یہ ربر کا درخت ہے یہ اس قسم کی کوئی چیز نہ تھا۔ اگرچہ کئی اس کی طرف اشتیاق سے لپکے۔ یہ ایک عام کیکر تھا۔ جب لڑکیوں میں سے ایک نے وضاحت کی کہ میاں گوگول ربر کا درخت تو وہ آگے کونے پر ہے تو مجال ہے گوگول کو ذرا سخت ہوئی ہو۔ اس نے جان بوجھ کر غلط معلومات نہ دی تھیں۔ اس نے صاف صاف اقرار کیا کہ اس کے لیے سب درخت ایک سے ہیں اور اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ کیلے کے پودے کو آم کا درخت بنا دے۔

ہم میں سے بیشتر میرے خیال میں گوگول کی کشتی میں سوار تھے۔ ذاتی طور پر میں اب تک ٹاہلی، سرس یا کیکر کے درخت کو ایک نظر میں نہیں پہچان سکتا۔ اپنے پیٹھے اور کام سے متعلق باتوں کے علاوہ ہمارا عام علم بہت محدود ہوتا ہے اور ہم خدا کی زمین میں آنکھیں موند کر چلتے ہیں۔

اس اجڑے باغ میں کئی نادر درخت تھے۔ جن کے پودے اس کے مالک نے دور دور کے دیسوں سے منگوائے تھے اور انہیں بڑی محنت اور محبت سے پیٹھ کر پروان چڑھایا تھا۔ وہ ایسے درخت تھے جو بنگال کی دھرتی میں نہیں ہوتے۔ ملایا اور فیجی اور برازیل کے انجانے درخت۔ ہمیں ان کے نام بھی بتائے گئے اور اب مجھے یہ اقرار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ان میں سے صرف ربر کا درخت میرے ذہن میں رہ گیا ہے۔

ہم ایک پتھر لیے حوض پر آئے۔ پانی کے بغیر ایک حوض چوڑی سیڑھیاں ٹپتی تھیں۔ کبھی یہ پر فضا جگہ ہوگی۔ اب یہ ایک وحشیانہ تجمل کی حامل تھی۔ خالی شکستہ حوض ویران درخت۔ یہ سب اس ٹریجڈی کی کہانی بتاتے تھے۔ جس نے ایک امیر اور سلجھے

ہوئے خاندان کو آ لیا تھا۔ ہم درختوں کو دیکھتے تالاب کے گرد چلے آ اور آخر بیلوں سے پٹے ہوئے ایک کونے میں سورج کی گھڑی پر آئے۔ ہم مغرب سے آنے والوں میں سے شاید کسی نے پہلے سورج کی گھڑی نہ دیکھی تھی اور ہم نے اس عجوبے کو دلچسپی سے دیکھا۔ ڈاکٹر پامپس ناولسٹ یہاں ہوتا تو وہ اس موقع پر سورج کی گھڑی پر ایک طویل اوٹ پٹانگ لیکچر دیتا اور بغداد کے اس مسلمان موجد کے حالات زندگی پر ایک تبصرہ کرتا جس نے سب سے پہلے گھڑی ایجاد کی تھی۔ وہ اس کی بابت کچھ جانے بغیر ہمیں بتانے کی کوشش کرتا کہ اس سے وقت کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔

سورج کی گھڑی ایک پتھریلے چبوترے پر مشتمل تھی جس پر مدھم ہندسوں کے نشان تھے۔ اس کے اوپر ایک لوہے کے پتر کا سایہ پڑتا ہے اور وقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ درختوں کے دھندلکے میں پتر کا سایہ غیر واضح اور نامعلوم سا تھا۔ ہم گول اور چند دوسروں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کہ یہ گھڑی محض ایک آرائشی عجوبہ ہی نہ تھی، یہ قریب قریب صحیح وقت بتاتی تھی اور سورج کی گھڑی اس باغ کے آخر میں تھی۔ ہم وہاں سے ہچکچاتے دبے قدموں سے رخصت ہوئے تاکہ خوابیدہ روحوں کو نہ جگا لیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھیوں کے احساسات کیا تھے؟ سوچ رہا تھا کہ وہ آدمی جس کے اندر اتنی لگن تھی اور جس نے میوزیم اور باغ بنایا تھا۔ ہزاروں میں ایک تھا۔ وہ ایک دھرماتما تھا۔ ایسے آدمی کم ملتے ہیں۔ اس خراب آباد میں جہاں ہم میں سے بیشتر زندگی کی گھڑیوں اور الجھنوں کو چھوٹی چھوٹی رنجشوں، خانگی تلخیوں اور حقیر مصروفیتوں کی نذر کر دیتے ہیں اور ساری عمر اپنی ناکامیوں کے نوے کرتے گزار دیتے ہیں۔ ایک لگن رکھنے والا آدمی قابل ستائش ہے۔

باہر جانے سے پہلے میں مڑا اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس آدمی کو پر نام کیا۔ جس کے دل میں حسن کی اتنی لگن تھی اور جو درختوں کو پیار کرتا تھا۔

